ترجمانِ غالب

یعنے

دیوانِ غالب کی مکمل وجدید ترین شرح

از

شہاب الدین مصطفیٰ

چنچل گوڑہ - حیدرآباد دکن

منگانے کا پتہ

مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

قیمت ۴ روپیہ

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد دکن

دیباچہ

تیس بتیس سال پہلے، فخر زمانہ، استاد یگانہ حضرت مولانا وحید الدین سلیم صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے دیوانِ غالبؔ پڑھا۔ اسباق کے دوران میں حضرت نے ہر چند غالبؔ اور اسکے کلام کی عظمت دل نشین کرنیکی سعی فرمائی مگر ہم کو کیا پڑی تھی کہ اتنی گہرائی میں جاتے۔ امتحان کی خاطر سطحی طور پر کچھ سمجھ لیا اور بس ع۔ تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل۔ تاہم استاد مرحوم کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ آپکے فیض تربیت اور انوکھے انداز تفہیم کا یہ اثر ہوا کہ اکثر شاگردوں میں ادب اور سخن فہمی کا "ذوق سلیم" پیدا ہو گیا۔ حضرت بھی اکثر و بیشتر مذاحیہ انداز میں اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ "ذوق سلیم" پیدا کرو تو مطالب تک رسائی ہو"۔ مذاق مذاق میں استاد بڑی سے بڑی حقیقت بیان کر جاتے تھے کیا کہنے اس استادِ اعظم کے جو اردو ادب کا بادشاہ اور فن تدریس کا شہنشاہ تھا۔ جس کا ثانی پھر ہندوستان کی خاک سے اٹھتا نظر نہیں آتا۔

کالج چھوٹتے ہی علم و ادب کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ تیس سال ملازمت کے چکر میں قریہ بہ قریہ، دِہ بہ دِہ گھومتے رہے۔ وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو سمجھا کہ کچھ آرام ملیگا۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ بیماری نے پہلے ہی کچھ نکما سا کر دیا تھا۔ بیکاری نے تو بٹھا ہی دیا۔ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ اس زمانہ میں غالب کا فلم منظر عام پر آچکا تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر غالبؔ کا نام تھا۔ قدرتاً یہ خیال آیا کہ چلو، پھر سے دیوان غالب دیکھیں اور اس کے کلام میں اس کی عظمت اور شہرت کی تلاش کریں۔ سوئے اتفاق سے دیوان غالبؔ کی ایک ایسی شرح ملی جس کے دیکھنے کے بعد بجا یا بیجا طور پر میں نے محسوس کیا کہ اس عظیم المرتبت شاعر کی توہین کی گئی ہے لیٹے لیٹے چند غزلوں کی شرح میں نے لکھی میرے عزیز اور محترم بھائی مولوی سید نور محمد صاحب

اور حضرت سید علی منظور کو، جو میرے ہم محلہ اور عزیز بھی تھے، سنائی۔ ان ہر دو حضرات نے اس شرح کو بہت پسند فرمایا اور خواہش کی کہ اسی انداز میں پورے دیوان کی شرح لکھ دوں۔ مجھے اپنی کم مایگی، بے سروسامانی اور بیماری کی وجہہ شبہ تھا کہ شاید یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے، لیکن ان دوستوں (مرحوم لکھتے ہوئے قلم رک جاتا ہے) کو اصرار اور یقین تھا کہ مجھ سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ حضرت منظورؔ نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کے مانے ہوئے شاعر اور ادیب تھے مولوی سید نور محمدؒ صاحب نہ صرف مدرسۂ نظامیہ کے تعلیم یافتہ تھے بلکہ ان کی پوری نشوونما شعر و سخن سلوک و معرفت کے ماحول میں ہوئی تھی ان کی رائے میرے اطمینان کا موجب ہوئی اور میں شرح لکھنے لگا۔ یہ ایسا دلچسپ مشغلہ تھا کہ بیکاری کے غم اور بیماری کی صعوبت کا مداوا ثابت ہوا۔ مولوی نور محمدؒ صاحب نے تو اپنے آپ کو میری اعانت کیلئے وقف فرما دیا تھا۔ حضرت منظورؔ کی عنایات بھی شامل حال رہیں۔ اکثر رات میں تشریف لاتے اور گھنٹوں بیٹھ جاتے۔ جتنی غزلوں کی شرح لکھی جاتی ملاحظہ فرماتے۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ علامہ طباطبائی کی شرح دیکھ لیں تو اچھا ہوگا، تلاش کروائی مگر وہ شرح نہ مل سکی۔ اسکے بجائے جناب سہا اور حضرت بیخود دہلوی کی شرحیں ملیں جناب سہا کی شرح کا کچھ حصہ دیکھا تھا کہ وہ کتاب واپس کرنی پڑی۔ حضرت بیخود کی پوری شرح دیکھی۔ لیکن کوشش یہی رہی کہ اپنی ذاتی کاوش اور فکر کے نتایج سپرد قلم کئے جائیں۔ البتہ یادگار غالبؔ میں مولانا حالیؔ نے اور اردوئے معلیٰ و عود ہندی میں خود شاعر نے جن اشعار کی تشریح فرمائی ہے وہ جوں کی توں ان کتابوں کے حوالہ سے نقل کر دی گئی ہے۔

جب تقریباً یک ثلث حصہ دیوان کا ختم کیا، تو مجھے ایک نقاد کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ میرے کام پر تنقیدی نظر ڈالے اور اس کے کھوٹ کھرے سے مجھے واقف کرائے۔ مولوی نور محمدؒ صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ حضرت منظورؔ کو اتنی فرصت نہیں تھی وہ ان دنوں ایک دو کتابوں کی تصنیف میں ہمہ تن مصروف تھے۔ خوش قسمتی سے ایسے وقت مجھے ایک نہایت

قابل اور موزوں ہستی کی اعانت حاصل ہوگئی۔ مولوی بہادر علی خاں صاحب جامعہ عثمانیہ کے ایک ممتاز گرائجویٹ ہیں جنہوں نے فارسی ادب کا میرٹ اسکالرشپ حاصل کیا تھا۔ وہ میرے عزیز دوست اور ساتھی بھی ہیں۔ خوش گو شاعر اور اچھے ادیب بھی، مبصر اور نقاد بھی۔ جب میں نے ان سے درخواست کی وہ اپنی مہربانی سے ہر قسم کی اعانت و امداد کیلئے آمادہ ہوگئے۔ جتنا کام میں اس وقت تک کرچکا تھا اس کی نظر ثانی فرمائی اور روزانہ جتنا کام ہوتا وہ بہ پابندی تشریف لاکر اس کو ملاحظہ فرماتے۔ ان کی تنقید و تبصرہ سے اکثر خامیاں دور ہو جاتیں۔ ان کے مفید مشوروں اور غور و فکر کے نتایج سے بڑا فائدہ پہنچا۔ غرض کام کی تکمیل تک وہ میری مدد فرماتے رہے

ابتدا میں تو یہ شرح بیکاری و بیماری کا ایک مشغلہ رہی۔ یہ خیال نہیں تھا کہ اس کو منظر عام پر لایا جائے مگر بعد میں اکثر احباب اور خصوصاً حضرت منظور اور میرے محترم دوست مولوی بہادر علی خاں صاحب نے اسکی اشاعت کو نہ صرف مناسب بلکہ ضروری خیال کیا۔ اس کی ایک وجہہ تو یہ تھی کہ حیدرآباد کے کسی ادب دوست اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے کسی طالب علم نے اس جانب توجہہ نہیں کی تھی۔ دوسری وجہہ انہوں نے یہ بیان فرمائی کہ اکثر شرحیں خواص کے کام کی ہیں، عوام اور طلباء ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کرسکتے۔ ایک ایسی شرح کی ضرورت ہے جس میں الفاظ و فقرات کی بھی تشریح ہو اور پھر ایسی عام فہم ہو کہ نہ صرف کالج بلکہ مدارس کے طلباء بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ چنانچہ میں نے اپنی صلاحیت کی حد تک غالب کے کلام کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے کلام کو سمجھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ خود اس رفیع المرتبت شاعر کو سمجھیں، علاوہ اس غیر معمولی ملکۂ شاعری کے جو کوٹ کوٹ کر آپکی ذات میں بھر دیا گیا تھا، آپکی خاندانی عظمت نسبی فضیلت، بلند فطرت، وسیع القلبی، فراخدلی، خودداری، نیک نہادی، عالی ظرفی، مروت حوصلہ کی وسعت اور نفس کی شرافت سے ایک شارح کا متاثر رہنا ضروری ہے اور اس کا جاننا بھی ضروری ہے کہ کائنات اور موجب کائنات سے متعلق آپکے کیا تصورات تھے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ایسے الفاظ کے معانی متعین کر دئے جائیں جو ایک سے زیادہ معنی رکھتے ہیں اور جنکی وجہہ کسی شعر کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر شعر میں ایہام، طنز، استفہام تعلّی و تفاخر کا تفحص کریں جس کو شاعر نے بڑی نفاست اور دور بینی سے الفاظ کے طلسم میں چھپانے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔ جب الفاظ کا یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے تو گنج معانی ہاتھ آتا ہے فرماتے ہیں ؎ گنجینۂ معنیٰ کا طلسم اسکو سمجھئے جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

غالباً حضرت نے ان گنجہائے معانی کی جو آپکے کلام میں ہیں، یہ ایک کلید دیوان میں رکھ چھوڑی ہے اور میں نے زیادہ تر اسی کلید کی مدد سے مطالب تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ مجھہ کو اپنی فہم کی خامی اور تخیل کی کوتاہی کا اعتراف ہے۔ اس شاعر اعظم کے کلام کی پختگی کو ہم جیسے خام کار کیسے پائیں اور جن بلندیوں میں حضرت کا تخیل پرواز کرتا ہے وہاں تک کیسے جائیں۔ اسلئے یہ کہنا مشکل ہے کہ میں نے مطالب تک رسائی حاصل کی ہے البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالبؔ کو سمجھنے کی جو شرطیں میں نے پیش کی ہیں ان پر حتی الوسع عمل کرنے کی کوشش کی ہے اس دیباچہ کے خاتمہ پر چند ایسے اشعار بہ طور نمونہ بحوالۂ صفحہ درج کئے جاتے ہیں کہ اگر ناظرین ان کو ملاحظہ فرمائیں تو مندرجہ بالا شعر کی صداقت اور میری سعی کی حقیقت ان پر واضح ہو جائے۔

آخر میں مجھے اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہے، جنھوں نے ازراہ مہربانی کسی نہ کسی طریقہ سے میری حوصلہ افزائی اور اعانت فرمائی۔ میرے عزیز ترین دوست مولوی سید نور محمد صاحب اور حضرت منظور جو اس تصنیف کا باعث ہوئے اب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی پاک روحوں پر درود بھیجتا ہوں۔ میرے محترم ساتھی بہادر علی خاں صاحب بوزئی بی' اے نے گرانقدر اعانت فرمائی شکر گزاری کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا۔ جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ (جو حقیقی معنوں میں استاد سلیم کے جانشین ہیں) کا مقدمہ ان کے الطاف، خلوص اور محبت کا آئینہ دار ہے۔ درحقیقت ان کا احسان بڑا گرانبار ہے۔ ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں اور اس بوجھ کو اپنے سر سے کیسے اتاروں حضرت زورؔ نے بھی کچھہ کم کرم نہیں فرمایا۔ مسودہ کا کچھہ حصہ

دیکھا اپنے ماہنامہ سب رس میں چند اشعار کو جگہ دی۔ انکی ہمدردیوں اور نیک مشوروں نے رہینِ منت کر رکھا ہے۔ حضرت کاوش حیدر آبادی ایڈیٹر ماہنامہ دائرہ اور جناب کے۔ یم خاں علی تی ایڈیٹر ماہنامہ محقق نے اپنے پرچوں کے ذریعہ اس شرح کے بعض حصوں کی اشاعت فرماکر ممنون کیا

جناب سید محمود یداللہی، جناب سید یعقوب میراں مجتہدی بی اے، جناب پروفیسر سید عالم خوندمیری ایم اے اور جناب سید عبدالکریم اسحاقی بی اے نے زحمت گوارا فرمائی، شرح دیکھی اور اپنے تعاون کے وعدوں سے قدر افزائی فرمائی۔ ان سب سے سوا حضرت مولانا مولوی سید احمد صاحب قبلہ مدظلہ کے جو حضرت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے پیر و مرشد اور میرے ایک محترم بزرگ ہیں، بے پایاں الطاف و عنایات ابتدا سے انتہا تک میرے شامل حال رہیں کیا تعجب ہے کہ آپ ہی کی دعا سے اس شرح کو حسن قبول حاصل ہو۔ فقط

شہاب الدین مصطفیٰ (عثمانیہ)

مصرع اول	مصرع دوم	صفحہ
۱۔ ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی	میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا	۴
۲۔ رنگِ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے	یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا	۱۹
۳۔ پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام	ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا	۶۲
۴۔ شکوۂ یاران غبار دل میں پنہاں کر دیا	غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا	۸۱
۵۔ زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ دے	رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر	۱۰۲
۶۔ نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شور جنوں آئی	ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں	۱۹۶
۷۔ ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال	حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو	۲۰۹
۸۔ دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی	ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے	۲۳۲
۹۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ	عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے	۲۵۲
۱۰۔ ہے وحشت طبیعتِ ایجاد یاس خیز	یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی	۳۸۰
۱۱۔ کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے	بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے	۳۹۰

مقدمہ

اردو کے شاعروں میں کم شاعر ایسے ہیں، جن کے کلام کی شرحیں لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، یا شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری زبان کے سب شاعروں کا کلام ایسا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے شرح و تفسیر کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی زبان کے اونچے سے اونچے کارنامے بھی تھوڑی بہت کوشش سے، پڑھنے والے کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اپنی زبان میں پڑھنے کا یہ ایک بڑا فائدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ اردو کے کم شاعر ایسے ہیں، جن کا کلام التزام کے ساتھ جامعات کے نصاب میں شامل کیا جاتا ہے، اور ہر زبان میں ایسے شاعر چند ہی ہوتے ہیں، جن کے کلام کا جاننا، زبان کے بولنے والوں کے اونچے اور متوسط علمی طبقوں کے تہذیبی سرمایہ کا جز بن جاتا ہے اور پڑھے لکھے سماج میں شائستہ انسان ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

غالبؔ کا کلام بھی ان مخصوص شعرا کے کلام میں سے ہے، جو نہ صرف جامعات کے نصاب کا جز بن جاتے ہیں، بلکہ ہمارے شائستہ سماج کے ادبی ذوق کے تانے بانے میں اس کا مذاق رچ گیا ہے۔ اسی لیے ہماری ادبی روایات پر اس طرز فکر کا گہرا پرتو نظر آتا ہے۔ یہ ایسے اسباب ہیں، جن کے نتیجہ کے طور پر، پچھلے سو برس کے اندر غالبؔ کے اردو دیوان کی جتنی شرحیں لکھی گئیں، کسی اور اردو شاعر کے کلام کی نہیں لکھی گئیں۔ غالبؔ کے کلام کو سمجھانے کی سب سے پہلی کوشش مولانا حالی نے کی تھی۔ لیکن "یادگار غالب" کا وہ حصہ جس میں حالیؔ نے چند منتخب اشعار کی ادبی خوبیوں کی شرح لکھی ہے، ان معنوں میں غالبؔ کی شرح نہیں کہلا سکتی، جن معنوں میں، حسرتؔ موہانی،

نظم طباطبائی، بیخود دہلوی، سہا یا آسی یا دوسرے شارحین، کی شرحیں ہیں۔ ان شرحوں میں ہر ایک شارح نے اپنی اپنی فہم و ذکاوت، ذوق اور شعر رسی کی مناسبت سے فکرِ غالب کی تفسیر کی ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی اب تک حضرت جوش ملسیانی کی شرح تھی جو دوسری شرحوں کے مقابلے میں زیادہ بسیط ہے، اور اس میں غالبؔ کی شاعری پر ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔

"ترجمانِ غالب" کی اشاعت سے ہمارے شاعرِ اعظم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششوں میں ایک اور اضافہ اور شائستہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اس شرح کے مصنف، جناب سید شہاب الدین مصطفیٰ، جامعہ عثمانیہ میں میرے ہم جماعت اور ہم سبق رہ چکے ہیں۔ وہ کالج میں شریک ہونے سے پہلے، محکمۂ تعلیمات میں ملازمت اختیار کر چکے تھے اور پڑھانے کا اچھا خاصہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد، پڑھنے کیلئے آئے تھے۔ اپنے ذہنِ رسا اور نکھرے ہوئے ادبی ذوق کی وجہہ سے وہ اپنے ساتھیوں میں امتیاز رکھتے تھے، اسی لئے استادِ مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم ان کو بہت چاہتے تھے۔ یہی حال فارسی کے اساتذہ، مولانا سید اشرف شمسی اور مولانا عبدالحمید خاں کا بھی تھا۔ اب ان واقعات کو بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ تقریباً ربع صدی بعد، جب شہاب الدین مصطفیٰ صاحب، دو تین مہینے قبل مجھ سے ملنے تشریف لائے، تو بزرگی کے سارے آثار ان میں نمودار تھے۔ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ لیکن ادب سے ان کا لگاؤ برابر باقی تھا۔ چنانچہ دیوانِ غالب کی یہ شرح وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ موصوف نے مجھے بتایا کہ یہ شرح، ان کی طویل علالت کے درمیانی افاقوں کی تخلیق ہے، جسے وہ شاعرِ اعظم کی بارگاہ میں اپنے خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

شرح کے کچھ حصے شہاب الدین صاحب نے مجھے پڑھ کر سنائے اور کچھ حصے میں نے پڑھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ فکرِ غالبؔ کی ترجمانی، انہوں نے بڑی خوبی اور سلیقے سے

کی ہے اور دوسری اکثر شرحوں کے مقابلہ میں، اشعار کی تفہیم میں بڑی وضاحت سے کام لیا ہے۔ اکثر مقامات پر انہوں نے اور شرح نگاروں سے الگ اپنی ذاتی کاوش کے نتیجے پیش کئے ہیں۔ یہ ایسی خصوصیتیں تھیں کہ اس شرح کا منظر عام پر آنا مجھے ضروری معلوم ہوا۔ چنانچہ "صلاح اور مشورے کے بعد" نامساعد حالات کے باوجود وہ اس ادبی کاوش کو منظر عام پر لانے آمادہ ہو گئے۔ میں جہاں شہاب الدین مصطفیٰ صاحب کی غالب پرستی سے متاثر ہوں کہ انہوں نے مرض صعب کی حالت میں بھی غالب کے کلام کو حرز جان بنائے رکھا، وہیں ان کی ہمت مردانہ پر بھی آفریں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے ذاتی صرفہ سے اس شرح کو چھپوا کر اس کے افادہ کو عام کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس طرح یہ شرح حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے ایک ادب دوست عالم کا، شاعر اعظم کی بارگاہ کے لئے پہلا خراج عقیدت ہے۔ جن حالات میں یہ شرح لکھی گئی، اور چھاپی گئی اور اس میں غالب کی مافی الضمیر کو ٹٹولنے اور سلیس الفاظ میں اسے قلمبند کرنے کی جو پر خلوص جھلک ملتی ہے اور ادائے خاص سے نکتہ سرائی کا جو پرتو اس میں دکھائی دیتا ہے، نیز غالب اور اس کے سدا بہار کلام کے پڑھنے اور پڑھانے، سمجھنے اور سمجھانے کا جو بے پایاں جذبہ، قوم کے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں اور ہر مکتب خیال کے لوگوں میں موج زن نظر آتا ہے، اس سے اس کی ضمانت ہوتی ہے کہ اسے مصر سخن میں "عزیز دولہا" بننے کا امتیاز حاصل ہوگا اور یہ "سرمۂ مفت نظر" "چشم خریدار" پر دوگونہ احسان کے مصداق ہوگا ایک احسان غالب کا اور دوسرا احسان اس کے موجودہ مفسر، جناب سید شہاب الدین مصطفیٰ کا۔

حمایت نگر، حیدرآباد دکن
مورخہ ۱۰ / جون ۱۹۵۶ء

عبدالقادر سروری
(صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ)

یہہ حقیر نذرانہ ان پاک روحوں کے حضور پیش کرتا ہوں جن کی شاگردی کی عزت مجہہ کو حاصل رہی اور جن کے خاص الطاف کا میں مورد رہا۔ زندگی میں مجہہ کو دیکھکر وہ جس طرح شفقت سے مسکرایا کرتے تھے۔ اب بھی میں ان کو مسکراتے ہوئے پاتا ہوں اس لئے توقع ہے کہ یہ نذر قبول ہوگی۔

۱۔ حضرت علامہ سید اشرف شمسی مرحوم صدر شعبۂ فارسی

۲۔ حضرت مولانا وحید الدین سلیم مرحوم صدر شعبۂ اردو

۳۔ حضرت مولانا عبدالحمید خاں بنگش پروفیسر فارسی

یہ ہیں وہ بزرگ جن کے فیض کی نہریں جامعہ عثمانیہ میں جاری تھیں اور جاری ہیں۔ فقط

خادم الفقراء

شہاب الدین مصطفیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنامِ خداوند پیروزگر مہ و مہر ساز و شب و روزگر

غزلیات

ردیف الف

غزل نمبر (۱)

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش ۔ تصویر ۔ تحریر ۔ مصوری + پیکر ۔ جسم + کاغذی پیرہن ۔ فریادیوں کا لباس یہاں مراد ناپائیدار پیرہن ۔

فرماتے ہیں ۔ موجوداتِ عالم مصورِ حقیقی کی صنعت کے نقش و نگار ہیں جبتک ان تصویروں نے کاغذی لباس نہیں پہنا تھا ۔ مصور کے ذہن میں محفوظ تھیں جب ان ذہنی نقوش کو کاغذ پر اتارا گیا وہ اصل سے دور ناپائیدار اور رنج و آلام میں مبتلا ہوگئیں ۔ یہی وجہ فریاد ہے ۔

یہ شعر بھی ان اشعار میں سے ہے جن کو بعض معاصرین نے مہمل ٹھیرایا تھا حضرت غالب

اپنے ایک مکتوب میں جو مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کو لکھا ہے اس کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں
"قبلہ! پہلے معنی ابیات بے معنی سنئے 'نقش فریادی' الخ - ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہنکر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لیجانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو۔ موجب رنج و ملال و آزار ہے۔ (از عود ہندی)

۲۔ کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۔۔۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاوٗ۔ کاوش، خلش، تکلیف۔

فرماتے ہیں۔ شب تنہائی ہمارے لئے غم کا ایک پہاڑ ہے جو کاٹے نہیں کٹتا۔ رات تمام کرب و بےچینی، کاوش و خلش میں گذرتی ہے۔ شب ہجر کا صبح کرنا اتنا ہی مشکل اور جانکاہ ہے جتنا کہ فرہاد کیلئے کوہ بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر کا لانا کاوش طلب تھا۔ شعر میں قصۂ فرہاد کی تلمیح کے علاوہ بہت سی لفظی مناسبتیں موجود ہیں۔

۳۔ جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے ۔۔۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دم شمشیر۔ تلوار کی باڑھ

فرماتے ہیں۔ ہمارے شوق شہادت کی شدت تاثیر اور کشش کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ دمِ شمشیر کو سینۂ شمشیر سے کھینچ باہر لا ہی لیا۔ ظاہر ہے کہ تلوار کی دھار باہر ہی ہوا کرتی ہے مگر شاعرانہ توجیہہ یہ ہے کہ جذبۂ شوق شہادت کا نتیجہ ہے۔

۴۔ آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۔۔۔ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آگہی = عقل، سمجھ + دام شنیدن = سامعہ + عالم = حال + تقریر = کلام

مطلب یہ ہے کہ محض سننے سے ہمارے کلام کا مدعا سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہاں اگر دام فکر بچھایا جائے تو عنقائے معانی عدم سے عالم وجود میں آسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ غور و فکر

سے ہمارے کلام کو سمجھ سکتے ہیں۔ غالباً اس شعر میں ان معاصرین کا جواب ہے جو استاد کے بعض اشعار کو بے معنی اور مہمل سمجھتے تھے۔

۵۔ بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا = بے چین، بے قرار + موئے آتش دیدہ = جھلسا ہوا بال، مراد بودا

فرماتے ہیں کہ قید و بند میری وحشت خرامی کے مانع نہیں ہو سکتے۔ بے قراری اور وحشت کا زور اس قدر ہے کہ زنجیر کے حلقے مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ اور حلقہ زنجیر میں مشابہت ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا؟

بروئے کار آنا = مراد پیدا ہونا، شہرت پانا + مگر = شاید

لفظ مگر بتلا رہا ہے کہ شعر میں طنز ہے۔ فرماتے ہیں دنیا میں صرف قیس ہی کے عشق کے چرچے ہیں۔ ڈر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز قیس کے کوئی دوسرا عاشق پیدا ہی نہیں ہوا۔ پھر کچھ ناراض سے ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا صحرائے عشق اس قدر تنگ ہے کہ اس میں قیس کے سوا دوسرے کی سمائی ہو ہی نہیں سکتی۔ پہلے مصرعہ میں عام لوگوں کا خیال ذکر کیا ہے دوسرے مصرعہ میں طنز آمیز استفہام سے اس خیال کی تردید کی ہے یہ مطلب ہے کہ صحرائے عشق بہت وسیع ہے۔ ہزاروں عاشق اسمیں آئے منجملہ ان ایک ہم بھی تو ہیں قیس کے استاد۔ مصرع اول کو بھی اگر بطور استفہام پڑھا جائے تب بھی شعر کا یہی مطلب ہوگا۔

۲۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی = پریشانی + نقش سویدا = سویدائے دل، دل کا سیاہ دھبہ + درست کرنا = بنانا

یعنی ہمارے دل کے سیاہ داغ آہوں کا نتیجہ ہیں۔ بحالت پریشانی ہم نے آہ کھینچی۔

آہ کے ساتھ دھواں بھی اٹھتا ہے۔ یہی دھواں قلب میں سویدا بن گیا یعنی ثابت ہوا کہ سویدائے دل آہوں کے دھوئیں سے بنا ہے۔

۳۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

خواب = غفلت + سود و زیاں = جنت و دوزخ، نفع، نقصان

فرماتے ہیں کہ جبتک ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اور ہم اپنی حقیقت سے واقف نہ تھے اسی غفلت کی حالت میں دفع ضرر اور حصول منفعت کی دعا کیا کرتے تھے لیکن جب حقیقت کھل گئی تو پھر سود و زیاں یعنی جنت دوزخ کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ اس مقام میں نہ جنت ہے اور نہ دوزخ۔

۴۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یعنی غمِ دل کے مدرسہ میں غمِ دل کا ہی سبق لے رہا ہوں کہ کبھی ہمارے پہلو میں بھی دل تھا اور اب نہیں رہا۔ اس کے ہونے کی یاد اور اس کے جانے کا غم ستاتا ہے۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

برہنگی = خفا سے ظہور میں آنا + وجود = وجود مطلق یا وجود حقیقی۔

فرماتے ہیں۔ جبتک میرا وجود خفا میں پوشیدہ تھا۔ بے عیب اور منزہ تھا جوں ہی عالمِ امکاں میں قدم رکھا یعنی ظاہر ہوا۔ ہر قسم کے عیوب سے داغدار ہو گیا۔ اور صرف کفن نے ان عیوب کی پردہ پوشی کی۔ بحالت زندگی خواہ وہ پارسائی کے لباس میں گزری یا رندی کے عیناک رہا اور اپنی اصل کے لئے موجب شرم و عار۔

۶۔ تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

تیشہ = بسولہ وہ آلہ جس سے پتھر تراشا جاتا ہے + سرگشتۂ خمارِ رسوم تھا = رسم و رواج کا پابند تھا

فرماتے ہیں قتل یا خودکشی کیلئے کسی نہ کسی آلۂ جارحہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو عوام کی بات ہے۔ عشاق جو امتیازی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ انکی موت تو اختیاری ہونی چاہئے

اگر وہ بھی آلہ جارحہ کے بغیر نہ مرسکیں تو عام لوگوں اور عشاق میں کوئی فرق نہ ہوگا
کوہکن کا تیشہ سے سر پھوڑ کر مرنا ثابت کرتا ہے کہ وہ بھی ایک معمولی مزدور تھا
اگر عاشق ہوتا تو اس کو جان دینے کے لئے تیشہ کی ضرورت نہ ہوتی۔

غزل نمبر ۳

۱۔ کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

عام طور پر چھیڑ یا دل لگی مقصود ہو تو کسی کی گم شدہ چیز ہاتھ میں چھپا کر کہتے ہیں کہ
فلاں چیز اگر ہمیں مل جائے تو نہ دیں گے۔ اس سے کہنے والے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ چیز
ہمارے پاس ہے معشوق بھی دل مٹھی میں چھپائے ہوئے دل لگی کر رہا ہے۔ دوسرا مصرعہ عاشق کا
جواب ہے۔ فرماتے ہیں کہ عاشقوں کے پاس دل ہی کہاں وہ تو پہلے ہی کھویا جاچکا ہے البتہ
اسکا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اے دوست وہ آپکے قبضہ میں ہے۔

۲۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

مطلب یہ ہے کہ زندگی بغیر عشق کے بے کیف ہے۔ غم زندگی کی دوا درد عشق ہی ہے
اور پھر یہ ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔

۳۔ دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دشمن معشوق کو طنزاً دشمن کہا گیا ہے۔
فرماتے ہیں کہ ہمارا دل دشمن کا دوست ہے۔ پھر اس کا بھروسہ کیا۔ دل سے جو آہ و نالہ نکلتا ہے
معشوق کو تڑپاتا نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ دل دشمن سے ملا ہوا ہے۔

۴۔ سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

پرکاری - چالاکی عیاری + جرأت آزما - صبر آزما
فرماتے ہیں کہ معشوق کا انداز تغافل قیامت ہے۔ اسکی دوسری ادائیں اس درجہ صبر آزما نہیں

سادگی اور بھولے پن میں بھی چالاکی و عیاری ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ اسکے تغافل کا کتنا گہرا اثر عاشق پر ہوتا ہے اسی لئے وہ بھولا بن کر تغافل کرتا ہے، اور ہم باوجود بیخودی دوست کی اس کاری گری کو خوب سمجھتے ہیں

۵۔ غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل   خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

اس شعر کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ غنچہ کو کھلتا ہوا دیکھکر ہم کو اپنا دل یاد آگیا غنچہ و دل سرخی گل اور خون کی تشبیہات واضح ہیں۔

دوسرے یہ کہ پھر آج شگوفہ کھل رہا ہے یعنی فتنہ جاگ رہا ہے اس لئے دل خون ہو کر گم ہو گیا۔ پہلے مصرعہ میں غنچہ کھلنے لگا اور دوسرے مصرعہ میں "پایا" ذومعنین ہے۔

۶۔ حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی   ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

مطلب یہ ہے کہ ہم کو اپنے دل کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ وہ ہمارے پاس نہیں آپکے پاس ہے

۷۔ شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا   آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

لفظ شور بغیر اضافت کے پڑھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس صورت میں شور پند ناصح کی صفت واقع ہو گی۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ ناصح کی نصیحت کی تلخی نے زخم دل پر نمک کا کام کر دیا کوئی ناصح سے پوچھے کہ ہم کو ستا کر آپنے کیا مزہ پایا۔ نمک پاشی اور مزہ پانے میں لفظی رعایت کھی گئی ہے

غزل نمبر ۴

۱۔ دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا   آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

محابا کے لغوی معنی لحاظ مروت کے ہیں لہٰذا بے محابا کے معنی ہو بلا لحاظ یعنے یکسر سوز نہاں سوز عشق سوز نہاں اور آتش خاموش میں تشبیہ ہے۔ خاموش اور گویا دو بالمقابل کے لفظ ہیں جن سے شعر میں خوبی پیدا ہو گئی ہے

یہ شعر اور اس کے بعد کے دو شعر تصوف کے رنگ میں ہیں۔

فرماتے ہیں کہ سوز عشق سے میرا دل اسی طرح خاموشی کے ساتھ جلکر راکھ ہو گیا تھا جسطرح آتش خاموش اندر ہی اندر جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور کوئی اس کا جلنا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں   آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

جوہر = ماسوا اللہ

فرماتے ہیں کہ عشق کی آگ میں سر سے پا تک جل گئے ہیں کہ بجز یار کے اور کچھ نہ باقی نہیں رہا۔ اب بس اللہ ہی اللہ ہے اور کچھ نہیں یعنی فنا فی الذات ہو گئے۔ پھر ذوقِ وصل کیلئے وریا دیار کہاں

۳۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عنقا = موہومات + عدم = مرتبۂ فنا + آہ آتشین = عشق + بال = بازو

صوفیا کی اصطلاح میں فنا و بقا دو منازل سلوک کے نام ہیں۔ فنا کی منزل میں سالک کو توہمات سے سابقہ پڑتا ہے۔ سالک رفتہ رفتہ ان کو دور کر کے فنائیت کامل حاصل کرتا ہے۔ جب یہ منزل پوری طرح طے ہو گئی تو بقا کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ اب شعر کا یہ مطلب ہوا کہ اے غافل یہ مت سمجھ کہ میں منزلِ فنا میں پڑا ہوں تو توہمات کا شکار ہو رہا ہوں بلکہ میں جملہ موہومات کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ فنائیت کامل کے بعد بقا کی منزل میں پہنچ گیا ہوں۔ عشق کی آگ سے توہمات کو جلانے کا مفہوم جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

۴۔ عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

شعر صاف ہے مگر انتہائی حسین مبالغہ کا حامل۔ عرض = جوہر گرمی جلنا۔ اندیشہ خیال ان لفظی عاتیوں نے شعر کو پُر شوکت اور دلپذیر بنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندیشہ اور فکر کی گرمی بیان سے باہر ہے جوں ہی صحرا نوردی کا خیال آیا کہ صحرا میں آگ لگ گئی۔ اسکے علاوہ آتش بیانی بھی جوہرِ اندیشہ کی گرمی کا مزید ثبوت ہے۔ دیکھئے کیسے گرم گرم شعر نکلتے ہیں۔

۵۔ دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

کارفرما، مہتمم، منتظم

مطلب یہ ہے کہ ہمارا سینہ جو داغہائے عشق کی روشنی اور جواہر ریزوں سے جگمگا رہا ہے دیدنی ہے۔ جبتک دل زندہ تھا یہ جواہر پارے مضامین عالیہ کی شکل میں منظر عام پر آتے اور دنیا کو منور کرتے رہے لیکن اب دل بجھ گیا ہے۔ اہلِ دنیا اس روشنی سے محروم ہو گئے جو ہمارے سینہ میں ہے۔

۶- میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

تپاک = اخلاص، محبت، اضطراب

اس شعر میں بھی وہی دل کے مرنے کا مضمون ہے۔ اہلِ زمانہ کی بیوفائی دیکھ کر دل جل گیا ہے۔ زندہ دلی اور خوشی جاتی رہی۔ افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

غزل نمبر ۵

۱- شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

شوق = عشق + رقیب = دشمن

اس شعر کی اور اسکے بعد کے شعر کی تشریح اپنے ایک مکتوب میں جو شاعر نے فرمائی ہے بجنسہ نقل کی جاتی ہے۔ رقیب بمعنی مخالف یعنی شوق سر و ساماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پھرا کرتا تھا۔ تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی ہے۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر تنِ عریاں ہی کھینچتے ہیں جب کھینچتے ہیں۔

۲- زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں۔ شعر

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں — وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخمِ تیر کی توہین بہ سبب یک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب یک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پرافشاں بمعنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے مناسبِ حال۔ یعنی یہ کہ تیر تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پرفشاں و سراسیمہ نکل گیا۔ (از عودِ ہندی)

۳- بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس شعر کا لطف بیان میں نہیں آسکتا۔ بار بار پڑھیں اور حظ اٹھائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذی روح و غیر ذی روح تیرا عاشق ہے۔ عاشق پراگندہ صفت ہوتا ہے اس لئے جو بھی تیری محفل سے نکلتا ہے پریشان نکلتا ہے۔

۴- دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مائدہ = دسترخوان + بقدر لبِ دنداں = تھوڑا سا، یاروں کے حوصلہ کے مطابق

مطلب یہ ہے کہ میرا دال درد عشق کی لذیذ نعمتوں کا دسترخوان تھا لیکن یاروں نے اس سے بہت تھوڑا حظ حاصل کیا یعنی میرے کلام سے جیسا چاہیئے لطف اندوز نہ ہو سکے اور نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔

۵۔ اے آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

ہمتِ دشوار پسند۔ ہمت مشکل پسند

فرماتے ہیں کہ عوام جس کام کو سخت دشوار سمجھتے ہیں ہماری ہمت کے مقابلہ میں وہ آسان ہی ہے مثلاً تعلیم فنا کو عام طور پر دشوار مانا جاتا ہے لیکن ہماری ہمت مشکل پسند بزمانہ تو آموزی ہی اس فن میں طاق ہو گئی۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور کونسا کام سکے لئے تلاش کیا جائے

۶۔ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے جو روئے تھے دل کا پورا خون آنکھوں سے نہیں بہا بلکہ کچھ قطرے دل میں گئے تھے۔ اب یہی رہے ہوئے قطرے طوفان بن گئے ہیں اور آنکھوں سے پھر سیلاب اشک جاری ہے

غزل نمبر ۶

۱۔ دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

نبرد = لڑائی + جنگ + باب = لائق، قابل۔

مطلب یہ ہے کہ عشق بڑا ہی جنگجو اور طاقتور پہلوان ہے۔ بڑے بڑے سورماؤں کو آن کی آن میں پچھاڑ دیتا ہے۔ ایرے غیرے تو صرف اسکی دھمکی میں مر جاتے ہیں ہم جیسے رستموں کا ہی کام گردہ ہے جو اسکے مقابلہ کی تاب لاتے ہیں اور وہ بھی مقابلہ کیلئے ہم جیسے مردوں کو ہی طلب کرتا ہے

۲۔ تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

فرماتے ہیں کہ قاعدہ تو یہ ہے آدمی کے مرنے کے بعد اس کا رنگ اڑ جاتا ہے مگر میرا رنگ زندگی ہی میں اڑ چکا تھا یعنے موت آنے سے پہلے ہی میں فنا ہو چکا تھا۔ زندگی میں موت کا کھٹکا اسلئے لگا ہوا تھا کہ کہیں میری فنائیت کامل سے پہلے موت نہ آجائے۔

٣۔ تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

وفا = عشق + مجموعۂ خیال = عام فنون سے متعلق جتنی کتابیں اس وقت موجود ہیں وہ یک وقت مرتب نہیں ہوئیں اور نہ کسی ایک مفکر کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ لاکھوں انسانوں کے خیالات اور انکی فکر و تحقیق کے نتائج صدیوں سے اکٹھے کیے جاتے رہے جو اب ہمارے سامنے کتابوں کی شکل میں ہیں۔ گویا جو خیالات فرد فرد تھے ہزاروں سال بعد مجموعۂ خیال یا کتاب کی شکل میں اب اکٹھے ہو سکے۔

شاعر کہتا ہے اس زمانہ میں جبکہ لوگوں کے خیالات فرد فرد تھے اور کسی فن کے متعلق کوئی کتاب مدون نہیں ہوئی تھی میں عشق و وفا جیسے دقیق مضمون سے متعلق نسخے تالیف کر رہا تھا۔ گویا میرے پہلے کسی نے عشق سے متعلق ایسی جامع تصنیف نہیں کی۔ عشق میں اپنی اولیت کا ذکر دوسری جگہ اس انداز سے فرماتے ہیں

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے　　　کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

٤۔ دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب　　　اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

رہگزر = راستہ جو دل سے جگر تک جاتا ہے یعنی سینہ + جلوۂ گل = بہار گلستاں + گرد تھا = ہیچ تھا۔ فرماتے ہیں ایک زمانہ ایسا تھا کہ دل ہر وقت شگفتہ رہتا تھا اور سینہ حسین ارمانوں رنگین جذبات مسرت و شادمانی سے بہار گلستان کو مات کرتا تھا مگر اب دل افسردہ ہے۔ ارمانوں اور جذبات کا خون ہو گیا۔ مسرت و شادمانی کی بجائے رنج و غم کی فراوانی ہے۔ گویا سینہ جو پہلے جلوۂ گل کو شرماتا تھا اب دریائے خون کا ساحل بنا ہوا ہے۔

٥۔ جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی　　　دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

فرماتے ہیں کہ اندوہِ عشق ایسا درد نہیں کہ اس کا سلسلہ کہیں ختم ہو۔ جب تک دل رہا غمِ عشق ستاتا رہا۔ ہم سمجھتے تھے کہ دل جو سب دکھوں کی جڑ ہے چلا جائے تو غم سے نجات ملے۔ جب دل گیا تو اسکے جانیکا درد شروع ہو گیا۔ غرض کہ عاشق کو کسی حال غم سے نجات نہیں ہے۔

٦۔ احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے　　　زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

چارہ سازی = علاج

فرماتے ہیں کہ احباب نے زیادہ سے زیادہ یہ تدبیر کی کہ مجھکو قید کر دیا تا کہ عالم دیوانگی میں بھٹک
نہ جاؤں مگر مرض وحشت کا یہ صحیح مداوا ثابت نہیں ہوا۔ جسم تو زندان میں تھا مگر خیال برابر بیابان کے چکر
کاٹ رہا تھا اور روح صحرا میں منڈلا رہی تھی۔ ایسے علاج سے کیا فائدہ؟

۷۔ یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزاد = علائق دنیا سے بے تعلق، فقیر + خستہ جان = بیمار، نحیف

فرماتے ہیں کہ اسد بحالت بے سرو سامانی و خستہ حالی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر مر گیا۔
اسکی لاش کا بے کفن ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آزاد یعنی درویش تھا۔ مغفرت کیلئے درویشی
سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ پس ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اسد کو بخش دے اسلئے کہ وہ لائق بخشائش تھا۔

غزل نمبر ۷

۱۔ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

شمار سبحہ = مالا جپنا + مرغوب یا = پسند آیا + بت مشکل پسند = معشوق جو مشکل کاموں کو پسند کرتا ہے یعنی سو دلوں
کا ایک مٹھی میں لینا مشکل ہی تو ہے۔ تماشا = دیکھنا، کھیل + بیک کف بردن = ایک مٹھی میں لینا، جھپٹنا، اڑا لینا
فرماتے ہیں کہ بت مشکل پسند کو سو دل ایک ہی جھپٹے میں لے لینے کا تماشا مرغوب ہے اسلئے جب وہ کسی زاہد یا
فقیر کو تسبیح پھیرتے ہوئے دیکھتا ہے تو پسند کرتا ہے۔ بعض حضرات نے شمار سبحہ کا فاعل معشوق کو سمجھا ہے،
بھلا تیرہ چودہ سالہ چنچل کو سبحہ سے کیا واسطہ؟

۲۔ بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

کشائش۔ عقدہ کشائی کرنیوالی قوت + عقدۂ مشکل = دل + بیدلی = مایوسی

فرماتے ہیں کہ کشائش کو ہمارا دل پسند آگیا اور اس نے اس عقدۂ مشکل کو ہم سے لے لیا۔
اب ہم بیدل ہیں۔ یہ بیدلی بھی کام کی چیز ہے۔ اگر دل ہوتا تو اسکے ساتھ ہزاروں خواہشیں اور امیدیں
ہوتیں۔ جب دل ہی نہ رہا تو امید بھی نہ رہی! اسلئے ہمیشہ کی مایوسی خود بخود آسان ہو گئی۔ حاصل یہ کہ
کشائش نے ہمکو بیدل کر کے بڑی آسانی سے عقدہ کشائی کی جسکی بدولت نومیدیٔ جاوید آسان ہو گئی

۳- ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوا- خواہش، آئینہ = ثبوت، دلیل - انداز = ادا -

فرماتے ہیں معشوق ایسا سفاک اور ایسا بے رحم ہے کہ اس کو عاشقوں کے خون میں تڑپنے کا منظر بہت پسند ہے - اسکی آنکھوں کو اس تماشے کی ایک چاٹ سی پڑ گئی ہے مگر ہر وقت اتنے بسمل کہاں ملیں اسلئے وہ سیرِ گل کیلئے جاتا ہے کہ بیک وقت صدہا بسملوں کو خون میں لوٹتے ہوئے دیکھ سکے اور یہی اسکی بیرحمی کا ثبوت ہے - بسمل کے خون میں تڑپنے اور گلوں کے پتوں پر جھومنے کی تشبیہ ظاہر ہے

۴- جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ — مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

تحفہ، ارمغاں، ہدیہ ہر سہ لفظ ہم معنی ہیں الماس ایک قسم کی بیش قیمت تلوار

یعنی معشوق کا خالی آنا ہی قابلِ مبارکباد ہے مگر اب تو وہ طرح طرح کے سوغات ساتھ آیا ہے - پھر ہم اپنے آپ کو جس قدر بھی مبارکباد دیں کم ہے - شعر میں کھلا طنز ہے

یا

غمخوارِ جانِ دردمند کا اشارہ عشق کی طرف بھی ہو سکتا ہے - یعنی عشق ان تحفوں کیساتھ آیا ہے

غزل نمبر ۸

۱- دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

نقش = منتر، تعویذ (باعتبارِ تسلی)

فرماتے ہیں کہ دنیا میں سبھی تعویذ تو باعثِ تسکین ہوتے ہیں لیکن وفا کا نقش آجتک موجب تسلی نہ ہوا - جو وفا شعار ہیں انکو وفا کا کوئی پھل نہیں ملتا - جب وفا کا کوئی نتیجہ اور اثر ہی نہیں تو یہ لفظ بے معنی نہیں تو پھر کیا ہے؟

۲- سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سرکش = مغرور، صفت کاکل بہ اعتبار پیچ و خم + حریف نہ ہوا = مقابلہ نہ کر سکا + افعی - نہایت زہریلا سیاہ سانپ + سبزہ خط کی زمرد سے اور زلف کی افعی سے بہت مشابہت ظاہر ہے - اور یہ بھی مشہور ہے

کہ افعی زمرد کے سامنے اندھا ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عام طور پر سبزۂ خط کے آغاز کے بعد لڑکوں کا حسن زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ زلف میں بھی دلکشی باقی نہیں رہتی مگر یہ کلیہ ہمارے دوست پر صادق نہیں آتا خط آنے پر بھی اسکی رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کاکل کی دلفریبی قائم ہے۔

۳۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

شعر صاف ہے۔ پھر بھی ایک دو باتوں کی تشریح ضروری ہے۔ اولاً شاعر کے پاس مرنا ایک ادنیٰ سی بات ہے اور اس کا اختیاری فعل ہے۔ جب چاہا ایک آہ کھینچکر یا آستانِ یار پر سر پٹک کر جان دیدی ثانیاً وفاداری کا یہ حال ہے کہ مرنے کیلئے بھی دوست کی اجازت چاہی جا رہی ہے اور چونکہ وہ مرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلئے زندہ اور اندوہِ جفا میں مبتلا ہیں۔

۴۔ دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی۔ گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

گزرگاہ = جادہ = راستہ + نفس = سانس

شعر میں تھوڑی سی شوخی ہے۔ تقویٰ اور رندی کو ایک ہی مرتبہ میں لا رکھا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر پاسِ انفاس کے ذریعہ منزلِ تقویٰ تک نہ پہنچ سکیں تو کیا ہرج ہے زندگی سنوارنے کے لئے دل میں مے و ساغر کا تصور بھی کافی ہے۔

۵۔ ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی۔ گوش منت کشِ گلبانگ تسلّی نہ ہوا

گوش = کان + منت کش = احسانمند + گلبانگ = خوشخبری، مژدہ

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے وعدہ نہ کرنے میں بھی میں خوش ہوں! اگر تیرے وعدہ کی تسلّی حاصل نہیں تو کم از کم یہ تسلی تو ہے کہ ہمارے کان وعدہ کی خوشخبری کے احسانمند نہ ہوئے گویا دوست کے وعدہ نہ کرنے میں بھی بھلائی کا ایک پہلو ہے اس لئے ہم اس صورت میں بھی راضی ہیں۔

۶۔ کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

موت جیسے اہم اور مشکل معاملہ کو کتنا آسان اور حقیر کیا ہے داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا

مطلب یہ ہیکہ دنیا میں سب سے آسان کام مرنا ہے۔ جب اسقدر سہل اور آسان کام بھی نہ ہوسکا تو دوسرے مشکل مقاصد کیونکر حاصل ہوسکتے ہیں۔ اِس بدقسمتی کا رونا کس کے سامنے روئیں؟

۷۔ مرگیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دمِ عیسیٰ کا یہ اعجاز مشہور ہیکہ بیمار تندرست اور مردہ زندہ ہوجایا کرتا تھا۔

مطلب یہ ہیکہ بیمارِ غم کی ناتوانی کی کوئی انتہا باقی نہیں تھی۔ آخرش علاج کیلئے حضرت عیسیٰؑ کو بلایا گیا۔ جوں ہی حضرت مسیحؑ نے دعا کیلئے لبوں کو حرکت دی کہ بیمار کا کام تمام ہوگیا۔ گویا بیمار میں جنبشِ لب کا صدمہ برداشت کرنیکی بھی تاب نہیں تھی۔ لطف یہ ہیکہ حضرت مسیحؑ کی جنبشِ لب سے بجائے تندرست ہونیکے موت واقع ہوگئی پھر شعر میں نزاکت یہ تھی ہیکہ حضرت عیسیٰؑ کی اہانت بھی نہ ہونے پائے۔ اگر آپ کے دعا دم کرنے کے بعد مرتا تو دعا کی بے اثری ثابت ہوتی۔ یہاں تو صرف جنبشِ لب سے

غزل نمبر ۹

۱۔ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ستائش گر = مداح + باغِ رضواں = جنت۔

جنت کی وسعت کو ایک گلدستہ میں محدود کردیا ہے اور پھر اس گلدستہ کو طاقِ نسیاں میں رکھکر محو کردیا۔ بیخودی اور نسیاں کا تعلق ظاہر ہے مطلب یہ ہیکہ زاہد جس جنت کی اسقدر تعریف کرتا ہے ہم بیخودوں کے پاس اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

"طاقِ نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھکر بھول جائیں۔ بیخودوں کے بہشت کو گلدستہ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔" (از یادگارِ غالب)

۲۔ بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا — کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

بیداد = ظلم + مرجان = مونگا + مژگاں رشتہ نما ہوتے ہیں اور قطرۂ خون دانہ مرجان سے مشابہ۔ دونوں کو ملا کر تسبیح بنا دی۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق کی لمبی لمبی پلکوں نے ہر قطرۂ خون کو چھید کر دانۂ مرجان سا قیمتی اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ پہلے مصرع میں فیضِ مژگاں کو ناز سے بیدادِ مژگاں سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں فیضِ مژگاں کا ثبوت موجود ہے یعنی ہر قطرۂ خون دانۂ مرجان سا قیمتی ہو گیا۔

۳۔ نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو۔ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت = رعب + دانتوں میں تنکا لینا = عاجزی و چاپلوسی کرنا + ریشۂ نیستاں = مراد بانسری

فرماتے ہیں کہ قاتل کا رعب بھی میرے نالوں کو نہ روک سکا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اسکے خوف سے نالے رک جاتے۔ اسکے برعکس سطوتِ قاتل کا اثر الٹا ہوا۔ اظہارِ عجز کے لئے گھاس کا تنکا دانتوں میں پکڑا تو وہ بانسری بن گیا اور اس سے نالے نکلنے لگے۔

۴۔ دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے۔ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

سروِ چراغاں = ایک مصنوعی درخت جو سرو نما بنایا جاتا ہے اور تقریبوں میں اسکو روشن کیا جاتا تھا۔

فرماتے ہیں کہ میرے سینہ میں صدہا سروِ چراغاں کا مواد موجود ہے اگر زمانہ نے فرصت دی تو ان کا تماشا دکھا دوں گا۔ ہر داغِ دل سروِ چراغاں کا ایک تخم ہے۔ صدہا داغ ہیں جن سے صدہا سرو نکلیں گے مگر تخم سے درخت بننے تک کچھ وقت درکار ہے۔ حاصلِ شعر کا یہ ہے کہ بہت سے رازہائے نغز و مخفی میرے سینے میں ہیں۔ اگر زمانے نے فرصت دی تو بصورتِ اشعار ان کا اظہار کیا جائیگا۔ جن سے پڑھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو جائینگی۔ استادِ فنونِ شاعری نے تخم سے درخت کے بھی تخم لگا دیئے۔

۵۔ کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے۔ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

آئینہ خانہ = آئینہ گھر جہاں ہر طرف آئینے ہی آئینے لگے ہوتے ہیں مراد دل + نقشہ = حال + پرتو = شعاعیں۔ شبنمستان = لفظ شبنم پر ستان زیادہ کرکے ظرفِ مکان بنا لیا یعنی جہاں شبنم گرتی ہو جیسے سبزہ زار وغیرہ

مطلب یہ ہے کہ جسطرح شبنم کے قطرے سورج کی کرنوں سے جگمگانے لگتے ہیں اسی طرح جلوۂ یار سے ہمارا پورا وجود منور ہو گیا ہے اور جدھر دیکھئے یار ہی یار نظر آتا ہے۔

۶۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تعمیر = ساخت + مضمر = پوشیدہ + ہیولیٰ = مادہ + برقِ خرمن = بجلی جو حاصل کشت کو جلا دے

مطلب یہ ہے کہ انسان کے ساتھ اسکی موت بھی پیدا ہوتی ہے اور اسمیں چھپی رہتی ہے کیونکہ وجود انسانی یا جسمِ انسانی کی نشوونما سے ثابت ہوتی ہے کہ موت کمین گاہ سے نکل کر اس کو فنا کر دے۔ اگر وجود ہی نہ ہو تو موت بھی نہ ہو۔ گویا ہستی و نیستی لازم و ملزوم ہیں۔ جسطرح خرمن اور برق خرمن۔ اگر خرمن نہ ہو تو برق خرمن بھی نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ برق خرمن کا مادہ خود خرمن ہے اور خرمن دہقان کے خون گرم یا محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے برق بھی گویا دہقان ہی کے خون گرم سے بنی ہے

۷- اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

پہلے مصرعہ میں گھر کی ویرانی کا ثبوت اور دوسرے مصرعہ میں اپنی بے سروسامانی و کسمپرسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یعنی گھر میں ہر سو سبزہ اُگنا ویرانی کی علامت ہے اور درباں کیلئے بجز گھاس کھودنے کے دوسرا کوئی کام بھی نہ ہونا بے سروسامانی کی دلیل ہے۔ درباں کا اصلی کام تو یہ تھا کہ گھر میں آنے جانے والوں کی خبر رکھتا اور بازار سے ضروریات فراہم کرتا۔ اسکے لئے یہ کام باقی نہیں ہے نہ کوئی ملاقاتی آتا ہے اور نہ بازار سے کچھ منگوانے کو روپیہ ہے

۸- خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

فرماتے ہیں۔ ہماری لاکھوں آرزوئیں ایسی ہیں جو بر نہیں آئیں اور دل ہی دل میں خون ہو کر رہ گئیں۔ گویا ہمارا دل ان آرزوؤں کا گورستان ہے۔ گور کیلئے چراغ بھی ضروری ہے۔ لہٰذا ہم خود ان آرزوؤں کی گور کا بے زبان چراغ ہیں۔ مطلب صاف اسقدر ہے کہ لاکھوں آرزوؤں کا خون ہونیکے باوصف حرف شکایت زبان پر نہیں آتا خاموش ہیں

۹- ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

پرتو = فروغ یا جھلک روشنی کی + نقشِ خیالِ یار = دوست کا تصور۔

مطلب یہ ہے کہ جسطرح زندانِ یوسف تاریک ہونے کے باوجود آپکے نورِ جمال سے منور تھا۔ ہمارا تنگ و تاریک دل بھی افسردگی کے باوصف پرتوِ تصورِ یار سے روشن ہے۔ ہنوز کا لفظ یہ اثر پیدا کر رہا ہے کہ مایوسی کی وجہ سے دل بجھ گیا ہے لیکن پھر بھی ایک امید کی کرن دوست کے تصور کی وجہ سے موجود ہے۔

۱۰- بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ — سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

رشک کی وجہ عاشق ہمیشہ بدگمان رہتا ہے معشوق کے خواب میں آکر تبسم کرنے کا یہ مطلب لے رہا ہے کہ وہ کہیں رقیب کے ساتھ سو رہا ہے اور مجھکو ستانے خواب میں آکر اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۱۱۔ نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

لہو پانی ہونا۔ لہو بہنا۔ قتل ہونا + قیامت ہے۔ غضب ہے + سرشک آلودہ ہونا۔ آبدیدہ ہونا

اس شعر سے ایک مفہوم تو یہ اخذ ہوتا ہے کہ نہیں معلوم کتنے عاشقوں کا خون بہا ہے کہ کہیں تیری آنکھوں میں کچھ آنسو آگئے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تجھکو آبدیدہ دیکھکر معلوم نہیں کہ کتنوں نے جان دیدی۔

۱۲۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نظر میں ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں + جادہ۔ باریک پگڈنڈی + شیرازہ۔ وہ ڈوری جس سے پراگندہ اوراق سئے جاتے ہیں + فنا کی پگڈنڈی اور شیرازہ میں تشبیہ ہے + عالم کے اجزائے پریشان۔ گردوپیش اور تحت و فوق کی جملہ موجودات جن کا ایک نام عالم امکان ہے۔

فرماتے ہیں راہ فنا کیا ہے ہم اسکو خوب سمجھتے ہیں اس راستہ سے پراگندہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں یہ تو پراگندہ اجزا کو یکجا کر کے اصل سے ملانیوالا ہے جملہ موجودات اس راستہ سے گذرتی اور اپنی اصل سے منسلک ہو جاتی ہیں۔

غزل نمبر ۱۰

۱۔ نہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

یک بیابان ماندگی۔ اس قدر تھکن جو ایک بیابان کے گھومنے سے پیدا ہو۔ اس قسم کے پیمانے غالب کے کلام میں جا بجا ہیں جیسے یک قدم وحشت "دو عالم دشت" "یک شہر آرزو" وغیرہ + موجہ۔ موج

مطلب یہ ہے کہ خواہ میں کتنا ہی تھک جاؤں میرے ذوق صحرانوردی میں کمی نہیں آسکتی۔ جس طرح دریا میں مسلسل موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور بلبلے نمودار ہوتے ہیں ٹھیک اسیطرح میری رفتار کا تموج جاری ہے اور اس کیساتھ ساتھ نقش پا صحرا میں بلبلوں کی طرح ابھرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ رفتار کو موج سے اور بلبلوں کو نقش پا سے تشبیہ دیگئی ہے۔

۲۔ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

شاعر نے اپنے ماضی و حال کی حالت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ طبیعت شگفتہ رہتی تھی مسرت و شادمانی کا دور تھا۔ اسباب طرب سے محبت تھی۔ مگر اب زمانہ بدل گیا۔ شگفتگی کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ رنج و غم کی فراوانی ہے۔ اسباب نشاط سے اب دل بیزار ہو گیا ہے۔

غزل نمبر ۱۱

۱۔ سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ۔۔۔۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

سراپا: بالکلیہ + رہن عشق: عشق کا بندہ + ناگزیر: مجبور + برق: عشق + حاصل: ہستی۔

فرماتے ہیں میں بالکلیہ عشق کا بندہ ہوں اور اسکے ساتھ ساتھ فطری طور پر اپنی ہستی کی محبت بھی ہے۔ عشق اور ہستی دو متضاد چیزیں ہیں۔ عشق کا کام وجود کو مٹانا ہے۔ عشق اپنا کام کئے جا رہا ہے اور میری ہستی فنا ہو رہی ہے۔ چونکہ طبعاً مجھکو اپنی ہستی سے محبت ہے اس لئے اسکے فنا ہونیکا افسوس بھی ہے۔ میری مثال اس دہقان کی ہے جو برق کی پرستش کرتا ہے اور جب بھی برق حاصل کشت کو جلا دیتی ہے تو خرمن کے جلنے کا افسوس بھی کرتا ہے۔

۲۔ بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی ۔۔۔۔ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ظرف: حوصلہ + خمار: نشہ کا اتار جسکی وجہ انگڑائیاں آتی ہیں + تشنہ کامی: تشنگی + خمیازہ: انگڑائی

یہ ایک حقیقت ہے کہ پینے والا اپنے حوصلہ کے موافق شراب پیتا ہے۔ کوئی ایک دو ساغر ہی میں چت ہو جاتا ہے اور کوئی خم کے خم لنڈھانیکے بعد بھی تشنہ کام رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی ہمارا حوصلہ اتنا بلند اور ظرف اتنا وسیع ہے کہ دریائے مے سے بھی ہماری تشنہ کامی دور نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ساحل دریا سے سیراب ہونے کے باوصف خشک لب اور خمیازہ کی حالت میں ہے۔ دریائے مے نوش کر کے بھی تشنہ کام ہوں اور خمار کی حالت طاری ہے۔ اے ساقی تیری فیاضی بھی میری تشنگی کو دور نہیں کر سکتی۔

غزل نمبر ۱۲

۱۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محرم: آگاہ + نواہا: نوا کی جمع آوازیں + حجاب: پردہ، اوٹ + ساز: باجہ

"یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے۔ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کیطرح بول رہے اور بج رہے اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں" (انیادگارِ غالب)

۲۔ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگ = حالت + رنگِ شکستہ = غصہ کی حالت + شکستن مصدر کے معنی تند شدن کے بھی ہیں اس لئے شکستہ کے معنی ہوئے تند شدہ + شگفتنِ گلہائے ناز = بحالت غصہ ہاتھ، پاوں، سر، گردن اور چشم و ابرو وغیرہ کا حرکت کرنا گویا معشوق کی ہر حرکت ایک ناز ہے۔ ان سب کے سوا غصہ میں زبان کا چلنا ستم ہی ستم ہے۔ سکون کی حالت میں زبان میں یہ حلاوت نہیں ہوتی۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق بحالتِ تندی و خفگی بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور اسکی یہی حالت نظارہ کیلئے صبح بہار جیسی حسین اور پر کیف ہے۔ اس لئے کہ غصہ کی حالت میں ہی اس سے غیر معمولی طور پر ناز و انداز ظاہر ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حسین بحالتِ غصہ حسین تر ہو جاتے ہیں اور ان کے حرکات و سکنات اور غصہ کی تیز تیز گفتگو حد درجہ دلربا ہوتی ہے۔

۳۔ تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو جو رقیب کو غصہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے بجائے اس کے کہ مجھکو اس سے خوشی ہوتی اس بات کا رنج و رشک ہو رہا ہے کہ جو پلکیں بار بار رقیب کی طرف اٹھ رہی ہیں میری طرف کیوں نہیں اٹھتیں اور میرے جگر کے پار کیوں نہیں ہوتیں۔

۴۔ صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں　　طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

صرفہ = فائدہ + طعمہ = غذا، لقمہ + نفسِ جانگداز = آہِ شرربار۔

یعنی میں ضبطِ آہ اس لئے کر رہا ہوں کہ اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔ وگرنہ میں اس قدر نحیف و نزار ہوں کہ میری ایک آہِ شرربار مجھکو خاکستر کر دیگی۔ (شاعر کا مقصود اپنے نفسِ جانگداز کی تاثیر اور اپنی ناتوانی ظاہر کرنا ہے)

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے　　ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

بساط۔ فرش + شیشہ باز۔ بازیگر جو شیشے سر پر رکھکر ناچتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ شیشوں کے اندر شراب جوش مار رہی ہے اسلئے شیشے فرش پر جہاں جہاں رکھے ہوئے ہیں اچھل رہے ہیں۔ اور ہر گوشۂ بساط جہاں شیشہ دھرا ہوا ہے بازیگر کا سر معلوم ہو رہا ہے شعر میں صرف جوشِ شراب کی کیفیت بیان کی ہے۔

۶۔ کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

کاوش۔ کاویدن مصدر سے حاصل مصدر بمعنی کریدنا، سعی کرنا + گرہ نیم باز۔ مراد دل

یعنی ناخن اور دل میں معاملہ طے ہو گیا کہ ناخن کرید کرید کر اس گرہ (دل) کو کھول دے لیکن ناخن نے اپنا آدھا فرض ادا کیا اور آدھا کام یوں ہی چھوڑ دیا۔ اب دل تقاضہ کر رہا ہے کہ ناخن اپنا پورا کام تکمیل کو پہنچائے اور اس گرہ کو پوری طرح کھول دے تا کہ معاہدہ کی تکمیل ہو جائے مطلب صرف اس قدر ہے کہ دل لذتِ کاوش کا طلبگار رہے۔

۷۔ تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

تاراج ہونا۔ برباد ہونا + کاوش۔ آزار + دفینہ۔ زمین میں دفن کیا ہوا خزانہ + گہرہائے راز۔ اسرارِ عشق

فرماتے ہیں کہ غمِ ہجر کی تکلیف سے میرا سینہ تباہ ہو گیا۔ اور جو رازہائے عشق و محبت اس میں پوشیدہ تھے وہ بھی تاراج ہو گئے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہجر کی تکلیف اور بے چینی نے رازِ عشق کو فاش کر دیا۔

غزل نمبر ۱۳

۱۔ بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

گنجینۂ گوہر۔ موتیوں کا خزانہ یہاں موتیوں سے مراد حکمت و معانی ہیں۔

یعنی قلعۂ معلیٰ میں پھر مشاعروں کا آغاز ہو گیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک قایم رہے۔

۲۔ شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

فرماتے ہیں رات ہوئی اور تارے جلوہ گر ہو گئے ٹھیک اسی شان سے جس طرح بتکدہ میں چراغ جگمگاتے ہیں۔ چونکہ مشاعرہ رات میں ہوتا ہے اسلئے شاعروں کی انجمن رخشندہ سے استعارہ کیا ہے۔ اور

ان کے عشقیہ اشعار کو بتکدہ کی روشنی سے تشبیہ دی ہے۔ حاصل یہ کہ مشاعرہ شروع ہو گیا۔

۳۔ گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

دشنہ = خنجر + دوست = مراد رقیب، دشمن + دوست کا فریب کھانا = دشمن کو دوست سمجھنا۔

فرماتے ہیں اگرچہ میں دیوانہ ہوں لیکن اتنی تمیز ضرور ہے کہ دوست اور دشمن میں امتیاز کروں رقیب بظاہر دوست بنکر میری دیوانگی کا علاج کرنے آیا ہے۔ فصد لینے کے بہانے سے نشتر ہاتھ میں رکھا ہے لیکن موقع پاکر کام تمام کرنے خنجر آستین میں چھپائے ہوئے ہے۔ ایسے دوست نما دشمن کا دھوکہ میں نہیں کھا سکتا۔

۴۔ گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

پری پیکر = حسین مراد معشوق + کھلا = بے تکلف ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر دوست ہم سے اپنے دل کی بات نہ کہے اور ہمکو راز دار نہ بنائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس مغرور کا بے تکلف ہونا بھی کچھ کم خوش قسمتی نہیں ہے۔

۵۔ ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

خیالِ حسن = تصورِ دوست + حسنِ عمل = نیک عمل + خلد = جنت

فرماتے ہیں کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ آدمی جس خیال میں مرتا ہے۔ قبر میں ویسا ہی سلوک اس سے کیا جاتا ہے۔ میں نے دوست کے تصور میں اپنی جان دی ہے اس لئے میری قبر میں جنت کا ایک دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ خیالِ حسن سب سے بڑا حسنِ عمل ہے۔

یا

خیالِ یار سے قبر میں مجھکو اتنی فرحت حاصل ہوتی ہے گویا قبر میں جنت کا دروازہ کھل گیا۔

۶۔ منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

عالم = حالت + منہ پر کھلنا = بھلا معلوم ہونا

دوست کا چہرہ مستور رہے پھر بھی دلفریبی کا یہ حال ہے کہ یہ کیفیت کہیں نہیں دیکھی۔ دوست کے منہ پر زلف سے زیادہ نقاب بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ گویا اس کا نقاب میں ہونا بھی دلفریبی سے خالی نہیں۔ (حقیقت

و مجاز دونوں طرف لے جا سکتے ہیں)

۷۔ در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

پھر گیا = مُکر گیا

مطلب یہ ہے کہ پہلے تو دوست نے دروازہ پر پڑے رہنے کی اجازت دی۔ ہم نے خوشی خوشی اپنا لپٹا ہوا بستر اس کے در پر کھولا کہ چلو اب مزے سے پڑے رہیں لیکن اس متلون مزاج کے دل میں کیا بات آگئی کہ ساتھ ہی در پر پڑے رہنے سے منع بھی کر دیا۔

۸۔ کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول؟ آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھُلا

شبِ غم تاریک کیوں ہے؟ کیا بلائیں نازل ہو رہی ہیں؟ کیا آج تارے آسمان ہی کے رُخ چمکیں گے اور زمین کا رخ تاریک رہیگا؟ یہ ہر سہ جملے استفہامی ہیں ان سوالوں کا جواب شبِ غم میں موجود ہے ـــــ یا ـــــ یہ کہ شبِ غم اسلئے تاریک ہے کہ بلائیں نازل ہو رہی ہیں اس صورت میں مصرعٔ اول کا دوسرا جملہ پہلے جملہ کا جواب ہوگا۔

۹۔ کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

حوادث = جمع حادثہ، آفات + کھلا خط موت یا سخت حادثہ کی علامت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسافری میں بھی چین نصیب نہیں۔ گھر سے مسلسل پریشان کن خبریں آتی رہتی ہیں

۱۰۔ اسکی امت میں ہوں مَیں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھُلا

گنبدِ بے در = آسمان

شبِ معراج آسمانوں کے دروازے کھُل گئے تھے اسی جانب اشارہ ہے مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

غزل نمبر ۱۴

۱۔ شکوے برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

زہرہ آب ہونا = پتا پانی ہونا + شعلۂ جوالہ = بنّی، مشعل کے گھمانے سے آگ کا جو حلقہ نظر آتا ہے اس کو شعلۂ جوالہ کہتے ہیں + گرداب = بھنور۔

شعر مبالغوں سے پرہے۔ فرماتے ہیں۔ رات ہمارے سوزِ دل کی بجلیاں ابر کا پتا پانی کر کے بارش برسا رہی تھیں کثرتِ بارش سے گرداب پیدا ہو گئے۔ بجلیوں کا عکس گرداب کے حلقوں پر پڑ رہا تھا جسکی وجہ ہر حلقۂ گرداب شعلۂ جوالہ معلوم ہوتا تھا۔

۲۔ شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا — شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

شوخیٔ وحشت ۔ وحشت کی شرارت یا تیزی + ذوق ۔ لطف + فسون ۔ دھوکہ، جادو۔

(یہ شعر بعض دیوانوں میں نہیں ہے۔ اور جن میں ہے اس کو مہمل سمجھکر شارحین نے حرف نظر فرمایا ہے)

فرماتے ہیں کہ اے دوست رات آپ تشریف لائے اور مجھ سے ہم کلام ہوئے۔ آپکی باتوں میں اس درجہ لطف آیا کہ دل بیتاب ہو گیا لیکن اس بے تابی اور وحشت نے شوخی اور شرارت کی کہ مجھکو جگا دیا آنکھ کھلنے پر معلوم ہوا کہ آپ کی تشریف آوری اور شرف تکلم کا جھوٹا قصہ (افسانہ) خواب کا دھوکہ تھا۔

۳۔ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

کرم بخشش، مہربانی یہاں اس سے مراد کرم فرما یعنی دوست ہے + عناں گیر ۔ روکنے والا + پنبۂ بالش تکیہ کی روئی اس شعر سے غزل کے خاتمہ تک محبوب کے عیش و نشاط اور اپنی محرومی و غمگینی کا تقابل ہے۔

فرماتے ہیں کہ دوست کو ہمارے پاس آنے میں عذرِ بارش مانع ہے۔ اور یہاں فراق میں روتے روتے سیلاب آگیا اور تکیہ کی روئی جھاگ کی طرح تیرنے لگی غضب تو یہ ہے کہ دوست جب کہ مہربانی پر مائل ہوا بارش شروع ہو گئی۔

۴۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

خود آرائی ۔ مراد دوست جو بناؤ سنگار میں معروف ہے۔

فرماتے ہیں کہ ایک طرف معشوق بناؤ سنگار میں مصروف ہے اور بالوں میں موتی پرو رہا ہے کہ خوب بن ٹھن کر نکلے ادہر ہماری آنکھوں سے بھی اشک کے موتی اس کثرت سے نکل رہے ہیں کہ تارِ نگہ ناپید ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ دوست بناؤ سنگار میں مصروف ہے اور اسکے فراق اور انتظار میں ہم روتے روتے بینائی کھو بیٹھے

۵۔ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

ناب : خالص + آب جو : نہر کا پانی

یعنی دوست کے ہاں عیش و نشاط کے جملہ سامان مہیا ہیں۔ چمن ہے، گلاب کھلے ہیں، شفاف پانی کی نہریں رواں ہیں جنہیں گلوں کے عکس نے چراغاں کا سما پیدا کر دیا ہے اور دوست ان جملہ اسباب عیش سے لطف اندوز ہے۔ اور ہم اسکی یاد میں خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔

۶۔ یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو　　　واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

سرِ پرشور : سر جس میں عشق کا سودا ہو + دیوار جو : دیوار کا متلاشی + فرق : سر فرقِ ناز : معشوق + بالش : تکیہ

فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ ہجرِ یار میں تڑپ رہے ہیں۔ بے خوابی کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی اور چاہتے ہیں کسی دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں۔ اس کے برعکس ہمارا دوست نرم نرم اطلس کے بستر پر کمخواب کا تکیہ سرہانے لئے آرام سے سو رہا تھا۔

۷۔ یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی　　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرماتے ہیں کہ ہم اپنے نفسِ شرربار سے محفلِ بیخودی کو روشن کر رہے تھے اور دوست کی محفل میں احباب کیلئے گلوں کا فرش بچھایا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ادھر ہم پر رشک سے بیخودی کا عالم طاری تھا اور دوسری طرف دوست احباب کیساتھ دادِ عیش و نشاط دے رہا تھا۔

۸۔ فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موجِ رنگ کا　　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

موجِ رنگ : عیش و نشاط کی کثرت + سوختن کا باب : جلنے کی حالت + فرش و عرش۔ زمین و آسمان اظہارِ کثرت کیلئے لائے گئے ہیں۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ دوست اپنے احباب کے ساتھ رنگ رلیوں میں محو ہے اور رشک نے ہمارے پورے وجود میں ایک آگ لگا رکھی ہے۔ اس سے پہلے کے شعر میں جو مضمون تھا وہی بہ تبدیلِ الفاظ اس شعر میں ہے۔

۹۔ ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا　　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

فرماتے ہیں کہ دل جو کاوشِ ناخن سے لذت اندوز ہو رہا تھا یکایک خونابہ ٹپکانے لگا۔ یعنی ناخن کے کریدنے سے دل زخمی ہو کر خون اس رنگ سے ٹپکانے لگا جیسا کہ اسکے بعد کی غزل سے ظاہر ہے۔ گویا اس کی

بعد کے شعر دل کا خونابہ ہیں جو بیساختہ ٹپک پڑے۔

غزل نمبر ۱۵

۱۔ نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا   تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

سپند۔ ایک قسم کا سیاہ دانہ جو نظر بد دور کرنے جلایا جاتا ہے + دل اور دانۂ سپند میں مشابہت ہے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ دل کی بیتابی آہوں میں اثر پیدا کرتی ہے لیکن رات بے تابی کے باوصف میرے نالوں میں اثر مفقود تھا چاہئے تو یہ تھا کہ دل اپنے نالوں کے اثر سے بزم غیر کو درہم برہم کر دیتا۔ اسکے برعکس اسنے غیر کی بزم وصل کیلئے اطمینان اور خاطر جمعی کا سامان فراہم کیا۔ یعنی اس بزم کو نظر بد سے بچانے کیلئے دانۂ سپند کی بجائے خود جلنے لگا۔ مطلب یہ ہے کہ غیر کی بزم کو دیکھکر رشک و حسد سے ہم جل رہے تھے اور ہماری اس بیتابی کو دیکھکر رقیب خوش اور مطمئن تھا۔

۲۔ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے   خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مقدم = آمد + نشاط آہنگ = مسرور + مگر = شاید

فرماتے ہیں طوفان کی آمد سے دل بیحد مسرور ہے۔ گویا کہ خانۂ عاشق ایک ساز ہے سیلاب کیوجہ سے صدہا نغمے اس سے نکلتے ہیں اور جب سیلاب نہیں ہوتا یہ ساز خاموش رہتا ہے اس لئے عاشق اپنی ساز نوازی کیلئے طوفان کا منتظر رہتا ہے۔ اور جب طوفان آکر گھر ویران کر دیتا ہے خوش ہو جاتا ہے۔

۳۔ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں   پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب ہے،

نازش = ناز، فخر + خاکستر نشینی = خاک نشینی + اندیشہ = خیال + سنجاب۔ ایک چھوٹا سا جانور جسکی کھال پر نرم نرم بال ہوتے ہیں۔ یہ کھال بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ سنجاب عموماً ترکستان میں پایا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں ان دنوں کی یاد میرے لئے باعثِ ناز ہے جبکہ میں عالم دیوانگی میں مٹی پر بیٹھا اور لیٹا کرتا تھا مگر میری روح اپنے محبوب کیساتھ سنجاب کے نرم و گداز بستر پر استراحت کرتی تھی۔

یا

اس زمانہ کی بےفکری اور استغناء کا کیا بیان کروں جبکہ بستر بھی میسر نہیں تھا لیکن دماغ آسمان پر تھا

۴۔ کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

جنون نارسا = عشقِ غیر کامل ۔ روکش = مقابلہ کرنے والا

فرماتے ہیں میرے عشقِ ناتمام نے میری کوئی مدد نہیں کی اور مجھے دیدارِ یار نصیب نہیں ہوا اگر عشق کامل ہوتا تو ذرہ ذرہ میں نورِ الٰہی کی جھلک مجھے نظر آتی ۔ عاشقانِ کامل ذرّوں میں بھی جمالِ محبوب دیکھ پاتے ہیں۔

۵۔ آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

فرماتے ہیں کہ اے دوست کل تک تیرا دل مہر و وفا کا سرچشمہ تھا۔ ہم عاشقوں پر صد ہا مہربانیاں ہوتی تھیں۔ تیری طبیعت میں یکایک کیا انقلاب آ گیا کہ اب تجھکو اپنے عاشقوں کی پروا نہیں رہی۔ ان سے تغافل برت رہا ہے۔

۶۔ یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

دیدۂ بے خواب اور حلقۂ دام میں تشبیہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست اس زمانہ کو یاد کر جب تو اپنے عاشقوں کا انتظار کیا کرتا تھا اور انکو گرفتارِ الفت کرنے کی بیسیوں تدبیریں کیجاتی تھیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ کبھی پوچھتا بھی نہیں اس درجہ بے اعتنائی مناسب نہیں۔

۷۔ میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شعر میں انتہائی مبالغہ کا لطف ہے۔ فرماتے ہیں کہ رات غالبؔ رونے پر آمادہ تھا لیکن میں نے اس کو روک دیا ورنہ طوفانِ نوح سے بھی بڑا سیلاب آ جاتا۔ دنیا تو تباہ ہو ہی جاتی لیکن آسمان کی بھی کچھ خیر نہیں تھی۔ کفِ سیلاب کی طرح تیرنے لگتا۔

غزل نمبر ۱۶

۱۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعت = امانت

فرماتے ہیں کہ مژگانِ یار نے جگر کو چھید چھید کر پورا خون بہا دیا۔ گویا جو خون میرے جگر میں تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی جسکو انہوں نے آخری قطرے تک حاصل کر لیا۔

۲۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

یک شہر آرزو = اتنی آرزوئیں جن سے ایک شہر بس جائے۔ یہ ایسی ہی ترکیب ہے جیسے "یک بیابان ماندگی"

آئینہ تمثال دار = آئینہ جس میں تصویر ہو۔ مراد دل۔

فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ایک شہر بھر آرزوئیں تھیں جسکے ٹوٹنے سے سب خاک میں مل گئیں اب جو ماتم ہم کر رہے ہیں وہ محض دل کے ٹوٹنے کا نہیں بلکہ دوست کی تصویر کے ضایع ہونیکا ہے جس کیساتھ ہماری جملہ آرزوئیں وابستہ تھیں۔

۳۔ گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

ہوا = آرزو + رہگزار = راستہ

فرماتے ہیں کہ میں نے دوست کی گلی کی آرزو میں جان دی ہے۔ زندگی میں اسکے رہگزار کا دلدادہ رہا۔ لہٰذا میری نعش کو ان گلیوں میں کھینچتے پھرو جو اسکی گزرگاہ تھیں تا کہ مرنیکے بعد کم از کم میری آرزو پوری ہو۔

۴۔ موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال — ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

سراب = تپتی ہوئی ریت یا شورہ زار جو دور سے پانی کی جھیل نظر آتا ہے، دھوکہ + وفا = محبت + جوہر تیغ = تلوار کے سبز نقش، تلوار کی آب + آبدار = تیز، جان ستاں

فرماتے ہیں کہ وشتِ محبت کا حال ہم سے نہ پوچھئے کہ کسقدر جان گداز ہے جس نے اس میدان میں قدم رکھا دھوکہ کھایا پہلے تو دور سے موجِ سراب کو دیکھکر امیدیں وابستہ کیں لیکن جوں جوں آگے قدم بڑھایا اس دشت کا ذرہ ذرہ جانستاں ثابت ہوا خلاصہ یہ کہ میدانِ عشق میں تکلیف ہی تکلیف اور دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

۵۔ کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

یہ شعر ذو معنین ہے۔ ایک مفہوم تو یہ نکلتا ہے کہ ہم کو غمِ عشق کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا

اس کو معمولی غم سمجھتے تھے۔ لیکن جب تجربہ ہوا اور دیکھا تو غم عشق کم ہونے کے باوجود دنیا کے سارے غموں کے برابر ثابت ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اوروں کی طرح ہم بھی غم عشق کو بے قدر اور آزار کا موجب سمجھتے تھے۔ لیکن جب غم عشق کم ہو گیا یعنی جاتا رہا تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا جہاں کے غم ٹوٹ پڑے ہیں۔ اب ہمیں غم عشق کی قدر ہو رہی ہے۔

غزل نمبر ۱۷

۱۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا" (از یادگار غالب)

۲۔ گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

کاشانہ۔ گھونسلا، جھونپڑی + ٹپکے ہے۔ ظاہر ہو رہا ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرا کثرتِ گریہ میرے گھر کی بربادی چاہتا ہے چنانچہ در و دیوار سے ویرانی کے آثار ہویدا ہیں۔ لفظ "ٹپکے ہے" شعر کی جان ہے جس سے لطفِ زبان ٹپک رہا ہے۔

۳۔ وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

فرماتے ہیں جنونِ شوق پر افسوس ہوتا ہے کہ خود ہی کھینچے کھینچے مجھکو محبوب کیطرف لیجاتا ہے مگر وہاں پہنچکر میں بےخود اور حیران ہو جاتا ہوں۔ بےخودی اور حیرانی کے عالم میں لطفِ دید حاصل ہوتا ہے نہ شرفِ تکلّم۔ ہر دم کا لفظ اشارہ اس بات کا ہے کہ ہر سانس میں عالمِ حیرانی و بےخودی طاری ہوتا ہے۔ اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

جلوہ۔ حسن + از بسکہ۔ بہت شدت سے + تقاضائے نگہ کرنا۔ اپنی جانب مائل کرنا، خواہش نمود کرنا + جوہرِ آئینہ

صیقل کی باریک لکیریں جو فولادی آئینہ میں ہوتی ہیں + مژگان = مراد آنکھ۔

شعر تصوف کا ہے مطلب یہ ہے کہ حسن کو خود نمائی کا شوق ہے۔ خود نمائی کے لئے خود آرائی ضروری ہے اور خود آرائی کیلئے آئینہ۔ شاہد آئینہ میں اپنے جمال کا مشاہدہ کر رہا ہے صفت نمود کا تقاضہ ہے کہ دوسرے بھی اسکے جمال کو دیکھیں حسن کی کشش نے سب کو طالب دیدار بنا دیا ہے حتیٰ کہ آئینہ بھی آنکھ بن کر جمال محبوب کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

۵۔ عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

عشرتِ قتل گہ = قتل گاہ میں جانیکی مسرت۔ شوقِ شہادت + اہلِ تمنا = عشاق + مت پوچھ = بیان سے باہر ہے

مطلب یہ ہے کہ عشاق کا شوق شہادت بیان سے باہر ہے قتل گاہ میں ننگی اور چمکدار تلوار کو دیکھ کر ان کو اتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی خوشی عوام کو ہلال عید کے نظر آنے سے حاصل ہوتی ہے ہلال او شمشیر میں تشبیہ ہے

۶۔ لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

بصد رنگ گلستان ہونا = ہر طرح خوش و خرم رہنا، پھولنا پھلنا + داغ = صدمہ، رنج

فرماتے ہیں کہ اے دوست ہم نشاطِ وصل کی تمنا کا داغ خاک میں لے جا رہے ہیں۔ اب یہ آرزو ہے کہ تو خوش و خرم پھولتا پھلتا رہے۔

۷۔ عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

زخم تمنا = تمنا جو بر نہ آئے خود ایک زخم ہے + نمکدان = ہر وہ کیفیت جو جگر میں درد پیدا کردے

مطلب یہ ہے کہ عشاق کو ناکام تمنا کا زخم کھانے سے راحت و مسرت حاصل ہوتی ہے ان کا جگر دردِ عشق سے لذت اندوز ہوتا ہے۔

۸۔ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

شعر توصیف و تشریح سے بے نیاز ہے۔ سارا لطف شعر کا "زود پشیمان" میں ہے۔

۹۔ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اس لئے کہ عاشق کا گریبان ہر وقت چاک و تار تار رہتا ہے۔

غزل نمبر ۱۸

۱۔ شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ۔۔۔ تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

خمار = تکلیف + شوق = شوق دید، انتظار + رستخیز اندازہ = نمونۂ قیامت + محیط بادہ = ساغر میں شراب کی لکیر کا دائرہ + صورت خانہ خمیازہ = انگڑائیوں کا تصویر گھر

یعنی رات مے خانہ میں ساقی موجود نہیں تھا۔ ساقی کے انتظار کی تکلیف میں نہ صرف مے خوار بلکہ مے خانہ کی ہر چیز مبتلا تھی جسکو دیکھئے خمار کی حالت میں انگڑائیاں لے رہا تھا انگڑائیوں کا عکس بلورین ظروف مے کشی میں پڑ رہا تھا اور وہ بھی انگڑائیوں کا تصویر گھر بن گئے تھے۔ یہ کرب و بے چینی کی کیفیت میدان حشر کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ ساقی کا انتظار اسلئے تھا کہ ساقی آئے اور شراب ملے۔ خمار کی تکلیف سرور سے مبدل ہو جائے۔

۲۔ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ۔۔۔ جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یک قدم وحشت = وحشت کا پہلا قدم + دفتر = کتاب + دفتر امکان = کائنات، عالم امکان + جادہ = بٹیا
دو عالم دشت = دونوں جہاں + شیرازہ = ڈوری جو کتاب کے اوراق کو اکھٹا کرتی ہے۔

فرماتے ہیں جبتک ہم جنون میں مبتلا نہیں ہوئے تھے عالم امکان کی حقیقت کا راز ہم پر منکشف نہیں ہوا لیکن جوں ہی عشق کی دیوانگی سر میں سمائی اور وحشت نے عقل کے راستہ سے ہٹا کر جنوں کی بٹیا پر ڈالدیا اس راستہ کے پہلے ہی قدم میں دفتر امکان کا سبق ہم پر کھل گیا اور ہر دو عالم کی حقیقت منکشف ہو گئی۔ گویا کہ جنون کی یہ پگڈنڈی ہر دو عالم کے اوراق پریشاں کا شیرازہ تھی کہ چھیڑتے ہی کتاب کھل گئی اور مضامین سے آگاہی حاصل ہوئی۔

۳۔ مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے ۔۔۔ خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

وحشت خرامی = دیوانہ وار چل نکلنا + صحرا گرد = مجنوں کی صفت

فرماتے ہیں کہ مجنون کا مسکن صحرا تھا جس کا کوئی دروازہ نہیں۔ مجنون کے پاس آمد و رفت میں کوئی روک ٹوک اور دشواری نہ تھی۔ اس آسانی کے باوجود لیلیٰ کا تڑپ کر مجنون کے پاس نہ جانا

قابلِ تعجب ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مجنون کے عشق اور کشش محبت کی کوتاہی تھی جو لیلیٰ کو نہ کھینچ سکی۔

۴۔ پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن ‌‌‌‌ دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

انداز استغناء = شانِ بے نیازی + مرہون و رہن دونوں لفظوں کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی ممنونِ احسان + حسن معشوق

فرماتے ہیں کہ معشوق کو اپنے حسن کی بے نیازی کا بڑا فخر تھا مگر غازہ اور حنا نے اس غرورِ استغنا کو رسوا کر دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاتھ حنا کے اور رخسار غازہ کے مرہونِ احسان ہیں پھر استغنائے حسن کہاں باقی رہا۔۔ یا ۔۔۔ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہے وہ کسی کا منت کش نہیں۔ لیکن دوست نے ہاتھوں میں مہندی لگا کر اور رخسار پر غازہ مل کر حسن کی شان بے نیازی کو رسوا کر دیا۔

۵۔ نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد ‌‌‌‌ یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

لختِ دل = دل کے ٹکڑے + بہ باد دادن = برباد کرنا، اڑا دینا

مطلب یہ ہے کہ نالۂ دل نے میرے دل کے ٹکڑوں کو ہوا میں اڑا دیا اور یہی اوراق پراگندہ دیوان بے شیرازہ بن گئے۔ جو نالہ کی ایک یادگار رہے۔ اس شعر میں استاد نے اپنے اشعار کی جانب اشارہ کیا ہے جو تاثیر میں نالۂ دلِ عاشق ہیں اور تڑپ میں پارہ ہائے دل۔

غزل نمبر ۱۹

۱۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ‌‌‌‌ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غمخواری = ہمدردی۔

فرماتے ہیں احباب میری کیا ہمدردی کر سکتے ہیں؟ یہی نا کہ ناخن کٹوا دیں اور زخموں کی مرہم پٹی کریں۔ لیکن یہ تدبیر سود مند نہیں۔ زخم مندمل ہونے تک ناخن بھی بڑھ آئیں گے اور احباب کی سعی سب رائیگاں ہو جائے گی۔

۲۔ بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ‌‌‌‌ ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

فرماتے ہیں۔ بندہ پرور لاپروائی اور بے توجہی کی کوئی حد ہے؟ ہم تو عرض حال کر رہے ہیں اور آپ سنی ان سنی کر کے فرماتے ہیں۔ کیا کہا؟

۳۔ حضرتِ ناصح گر آویں دیدۂ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

یعنی عاشق اور دیوانہ پر کسی کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ حضرت ناصح اگر تشریف لاتے ہیں ان کا آنا تو میرے سر اور آنکھوں پر مگر آکر کریں گے کیا؟

۴۔ آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟

کبھی تو تلوار نہ ہونے کا اور کبھی کفن کی عدم موجودگی کا عذر کیا کرتے تھے۔ آج ان دونوں چیزوں کیساتھ جارہا ہوں اب تو قتل کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہئے۔ سر پر کفن باندھے جانا شوقِ شہادت کا کافی ثبوت ہے۔

۵۔ گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا؟

ناصح سے مراد محض ناصح نہیں بلکہ دوست اور ہمدرد بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے اس نے نصیحت کی جب نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا تو قید کر دیا کہ کم از کم قید و بند میں رہنے سے جنون جاتا رہے گا اس پر شاعر طنزاً کہتا ہے کہ اس تدبیر کی بھی آزمائش کر لیجئے اس کے بعد خود بخود آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ جنونِ عشق کے لیے قید و بند کوئی اچھا مداوا نہیں۔ حضرت ناصح یہ آپ کا قصورِ فہم ہے کہ اس قسم کی تدابیر اختیار فرما رہے ہیں۔

۶۔ خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟

یعنی ہم پہلے ہی سے بندۂ زلف ہیں پھر زنجیر سے کیوں بھاگیں گے۔ اسی طرح گرفتارِ الفت بھی ہیں ایسی حالت میں زنداں کی قید و بند ہمکو کیا خوف زدہ کر سکتی ہے۔ زلف و زنجیر اور گرفتاری و زنداں کی مماثلت واضح ہے۔

۷۔ ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

معمورہ = شہر یہاں مراد شہرِ دلی۔ غم الفت = محبت (شاعرونکی اصطلاح میں عشق، محبت، الفت، غم ہیں)

کہتا ہے کہ دلی اجڑ گئی اور چاہنے والے اور محبت کرنیوالے سب ایک ایک کر کے چل بسے۔ ہمارے لئے دلی میں اب محبت کا قحط ہے پھر کس طرح دلی میں رہنا ہو عشاق غم کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں جب غم الفت ہی نہ رہا تو پھر کیا کھا کر ہم زندگی بسر کریں گے۔

اس غزل کا ہر مصرعہ ایک آبدار نشتر ہے جو بجلی کی سرعت سے دل میں اتر جاتا ہے۔

غزل نمبر ۲۰

۱۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یعنے۔ وصال یار ہمارے مقدر میں ہی نہیں تھا محروم ہو گئے۔ اگر اور بھی زندہ رہتے تو صرف انتظار وصل ہوتا۔ وصال نصیب نہیں ہوتا۔ جو چیز مقدر میں نہیں وہ کیسے نصیب ہو؟ شاعر نے اپنی بدقسمتی کا شکوہ کیا ہے۔

۲۔ ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لفظ "جانا" ذومعنین ہے۔ (۱) جان مع حرف ندا الف کے (۲) جاننا مصدر سے ماضی مطلق۔

(۱) اگر ہم یہ کہیں کہ تیرے وعدہ پر زندہ ہیں تو اے جان (معشوق) ہمارے اس بیان کو جھوٹ سمجھ

(۲) اگر ہم تیرے وعدہ پر زندہ ہیں تو یہ جان کہ ہم نے اس کو جھوٹ سمجھا۔ کیونکہ اگر ہم نے تیرے وعدہ کا اعتبار کیا ہوتا تو خوشی سے مر جاتے۔ ہمارا نہ مرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم نے تیرے وعدہ کو جھوٹ سمجھا

۳۔ تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

اس شعر میں بھی لفظ "جانا" سے کھیلا گیا ہے۔ عہد = وعدہ + استوار = مضبوط

مطلب یہ ہے کہ معشوق نے جس وقت وعدہ کیا ہم سمجھ گئے تھے کہ دوست کی طرح اس کا وعدہ بھی نازک ہے۔ یہ عہد بہت جلد ٹوٹ جائیگا۔ اور ہوا بھی یہی۔ اگر عہد مضبوط ہوتا تو اس کی نزاکت اس کو نہ توڑ سکتی۔ معشوق کی عہد شکنی شاعری کے مسلمات سے ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ظریفانہ انداز میں اسکی توجیہہ کی ہے۔

۴۔ کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(قاعدہ ہے کہ تیر انداز کمان کے چلے کو کان تک کھینچ کر چھوڑتے ہیں اس کیلئے بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایسا چھوڑا ہوا تیر بڑی تیزی اور زور سے نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ کمزور لوگ چلہ اس حد تک نہیں کھینچ سکتے اور تیر بھی اس زور سے نہیں نکلتا۔ معشوق بہت نازک ہے۔ وہ چلہ بدقت تمام نصف حد تک کھینچ سکا۔ تیر بھی گزر نہ نکلا۔ صرف جگر میں پیوست ہو کر رہ گیا۔)

فرماتے ہیں کہ تیرے تیر نیم کش کی حلاوت اور تعریف میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہر وقت اسکی
خلش سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ اگر یہ تیر جگر کے پار ہو جاتا۔ یہ دائمی حلاوت نصیب نہ ہوتی مطلب
صرف اس قدر ہے کہ معشوق کی نیم نگاہی میں جو لطف آتا ہے اس کے کسی اور انداز میں نہیں آتا۔

۵۔ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

"بنے ہیں دوست ناصح" اس جملے کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوست نصیحت کر رہے
ہیں دوسرا یہ کہ ناصح بظاہر دوست بن کر نصیحت کر رہے ہیں۔ دوست بننا بہت مشکل ہے اور
ناصح بننا بہت آسان۔ مطلب یہ ہے کہ ناصح جن کو ہم سے حقیقی ہمدردی نہیں بظاہر دوست بن کر
نصیحت کر رہے ہیں۔ ایسی دوستی کس کام کی؟ حقیقی دوستی تو یہ تھی کہ کوئی ہمارے درد عشق کا مداوا کرتا اور
کوئی از راہ ہمدردی محبوب سے ملانے کی تدبیر کرتا۔

۶۔ رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

وہ لہو، اس قدر زیادہ لہو۔ سنگ، یہاں مراد پہاڑ ہے + غم، عشق

جس طرح پتھر میں آگ پوشیدہ ہے عاشقوں کے سینے میں بھی عشق کی آگ پنہاں ہے۔ لیکن
پتھر کے شراروں اور عشق کی آگ میں کوئی مناسبت نہیں۔ وہ تو ٹکرا کر چند چنگاریاں گراتا ہے۔ اور
پھر ٹھنڈا ہو جاتا مگر عاشق، عشق کی حرارت سے ہر وقت پگھلتا رہتا ہے۔ اگر پتھر میں شرار کی بجائے
عشق کی آگ ہوتی تو پتھر کی ہر لکیر سے اس قدر خون جاری ہوتا کہ رکتا ہی نہیں۔ بڑے سے بڑا پہاڑ
بھی پگھل پگھل کر بہہ جاتا۔ غرض یہ کہ جس بار کو عظیم الشان پہاڑ نہیں اٹھا سکتے انسان جیسا کمزور
اس کا متحمل ہے ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

۷۔ غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

غم اور دل لازم و ملزوم ہیں۔ دل کے ساتھ غم ناگزیر ہے۔ فرماتے ہیں کہ غم ایک بلا ہے
روح فرسا اور جانگداز ہے کون اس کو بخوشی قبول کریگا مگر مجبوری یہ ہے کہ دل ہی جو غم سے نہیں بچ سکتا

ایک نہ ایک غم ضروری ہے۔ اگر غم عشق سے بچتے تو غم روزگار گلے کا ہار ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غم عشق جاں گسل ہونے کے باوجود غنیمت ہے جس کی وجہ انسان زمانے کے ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے۔

۸۔ کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے   مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

عام طور پر دنیا کی سب سے بڑی مصیبت موت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن شاعر اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شب غم موت سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ میں اس بلا کی تکلیف بیان نہیں کر سکتا۔ موت صرف ایک ہی وقت اور وہ بھی تھوڑی دیر کیلئے آدمی کو اذیت پہنچاتی ہے۔ مگر شب غم میں آدمی رات تمام اذیت فراق میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا ہزار مرتبہ مرتا ہے اور پھر جیتا ہے۔ پس ہزاروں بار مرنے سے ایک ہی دفعہ موت سے مرنا بہتر ہے۔

۹۔ ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا   نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اس شعر میں شاعر نے اپنی عام شہرت اور مقبولیت کو شاعرانہ انداز میں رسوائی سے تعبیر کیا ہے بات بات میں تفاخر کا پہلو نکال لینا غالب کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم دریا میں غرق ہوتے تو ہماری شہرت کے اسباب پیدا نہ ہوتے نہ ہماری قبر زیارت گاہ خاص و عام ہوتی اور نہ جنازہ اس شان و شوکت سے اٹھتا۔

چونکہ اس غزل کے آخری دو شعر تصوف کے رنگ کے ہیں اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ اس شعر کو بھی استاد نے اسی انداز میں کہا ہو۔ اس صورت میں شعر کا یہ مطلب ہو گا کہ اگر ہم غرق دریا ہو جاتے تو ہمارا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ اور نہ عوام کی زبان سے یہ سننے میں آتا کہ غالب مر گیا۔ یہ اس کا جنازہ ہے یہ اس کا مزار ہے۔ لوگوں میں اس قسم کی شہرت۔ ہماری توہین اور رسوائی ہے۔ درحقیقت ہم تو فنا فی الذات ہو چکے تھے۔ غالب باقی کہاں رہا تھا جو مرتا۔ انہوں نے اس خیال کو دوسری جگہ یوں بیان فرماتے ہیں ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

۱۰۔ اسے کون دیکھ سکتا کہ وہ یگانہ ہے وہ یکتا   جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

اس شعر میں تصوف کے اس عام مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ جب تک آدمی اپنے آپ کو ذات باری تعالیٰ میں فنا نہ کر دے رویت الٰہی سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ اگر دیکھنے والا اپنے آپ کو باقی رکھ کر دیکھنا چاہے تو یگانگی و یکتائی باقی نہیں رہے گی۔ دوئی ہو جائیگی یعنی دیکھنے والا ایک اور دوسرا جس کو دیکھا جا رہا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ذات باری تعالیٰ کسی چیز کے مشابہ نہیں کہ اس پر قیاس کر کے اسکو پا سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا پانا آسان تھا۔ ع اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

۱۱۔ یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

شعر صاف ہے محتاج تشریح نہیں۔ مولانا حالی مرحوم نے اس مقطع سے متعلق یادگار غالب میں ایک لطیفہ لکھا ہے۔ "سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا کہ بھئی! ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا نے کہا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں"۔ (از یادگار غالب)

غزل نمبر ۲۱

۱۔ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنیٰ امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے۔ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جسقدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے"۔ (از یادگار غالب)

۲۔ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

تجاہل پیشگی۔ جانتے بوجھتے اپنے آپ کو لاعلم ظاہر کرنا، جان کر انجان ہونا۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تم ہماری غرض و غایت جانتے بوجھتے۔ ہماری ہر بات پر "کیا" فرماتے ہیں اس تجاہل عارفانہ سے آپکا مقصد کیا ہے اور کب تک یہ انداز برتا جائیگا۔

۳۔ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں　　شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

نوازش ہائے بیجا = مہربانیاں جو رقیب پر ہو رہی ہیں

مطلب یہ ہے کہ اے دوست آپ ایک غیر مستحق یعنے رقیب پہ مہربانی فرما رہے ہیں اور ہم جو سچے عاشق اور مستحق ہیں آپ کی نوازشوں سے محروم ہیں۔ اس نا انصافی کی طرف ہم اپنی رنگین بیانی کے ذریعہ اشارہ کریں تو آپ کے لیئے گلے اور شکوہ کا کیا مقام ہے۔

یا

مجھکو تو گلہ اس بات کا ہے کہ آپ کی نوازشیں رقیب کے طرف ہو رہی ہیں میں اس بات کا شکوہ نہیں کرتا کہ آپ میری شکایتیں کرتے ہیں اسلیئے کہ آپ کا شکوہ بھی لطف سے خالی نہیں۔

۴۔ نگاہ بے محابا چاہتا ہوں　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

اس غزل کے دوسرے شعر میں شاعر نے جس خیال کو باندھا ہے اور معشوق کے تغافل کی شکایت کی ہے وہی مضمون دوسرے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں کامل التفات چاہتا ہوں یہ صبر آزما بے التفاتی اور تغافل کیوں برتا جا رہا ہے۔

۵۔ فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے　　ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

ہوس = بوالہوس، رقیب۔ فروغ = چمک، روشنی۔ پاس = لحاظ۔ ناموس = عزت۔ وفا = عشق و محبت

جس طرح گھاس کے شعلہ کی روشنی صرف ایک لمحہ رہتی ہے اہل ہوس کی بھڑک بھی تھوڑی دیر رہتی ہے۔ اہل غرض پاس وفا کیا جانیں؟ یہ تو ہم ہی ہیں جو رات تمام شمع کی طرح جلا کرتے ہیں اور شمع وفا کو بجھنے نہیں دیتے۔

۶۔ نفس موج محیط بے خودی ہے　　تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

محیط بے خودی۔ بے خودی کا سمندر

یعنی ہماری ہر سانس دریائے بے خودی کی ایک موج ہے اور ہم دریائے بے خودی میں غرق ہیں ایسی صورت میں شراب کی کیا ضرورت اور ساقی کے تغافل کا کیا گلہ۔ شراب تو بیخودی کیلئے ہی پی جاتی ہے۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ــــ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

۷۔ دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے ــــ غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

فرماتے ہیں کہ ہم کو عطرِ پیراہن معشوق کی بھی برداشت نہیں یعنی عالمِ بیخودی میں قوت شامہ ہی باقی نہیں تو پھر صبا کی آوارگی کا کیا غم۔ وہ جہاں چاہے پیراہن کی خوشبو اڑا لیجائے۔

۸۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ــــ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

دل = اصلیت حقیقت ۔ساز = باجا ۔ انا البحر = میں بحر ہوں۔

فرماتے ہیں کہ ہر قطرہ کے دل سے یہ نغمہ نکل رہا ہے کہ میں بحر ہوں اور یہ دعویٰ اسلئے درست ہےکیونکہ قطرہ بحر کا ہی تو قطرہ ہے۔ منصور نے بھی اپنی حقیقت کا اظہار نعرۂ انا الحق سے کیا تھا۔ ہم بھی اس بحرِ وحدانیت کا قطرہ ہیں۔ پھر ہمارا پوچھنا کیا ہے۔

۹۔ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ ــــ شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا

محابا = لغوی معنی لحاظ و مروت کے ہیں مگر یہاں فکر و اندیشہ کے معنوں میں آیا ہے۔ خون بہا = خون کی قیمت

فرماتے ہیں اے دوست کسی قسم کا اندیشہ مت کر اور میری طرف دیکھ میں اگر تیری تیر نظر سے مر جاؤں تو اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ تجھ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا کیونکہ بدلہ تو صرف کسی آلۂ جارحہ سے قتل کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نظر سے مرنے والوں کا خون بہا نہیں ہوتا۔

۱۰۔ سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن ــــ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

غارت گر جنس وفا = معشوق ۔ جنس وفا = دل ۔ شکست قیمت دل = دل کی قدر کم کرنا، دل شکنی کرنا

فرماتے ہیں اے ظالم تو ہر وقت ہماری دل شکنی کرتا ہے۔ تیری اس حرکت سے ہم پر کیا کچھ بیت جاتی ہے اس کا تجھ کو مطلق احساس نہیں۔ احساس ہو بھی کیسے جبکہ شکستِ دل کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اگر آواز ہوتی تو تو محسوس بھی کر سکتا اب ہم تجھکو خبردار کیئے دیتے ہیں سن اور غور سے سن کہ تیری اس بے وفائی اور طرزِ عمل سے ہمارا جنس وفا یعنی دل برباد ہو رہا ہے اس شعر میں جنس کی رعایت سے قیمت کا لفظ لایا گیا ہے۔

۱۱۔ کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ   شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

جگرداری۔ضبط و تحمل۔شکیب۔صبر

فرماتے ہیں کہ ہم نے جگرداری کا دعویٰ کب کیا جو آپ ہمارے ضبط و تحمل کی آزمائش کر رہے ہیں۔ بھلا کہیں عاشقوں کو صبر بھی آتا ہے۔

۱۲۔ یہ قاتل۔ وعدۂ صبر آزما کیوں   یہ کافر۔ فتنۂ طاقت رُبا کیا

اس شعر کا تعلق اوپر کے شعر سے ہے۔ جب ہم نے جگرداری کا دعویٰ نہیں کیا تو پھر جھوٹے وعدوں سے ہمارے صبر کا امتحان کیوں لیا جا رہا ہے اور یہ شرارت کس لئے ہے جس کی وجہ ہم جان بلب ہو گئے ہیں۔

قاتل، کافر = دونوں حرف تخاطب ہیں جن سے معشوق کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔

۱۳۔ بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

شعر تشریح و توصیف سے بے نیاز ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق کی گفتگو یا اس کا اشارہ یا ادا انفرادی طور پر بلائے جان ہیں۔ یعنے جان لینے میں سب برابر ہیں۔

غزل نمبر ۲۲

۱۔ درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا   پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

درخور = لایق + مطلب یہ ہے کہ دوست کا قہر و عتاب صرف ہم پر ہی نازل ہوا کرتا ہے کسی اور پر نہیں گویا قہر و غضب کے سزاوار بس ایک ہم ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا یہ دعا حق بہ جانب ہے کہ دنیا میں ہم سا سچا عاشق دوسرا کوئی پیدا نہ ہوا۔ استاد نے موردِ قہر و غضب ہونے میں بھی تفاخر و یکتائی کا ایک پہلو نکال لیا

۲۔ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم   الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بندگی = عبادت + آزادہ = آزاد + خودبیں + متکبر مگر یہاں خوددار و خودپسند کے معنوں میں آیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ کسی امیر یا بادشاہ کے دروازہ پر انتظار کرنا تو بڑی بات ہے۔ ہماری خودداری اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ خانۂ خدا کے دروازہ پر انتظار کریں اگر در کعبہ کھلا ہا تو زیارت

کرلی ورنہ لوٹ آئے۔ وہاں بھی انتظار کا ہمیں دماغ نہیں۔

۳۔ سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا — روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

سیما = پیشانی + آئینہ سیما = مہ جبین، حسین + روبرو ہونا = مقابل ہونا

فرماتے ہیں کہ اے دوست حسن میں تیری یکتائی سب کو مقبول ہے اس لئے کوئی دوسرا حسین تیرے مدمقابل نہ ہوسکا۔ یا تیری ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکا۔

۴۔ کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں — ترا بیمار برا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

نازش = ناز و فخر + چشم خوباں = نرگس بیمار، نیم باز مست آنکھ۔ عموماً معشوق کی آنکھ کو نرگس بیمار سے تشبیہ دیجاتی ہے

مطلب یہ ہیکہ ہم بھی بیمارِ غم ہیں اور دوست کی آنکھ بھی نرگس بیمار ہے۔ ہردو ایک ہی صفت سے متصف اور ہمنام ہیں۔ چشم خوباں کی ہمنامی کیا کوئی معمولی خطاب ہے۔ اس پر ہم جسقدر ناز کریں بجاہے۔ پس بیماری کا فخر تندرستی کی نعمت سے کم نہیں اور ہمارا بیمار رہنا ہی اچھا ہے۔

۵۔ سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نالہ = مراد خیال ۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے اثر آفریں خیالات جب شعر کی صورت اختیار کرکے لب تک آجاتے ہیں تو دنیائے شاعری میں ایک طوفان برپا کردیتے ہیں اور جو خیالات دل کے دل ہی میں رہ گئے اور انکے اظہار کا موقع نہیں آیا۔ وہ دل کے داغ بنکر رہ گئے۔ اسی طرح جو قطرہ دریا میں گر کر اپنے کو فنا کردیا وہ دریا ہوگیا۔ اور جو دریا میں شامل نہیں ہوا خاک کا رزق ہوگیا اور ایک ہلکا سا نشان مٹی پر چھوڑ گیا۔

۶۔ ہر بنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

حمزہ کا قصہ = داستان امیر حمزہ ۔ حمزہ کی داستان ایک فرضی افسانہ ہے جس سے دل تو بہل جاتا ہے مگر کسی قسم کا اثر و سوز و گداز پیدا نہیں ہوتا۔

فرماتے ہیں کہ عشق کی داستان اسدرجہ اثر آفریں ہیکہ جب ہم اسکی روداد سنانی شروع کریں تو سننے والے کے بال بال سے خون ٹپکنے لگے۔ یہ حمزہ کا قصہ نہیں ہے جو صرف دل بہلانے سنایا جاتا ہے

۷۔ نام کا میرے ہے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا　　کام میں میرے ہے وہ فتنہ جو برپا نہ ہوا

مطلب یہ ہیکہ قسام ازل نے جب دُکھ تقسیم کئے تو ایک ایک کے حصہ میں ایک ایک دُکھ آیا اور جو لاکھوں دُکھ باقی رہ گئے وہ سب میرے نام لکھدیئے گئے۔ اسیطرح وہ لاکھوں فتنے جو دبے ہوئے ہیں وہ میری بربادی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

۸۔ قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دجلہ و فرات۔ عراق کے دو مشہور دریا ہیں۔ مگر یہاں دجلہ سے عام دریا مراد ہے۔ لڑکوں کا کھیل۔ غیر اہم یا معمولی بات

فرماتے ہیں عارفانِ کامل کی بینائی کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے وہ تو قطرہ میں دریا اور جزو میں کل کو دیکھا کرتے ہیں

۹۔ تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشہ نہ ہوا

یعنی غالبؔ کے عشق و وفا کا امتحان ہونے والا تھا۔ مگر یہ تماشہ کسی وجہ سے نہیں ہوا۔

غزل نمبر ۲۳

۱۔ اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں　　کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

جنون جولان۔ جنون کی حالت میں چوکڑیاں بھرنے والا۔ بے سروپا۔ جس کا کوئی ٹھکانا نہ ہو۔ پشت خار۔ ایک پنجہ نما آلہ جس سے پیٹھ کھجلائی جاتی ہے عموماً فقیر رکھا کرتے ہیں۔ مژگان آہو اور پشت خار میں تشبیہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہم ایسے صحرا نورد بے ٹھکانہ فقیر ہیں کہ ہمارے پاؤں کو قرار نہیں۔ بحالتِ جنون صحرا میں چوکڑیاں بھرا کرتے ہیں۔ وحشی ہرن بھی جنون جولانی میں ہر وقت ہمارے پیچھے ہی رہتا ہے اور اسکی مژگان پشت خار کا کام دیتی ہیں۔

غزل نمبر ۲۴

۱۔ اپنے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا　　بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نارسائی۔ کوتاہی۔ بخون غلطیدۂ صدرنگ۔ پارسائی جس کا صدہا طریقوں سے خون ہوا ہے اور جو اپنے خون میں آپ لت پت ہے۔ دعویٰ۔ گھمنڈ

مطلب یہ ہیکہ ہم نے اوامر و نواہی کی بجا آوری میں کوتاہی کی اور گناہوں سے اپنی

پارسائی کا خون کیا ہے جو اپنے خون میں آپ لت پت ہے۔ زاہد تو اپنی نجات اور اسکی خوشنودی کیلئے بارگاہ رب العزت میں دعویٰ پارسائی کا تحفہ لے جاتے ہیں اور ہمارے پاس گناہونکی ندامت اور شرمندگی کے سوا کوئی چیز نہیں جو پیش کیجا سکے۔ پس بجائے دعوٰے پارسائی ندامت اور خجالت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہی خجالت ہمارا دعویٰ پارسائی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زاہد کو اپنے زہد کا گھمنڈ ہے اور ہم کو اپنے گناہونکی ندامت ہے۔ اس بارگاہ کبریائی میں سب سے بری چیز غرور اور سب سے اچھی چیز عاجزی ہے۔ لہذا بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہاں مقبول کون ہے اور مردود کون ہے؟

۲۔ نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا ‏ ‏ ‏ بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

فرماتے ہیں کہ حسن تماشا دوست ہے۔ اس کی اس تماشہ دوستی سے اندیشہ ہے کہ وہ رسوا ہو جائے یعنی لوگ اس بات کا الزام تراش سکتے ہیں کہ یہ ہرجائی اور بے وفا ہے۔ اس اندیشہ کی تردید کے لئے عاشقوں نے اپنی آنکھ کی صدہا مہریں ثبت کردیں گویا اس کے دعویٰ پارسائی کی توثیق و تصدیق ہو چکی ہے۔ اب رسوائی کا اندیشہ باقی نہ رہا مطلب یہ ہے کہ نظریں صرف نقاب پر پڑ رہی ہیں۔ دوست کا حسن کسی کو نظر نہیں آتا پس اس کا مستور رہنا اسکی پارسائی کا ثبوت ہے اور ہزاروں آنکھیں مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں

۳۔ زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ‏ ‏ ‏ چراغ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا

زکوٰۃ حسن = تجلیات کی ہلکی سی جھلک۔ جلوہ = نور۔ بینش = بینائی خواہ بصارت ہو یا بصیرت۔ جلوۂ بینش = نور بصارت یا بصیرت، استعارہ ذات واجب الوجود سے۔ چراغ = دل۔ مہر آسا = آفتاب کی طرح۔ کاسۂ گدائی = ایک معلوم چیز ہے۔ چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ درویش، زکوٰۃ، کاسہ گدائی، مہر، چراغ، حسن، بینش گویا تمام شعر الفاظ کی مناسبت، تشبیہات و استعاروں سے پر ہے۔

حسن حقیقی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ تجلیات کی ہلکی سی جھلک مجھ پر بھی پڑ جائے تاکہ اس فقیر کا دل آفتاب کیطرح روشن ہو کر پورے وجود کو منور کردے۔

۴۔ نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر ‏ ‏ ‏ رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

گردن پر خون رہنا = بے قصور کو قتل کرنے کی ذمہ داری رہنا۔

کہتا ہیکہ اے دوست تو نے مجھ کو بے قصور سمجھکر اور اس اندیشہ سے کہ بے قصور کو قتل کرنیکا وبال تیری گردن پر رہے گا قتل نہیں کیا۔ ہماری دیرینہ آرزو یہی تھی کہ تیرے ہاتھ سے قتل ہوجائیں دوست کا کام تو دوست کو نوازنا اور اس کو خوش کرنا ہے لیکن تو نے حق دوستی ادا نہ کر کے اس کا خون کیا ہے پس ہمیشہ کے لئے تیری گردن پر خون بے گناہ کی طرح حق آشنائی کے خون کی ذمہ داری رہیگی خلاصہ یہ کہ اگر تو ہم کو قتل کر دیتا تو حق دوستی ادا ہوجاتا لیکن تو تو ہم کو مبتلائے آلام رکھنا چاہتا ہے ہمکو بے جرم سمجھنا ایک بہانہ ہے ہماری آرزو پوری نہ کرنے کا۔

"کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اسلئے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گنہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔" (یادگار غالب)

۵۔ تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے   مٹا جس سے تقاضہ شکوۂ بے دست و پائی کا

سپاس = تعریف۔ شکوہ = شکایت۔ بے دست و پائی۔ مجبوری، لاچاری۔ تمنائے زبان = گویائی جو زبان کی فطری خواہش ہے۔ بے زبانی۔ خاموشی۔

یعنی ہماری گویائی کی تمنا خاموشی کی تعریف میں محو ہے جسکی وجہ کوئی حرف شکایت زبان پر آتا ہی نہیں۔ لہذا فطرت انسانی کا یہ تقاضہ کہ تکلیف اور مجبوری کا اظہار کیا جائے خود بہ خود مٹ گیا۔ اس شعر میں فقیری اور سلوک کے چند مسلمہ اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خاموشی، ترک خواہشات اور توکل سلوک کے اہم اصولوں سے ہیں۔ شاعر کا مطلب ہے کہ ہم نے ان اصولوں کو اپنا لیا ہے۔ اس لئے کسی مجبوری یا تکلیف کی شکایت ہماری زبان پر نہیں آتی۔

۶۔ وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے   چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نکہت گل = گل کی خوشبو۔ رنگین نوائی۔ رنگین بیانی، نغمہ سنجی۔ جلوہ = رونق۔ نفس = سانس۔ یہاں اس سے مراد شیریں کلامی ہے فرماتے ہیں۔ میرا نفس اور نکہت گل ایک ہی لطافت و خوشبو کے دو نام ہیں جسطرح پھول کی خوشبو دور دور تک پھیل کر دماغ کو معطر کرتی ہے میرے نفس یعنی میرے کلام کی خوشبو بھی دنیا میں پھیل کر سخن شناسوں کے مشام جان کو فرحت بخشتی ہے۔ گویا میری رنگین بیانی اور جلوۂ گل

علت و معلول ہیں۔ بہار چمن ہی میری نغمہ سنجی کا باعث ہے۔ حاصل شعر یہ ہیکہ میری رنگین بیانی میں وہی اثر ہے جو بہار گلستان میں ہے۔

۷۔ دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی　　عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

پیغارہ جو، طعنہ زن، لڑاکا۔ زنجیر، سلسلہ۔ دہن، مشابہت میں زنجیر کی کڑی اور صفت میں معدوم

اس شعر کو سمجھنے سے پہلے شاعری کے بعض مسلمات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ہر معشوق یا حسین تند خو، بے وفا، ظالم اور لڑاکا ہوتا ہے (۲) دہن کا چھوٹا ہونا حسن کی علامت ہے شاعروں نے معشوقوں کے منہ کو چھوٹا کرتے کرتے جوہر فرد بنتے خیالی نقطہ بنا دیا۔ بعضوں نے مبالغہ کو تھوڑا سا اور آگے بڑھا کر دہن معشوق کو معدوم ہی کر دیا۔

اب مطلب یہ ہوا کہ ہمارا معشوق اس قدر ظالم اور بے وفا ہے کہ اور تو اور دوسرے معشوق بھی اسکو ملامت کر رہے ہیں۔ (یہ بے وفائی کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا) حسینوں کی اس ملامت سے ہمارے دوست کی رسوائی کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے جو عدم تک پہنچ گیا ہے

۸۔ نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے　　کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

حسرت سنج، آرزومند ــــ فرماتے ہیں۔ غالب خط کو مختصر کر کے آخر میں اپنا مدعا بیان کر دے کہ حاضر خدمت ہو کر بالمشافہ ستمہائے جدائی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ درخواست یا خط میں آخری جملے اظہار مدعا کے ہوتے ہیں۔

غزل نمبر ۲۵

۱۔ اگر نہ اندوہِ شب فرقت بیاں ہو جائیگا　　بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائیگا

اندوہ، رنج۔ مہر دہاں، خاموشی۔ مہر اور داغ میں مشابہت ہے۔

مطلب یہ ہیکہ شب فرقت کا غم بیان کر کے اگر ہم دل ہلکا نہ کریں اور ضبط نالہ کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا نالہ جو بوجہ خموشی رک گیا ہے سینہ کا داغ ہو جائیگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح چاند پر داغ ہوتا ہے اسی خیال کو دوسری جگہ یوں بیان فرماتے ہیں ع

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا

چاند کے داغ سے سینہ کے داغ کی تشبیہ سے اپنی سینہ صافی کا اظہار مقصود ہے یعنی ایسا سینہ جو چاند کی طرح مصفا ہے۔

۲۔ زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب   پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ شب ہجر کی دہشت سے جس طرح ہمارا پتا پانی ہوتا ہے اگر اسکے خوف سے چاند کا بھی زہرہ آب ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ چاندنی سیلاب بن کر گھر بار کو برباد کر دے گی۔

۳۔ دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا   یعنے یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائیگا

ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا دل عشق و وفا کی منزلوں میں ہمارے کام آئیگا لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ بوقت امتحان سب سے پہلے دل ہی ہاتھ سے نکل جائیگا۔

۴۔ باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر   ہر گل تر ایک چشم خونفشاں ہو جائیگا

گل تر اور چشم خونفشاں کی تشبیہ ظاہر ہے۔ حال = حال زار

فرماتے ہیں اے دوست اپنے ساتھ مجھ کو باغ میں نہ لے جا۔ ورنہ میرے حال زار کو دیکھ کر باغ کا ذرہ ذرہ رو دے گا۔ اور ہر گل تر چشم خونفشاں سے بدل جائیگا۔ پھر تجھ کو سیر باغ کا لطف کیسے آئے۔ بظاہر معشوق کیساتھ اظہار ہمدردی فرمایا جارہا ہے لیکن درحقیقت اس کی بے وفائی اور بے مہری پر چوٹ کی ہے۔ یعنی جس خستہ حال کو دیکھ کر بے جان بھی خون کے آنسو بہائیں۔ تجھ پر اس کی خستہ حالی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اپنی خستہ حالی کی جانب جس انداز میں معشوق کو توجہ دلائی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔

۵۔ سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا   مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

مطلب یہ ہے کہ چونکہ خدا کو سب دوست رکھتے ہیں اس لئے ایک اس کا راضی ہونا ساری خدائی کے مہربان ہونے کا باعث ہے۔

۶۔ گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

نگاہ گرم = غصہ کی نظر۔ اگر دوست کی قہر آلود نظر ہم کو آہ و زاری سے روکتی رہے

توخون آنکھوں سے بہنے کی بجائے۔ رگوں میں پوشیدہ ہو جائیگا ٹھیک اسی طرح جیساکہ شعلہ خس میں پوشیدہ رہتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح حرارت سے خس شعلہ پوش ہو کر خاکستر ہو جاتا ہے میرا وجود بھی آتش غم سے بھسم ہو جائیگا۔

۷۔ لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

شعر محتاج تشریح نہیں ممکن ہے رنگینی شباب کا کوئی واقعہ یاد آگیا ہو۔

۸۔ وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہو ابتلک تو یہ توقع ہیکہ واں ہو جائیگا

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے مظالم کی داد اس دنیا میں تو نہیں مل سکتی۔ اب روز جزاء کا انتظار ہے کہ وہاں ضرور انصاف ہو گا۔ اگر وہاں بھی انصاف نہ ہو تو افسوس کا مقام ہے۔

۹۔ فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

جی = جان + اے اسد تو بھی دانا ہے اس بات پر غور کر کہ دل کے اشاروں پر ناچنے سے کیا فائدہ وہ تو ناداں ہے مثل مشہور ہے کہ ناداں کی دوستی جی کا زیاں وہ کبھی تجھ کو عشق کے راستہ پر ڈالے گا اور کبھی کشاں کشاں کوئے جاناں لے جائیگا۔ غرض تیری جان لے کر ہی رہے گا۔

غزل نمبر ۲۶

۱۔ درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

یعنی درد عشق ہر قسم کی دوا سے بے نیاز ہے۔ اور اس درد کا باقی رہنا ہی اچھا ہے

۲۔ جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

تماشہ = دل لگی، تمسخر + فرماتے ہیں کہ اگر ہم اوروں کے سامنے ذلیل ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی خصوصیت کیساتھ رقیبوں کو جمع کر کے ہماری شکایت کرنی ایک شوخی اور شرارت ہے۔ اس طرح گلہ شکوہ کرنا گویا ہمارا مضحکہ اڑانا ہے۔

۳۔ ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

یعنی جب تجھ جیسا سفاک قتل کرنے آمادہ نہ ہو تو پھر تجھ سے زیادہ بے رحم کہاں ملے۔

۴ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

رقیب : جملہ عیبوں اور کمزوریوں کا مجموعہ یعنی بے وفا، کمینہ ، زود رنج ، کم حوصلہ ، خود غرض ، بزدل وغیرہ

فرماتے ہیں کہ رقیب جیسا بوالہوس اور غرض مند بھی تیری گالیاں کھا کر بے مزہ نہیں ہوتا ہے تو تیرے لبوں کی بے پناہ شیرینی اور حلاوت اندازہ سے باہر ہے۔

۵ ۔ ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

"آج ہی" کا لفظ انتہائی بدبختی کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی ہمیشہ تو بوریا رہتا تھا مگر دوست کی آمد کے موقع پر بوریا بھی نہیں۔ پھر وہ ٹھہریں کیسے؟ بوریا ہوتا تو کچھ دیر بیٹھ بھی جاتے۔ وہ تو ٹھہرے حیلہ جو، ان کے نہ ٹھہرنے کیلئے یہی حیلہ کافی ہے۔

۶۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

"کہتا ہے میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے"

(از یادگار غالب)

۷ ۔ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یعنی اگر ہم نے راہ خدا میں جان بھی دیدی تو کونسا بڑا کام کیا۔ کسی کی امانت لوٹانا بھی کچھ بات ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ جان دیکر بھی حق بندگی و اطاعت کی ادائی سے قاصر رہے۔ عام طور پر جان دینا سب سے بڑی قربانی اور ایثار سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کا خیال ٹھہرا مگر عاشقانِ الٰہی کا یہ حال ہے کہ ہزاروں جان ہوں بھی تو قربان کردیں اور پھر یہ سمجھیں کہ حق عبودیت ہم سے ادا نہ ہوا۔

۸۔ زخم گر دب گیا لہو نہ تھما کام گر رک گیا روا نہ ہوا

روا ہونا = جاری ہونا ۔ شاعر نے اپنی بدقسمتی کا شکوہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں زخم مندمل ہو کر ناسور بن جاتا ہے اور خون جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کام رک جاتا ہے تو وہ جاری نہیں ہوتا۔ یعنی

کار اجرائی نہیں ہوتی۔

۹۔ رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے   لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

دل ستانی : معشوق + دل ستاں : معشوق

شعر میں معمولی مزاح ہے۔ کوئی خاص بات قابلِ تشریح نہیں۔

۱۰۔ کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں   آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

"سنا گیا کہ یہ مشاعرہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے طرح میں غزل نہیں لکھی تھی۔ جب اصرار مبالغہ کی حد تک پہنچ گیا تو یہ غیر طرح غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا" (از مرآۃ الغالب)

غزل نمبر ۲۷

۱۔ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا   گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

شوق : عشق + محو ہونا : کھوئے جانا + گہر : ابرِ نیساں کا قطرہ جس کی حقیقت پانی ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے شوق کے اضطراب کے مقابلہ میں دریا کا تلاطم ہیچ ہے۔ وہ تو گہر جیسی بے مقدار چیز میں فنا ہو جاتا ہے۔ یعنی قطرہ جب موتی بن جاتا ہے تو تلاطم محو ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے دل کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر دو عالم اس میں بآسانی سما سکتے ہیں۔ دل کی ان وسعتوں کے باوصف شوق تنگیٔ دل کی شکایت کئے جا رہا ہے۔ ایک طرف دریا کا تلاطم ہے جو ایک حقیر موتی میں جذب ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف شوق ہے کہ دل جیسی "دو عالم وسعت بہ پہنائی" کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ (دل کی وسعت اور شوق کی فراوانی کو اس انداز سے کسی نے بیان نہیں کیا۔ اسی طرح دریا کی بے مایگی اور طوفان کی بے بضاعتی کو اس سے زیادہ کوئی رسوا نہ کرسکا)

۲۔ یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب   مگر ستم زدہ ہوں شوقِ خامہ فرسا کا

پاسخ : جواب + شوقِ خامہ فرسا : لکھنے کا شوق

یعنی مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ تو میرے کسی خط کا جواب نہ دیگا۔ پھر بھی جو خط پر خط

دوڑا رہا ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ شوق خامہ فرسائی پختنت بیٹھنے نہیں دیتا۔

۳۔ حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی   دوامِ کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

پائے خزاں۔ خزاں کو معشوق بنا کر شاعر نے اس کے پاؤں کو مہندی بھی لگا دی۔

مطلب: یہ کہ دنیا میں صرف خزاں ہی خزاں ہے۔ اور ہم جس کو بہار کہتے ہیں اگر اسی کا نام بہار ہے تو اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ خزاں پر عارضی طور پر رنگ چڑھ جاتا ہے اور پھر پاؤں کی مہندی کی طرح تھوڑے ہی عرصہ میں رنگ اڑ جاتا ہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے ہمیشگی تو کلفت خاطر کو حاصل ہے اور جس کو ہم عیش دنیا کہتے ہیں وہ کلفت پر مسرت کے عارضی رنگ کا نام ہے۔

۴۔ غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

فراق کا غم ہو خواہ کوئی اور قسم۔ غم کی حالت میں اسباب مسرت و تفریح انسان کو دکھ پہنچاتے ہیں۔ ایسی حالت میں سیر باغ بھی تکلیف دہ ہے اور خندۂ گل بھی موجب آزار۔

"خندۂ گل کو خندۂ بے جا اس لئے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا۔ گویا اس کا خندہ بے محل ہے" (از یادگار غالب)

۵۔ ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں   کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

محرمی = روشناسی، واقفیت + بن مو = مسام

فرماتے ہیں کہ ہر بن مو شوقِ دید میں آنکھ ہو گیا ہے اور حسن کو دیکھ رہا ہے اس کے اوصف میں حسن کی حقیقت جاننے سے قاصر ہوں۔

۶۔ دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے   ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنا دل معشوق کے تقاضہ کرنے سے پہلے ہی اس کے حوالہ کر دیا ہمکو اتنی برداشت کہاں کہ معشوق کے ناز و ادا سے مانگنے تک انتظار کرتے۔ مطلب یہ کہ عام طور پر معشوق سے ناز و انداز کا ظہور ہونے کے بعد دل دیا جاتا ہے مگر ہم ایسے دل پھینک عاشق ہیں کہ حسن پر نظر پڑتے ہی فریفتہ ہو گئے۔

۷۔ نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرتِ دل ہے — میری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

جمع و خرچ = حساب ۔۔۔ فرماتے ہیں کہ گریہ اور حسرت دل کی حقیقت کو صرف میں جانتا ہوں دوسرا اس کو کیا جانے اسلئے یہ مت کہہ کہ گریہ حسرت دل کے موافق ہے ۔ دریائے خون کا جمع و خرچ میری نگاہ میں ہے ۔ یعنی میں جانتا ہوں دوسرا نہیں جان سکتا ۔ مطلب یہ کہ میرے طوفان گریہ کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حسرت بھی اتنی ہی ہوگی لیکن میری حسرت اس سے بہت زیادہ ہے ۔

۸۔ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسدؔ — جفا میں اسکی ہے انداز کارفرما کا

کارفرما = حاکم ۔ یہاں اس سے مراد معشوق ۔ (فلک = عداوت، ظلم، کمینہ پن کا منبع یعنی عشاق شرفا اور اہل ہنر کا دشمن، سفلوں کا دوست ۔ غرض جتنی بری صفات ہیں شاعر بےچارے فلک سے منسوب کرتے ہیں ۔ وجہ اس کی صرف اس قدر ہے کہ دنیا کے حادثات اور واقعات کا ظہور زمانہ میں ہوتا ہے اور زمانہ سیاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے ۔ ایک گروہ اہل نجوم کا ایسا ہے جو دنیا کے اچھے برے جملہ واقعات کو تاروں کی گردش کا نتیجہ مانتا ہے چونکہ ستارے آسمان پر ہیں اس لئے اس جرم میں اسکو مجرم قرار دیا گیا ہے)

فرماتے ہیں کہ آسمان کو دیکھتے ہی مجھے معشوق یاد آجاتا ہے اس لئے کہ اس کی چال ڈھال معشوق سے ملتی جلتی ہے اور جتنے ظلم وہ عشاق پر توڑتا ہے وہ معشوق کے ہی حکم و اشارہ پر ۔ جب فلک جیسا ظالم اس کا محکوم ہے تو حاکم کے ظلم کا کیا ٹھکانا ؟

غزل نمبر ۲۸

۱۔ قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

نفس پرور = جان نواز، دلکش ۔

مطلب یہ کہ قطرہائے مے انتہائی حیرت کے باعث بجائے ٹپکنے کے خط جام مے کے گرد ساکت ہوگئے جس کی وجہ خط موتیوں کی لڑی بن گیا اور قطرہ ہائے مے موتیوں کی طرح دلکش و جان نواز نظر آتے ہیں ۔

۲۔ اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

فرماتے ہیں کہ دوست کو میرے عشق کا اعتبار ہے۔ اس اعتبار سے بجائے اس کے کہ مجھ کو کچھ فائدہ پہنچے نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی محفل میں غیر آہ کرتا ہے اور وہ ظالم خفا ہوتا ہے مجھ پر کہ بجز اس کے کسی اور نے آہ نہیں کی۔

غزل نمبر ۲۹

۱۔ جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

فرماتے ہیں کہ جب دوست سفر کے لئے تیار ہو گیا تو فراوانیٔ شوق سے ہر ذرہ اس کے خیر مقدم کیلئے دل عاشق کی طرح تڑپنے لگا، یا عشق کی حرارت سے ذرہ ذرہ دل عاشق کی طرح متحرک ہو گیا۔

۲۔ اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

اہلِ بینش۔ عارفانِ حق۔ حیرت کدہ۔ مقامِ تحیّر۔ شوخیٔ ناز۔ حسن کی شوخی، تجلیات۔ جوہرِ آئینہ۔ صیقل کی جلا جو بوقتِ انعکاس متحرک و سبزی مائل نظر آتی ہے۔

حیرت کدہ کو آئینہ اور تجلیات کو جوہرِ آئینہ سے استعارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عارفانِ الٰہی مقامِ حیرت میں انوارِ الٰہی اور تجلیاتِ باری سے اس عالم کی نمو کا مشاہدہ کرتے ہیں گویا جوہرِ آئینہ طوطیٔ بسمل بن جاتا ہے۔ اس لئے وہ جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل لکھتے ہیں۔

۳۔ یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

ایک عربدہ میدان۔ میدان کا پیمانہ عربدہ کو بنایا ہے۔ یعنی اتنا وسیع میدان جس میں جنگ ہو سکے۔ آس و یاس میں ہمیشہ لڑائی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے وسیع میدان کی ضرورت ہے۔

طلسم۔ دھوکہ کی ٹٹی، جادو کا گھر، مراد خواہشات، طلب، سوال، یاس و امید۔ دلِ سائل۔ سوال کرنیوالا دل۔

اس شعر کا مطلب سمجھنے سے پہلے صوفیاء کی بعض اصطلاحوں کو جاننا ضروری ہے۔ ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت مقاماتِ سلوک کے نام ہیں۔ ناسوت۔ یہی عالمِ رنگ و بو۔ اس مقام میں انسان کا خیال صرف موجودات کے ظاہر میں الجھا ہوا ہوتا ہے اور اس مقام میں امید و یاس بھی ہے اور

سوال و دعا بھی۔ جب سالک اس سے آگے بڑھتا ہے تو اس کی نظر حقیقت پر پڑتی ہے اور ناسوتی غفلت دور ہو جاتی ہے اور مقام رضا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مقام میں طلب سوال، امید و یاس سب باطل ہو جاتے ہیں۔ اب مطلب یہ ہوا کہ جب تک ہم پست ہمتی سے اس ابتدائی مقام میں پڑے رہیں۔ سوال و دعا و یاس و امید کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ اور اگر ہمت سے کام لیں اور آگے بڑھ کر پردۂ غفلت چاک کر دیں تو حقیقت ہم پر عیاں ہو گی اور طلسم ٹوٹ جائے گا۔

۴۔ نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

کہتا ہے کہ عشق و معرفت کے مضامین ایسے نہیں کہ دوسرے علوم کی طرح ان کو سمجھایا جا سکے کتنا ہی دل کھول کر لکھیں تشنگی دور نہیں ہو سکتی۔ وجدان و ذوق بیان میں نہیں آ سکتے۔

غزل نمبر ۳۰

۱۔ میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ مجھ جیسا بلانوش بزم مے سے تشنہ لب آئے کس قدر افسوس کا مقام ہے میں نے توبہ کی تھی مگر ساقی نے تو پلانے سے توبہ نہیں کی تھی۔ کیوں نہ اصرار کر کے پلا دی۔ توبہ کے بعد بھی شوق مے نوشی قابل دید ہے۔

۲۔ ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

مطلب یہ ہے کہ پہلے صرف دل ہی گھائل تھا اور جگر اچھا تھا مگر اب تیر دل سے آگے بڑھ کر جگر کو بھی چھید دیا ہے۔ یعنے عشق و محبت کی فراوانی کی وجہ اب جگر بھی متاثر ہو گیا ہے۔

۳۔ درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

درماندگی۔ بے چارگی، پریشانی۔ فرماتے ہیں کہ خاطر جمعی اور اطمینان کی حالت میں ہر ایک کو تدبیر سوجھتی ہے۔ عقل و تدبیر کا امتحان درماندگی حالت میں ہو سکتا ہے۔ اگر بحالت پریشانی تدبیر بن پڑے تو قابل تعریف ہے۔

غزل نمبر ۳۱

۱۔ گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا　　　بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مطلب یہ ہے کہ ہمارے گھر کی بربادی مقدر ہو چکی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ صرف رونے سے ویران ہوا ہے۔ اگر نہ روتے بھی تو ویران ہی رہتا۔ رونے سے بحر بنکر ویران ہو گیا۔ اگر نہ روتے بحر کی بجائے صحرا ہو جاتا۔ بہر حال ویران۔

۲۔ تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے　　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

دل کی تنگی اور دل کی پریشانی دو قریب المعنی لفظ ہیں۔ دونوں کا نتیجہ رنج و غم ہے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ ان کو ضدین بنا کر پیش کیا ہے پھر نتیجہ ہر دو کا ایک۔ اضداد سے ایک ہی کیفیت پیدا کرنا جادوگری نہیں تو کیا ہے۔ شعر حد درجہ سادہ اور اسی قدر دل نشین ہے۔

۳۔ بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے　　　کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

یک عمر: وقت کا پیمانہ، مطلب زیادہ مدت۔ ورع: زہد و تقویٰ۔ رضوان: جنت کا دربان۔ بار دینا: داخل ہونے کی اجازت دینا۔ کاش: حرف تمنا ہے۔

اس غزل کے پہلے دو شعروں کی طرح یہ شعر بھی انتہائی سادہ و دل نواز ہے۔ کاش کا لفظ لا کر استاد نے در یار اور اس کے دربان کا مرتبہ آسمانوں سے بلند کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصہ اگر عبادت کیجائے تو جنت میں داخلہ یقینی ہے۔ مگر در یار پر جبین سائی کرتے کرتے عمر گزر گئی لیکن دربان دوست کی بارگاہ میں جانیکی اجازت نہیں دیتا۔ اس دربان کی بجائے در یار پر رضوان ہوتا تو اتنی ریاضت کے بعد داخلہ کی اجازت دے دیتا۔

غزل نمبر ۳۲

۱۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب نے جگہ جگہ وحدت الوجود کے مسلک کو شاعرانہ دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ مطلب واضح ہے۔ البتہ "کیا ہوتا" ذو معنین ہے۔ ایک تو یہ کہ میرے نہ ہونے میں کیا ہرج تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ خود نتیجہ اخذ کر لیں کہنے کی بات نہیں۔ یعنی خدا ہوتا۔

۲۔ ہوا غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۔ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

مطلب یہ ہے کہ کسی عضو کا حس جاتا رہتا ہے تو اس کے کٹنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی جب سر بے حس ہو چکا ہے تو اس کا کٹنا ہی بھلا ہے اگر نہ کٹے تو بار زانو ہوگا۔ (فکر و غم کی صورتمیں انسان سر بزانو ہوتا ہے)

۳۔ ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے ۔ وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

فرماتے ہیں کہ غالب کو مرکر اگرچہ بہت عرصہ ہو گیا لیکن اس کی حکیمانہ باتیں اب تک یاد آتی ہیں۔ اس کا ہر ایک بات پر یہ کہنا کہ اگر ایسا ہوتا یعنی کوئی کام اپنے حسب منشاء ہو بھی جاتا تو نتیجہ کیا، حاصل کیا، فائدہ کیا۔ آخر فنا ہر چیز کیلئے ہے۔ کامیابی بھی چند روزہ اور ناکامی بھی چند روزہ پھر اس کے بعد فنا۔ اس لئے کوئی کام خواہ اپنے حسب مرام ہو خواہ مطلب کے خلاف ہو دونوں کا نتیجہ ایک ہے

غزل نمبر ۳۳

۱۔ ایک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا ۔ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

لالہ۔ ایک نہایت سرخ رنگ کا پھول جس پر سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ شاعری میں پھولوں کے منجملہ گل و لالہ وہ پھول کثرت سے مذکور ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہار کا یہ عالم ہے جدھر دیکھئے لالہ ہی لالہ کے سرخ پھول چراغوں کیطرح روشن و دلفریب نظر آتے ہیں اور جو بیٹا اس لالہ زار میں سے گذرتی ہے گویا ان چراغوں کا فتیلہ ہے لہذا باغ کی چپہ چپہ بھر زمین بھی بے کار نہیں ہے۔

۲۔ بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ۔ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

آشوب = طوفان، پریشانی۔ ایاغ = پیالہ۔ آگہی = عقل، سمجھ، علم۔

مطلب یہ ہے کہ بغیر بے خودی اور شرابِ عشقِ الٰہی کے اپنی ہستی اور کائنات کے وجود کی نفی کرنی ممکن نہیں۔ اپنی ہستی یا عالمِ امکان کا علم سالک کیلئے ایک آشوب اور ایک فتنہ ہے۔ تا وقتیکہ ان کو موہوم نہ سمجھے معرفتِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان بدیہیات کی نفی آسان کام نہیں اس کیلئے عشقِ الٰہی کی ضرورت ہے۔ جس قدر کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت سے مست ہوگا اسی قدر اسرارِ الٰہی اس پر منکشف ہونگے اور بجز ایک وجود کے دوسرا کوئی وجود اسکی نظر میں آئیگا۔ اب ہمارے حوصلہ کی پستی اور ظرف کی کوتاہی ہے

کہ شراب محبت تھوڑی سی مقدار میں ناپ ناپ کے پیتے ہیں اگر ہمت عالی ہوتی تو لبریز جام کے جام چڑھاتے اور بجز ذات باری تعالیٰ کسی کی خبر نہ ہوتی۔

۳۔ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا

کاروبار = حرکات، کبھی رونا کبھی ہنسنا کبھی چہکنا کبھی پھڑکنا وغیرہ۔

فرماتے ہیں کہ بلبل کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گل ہنس رہے ہیں جسطرح کہ اہل جنوں کے حرکات کو دیکھ کر عوام ہنسا کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ عشق بھی ایک قسم کا جنون ہے۔

۴۔ تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

تریاک = افیون۔ تریاکی = جس کو افیون کے نشہ کی لت ہو۔ افیون کے نشہ کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ اس کی گولیاں بنا کر کھاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سوکھے پان یا اور کوئی پتہ میں ملا کر چراغ پر پکاتے ہیں پھر اس کی گولیاں بنائی جاتی ہیں اور حقہ یا نئے پر رکھکر اس کا دھواں کھینچا جاتا ہے۔ یہ اتنی بری لت ہے کہ انسان مر جائے پر یہ نہ چھوٹے اس نشہ کا نام چنڈو یا چرس ہے۔

اب شعر کا یہ مطلب ہوا کہ میرا شوق سخن نیا نہیں ہے بلکہ ایک زمانہ سے اس نشہ کی چاٹ پڑی ہوئی ہے۔ چونکہ شاعر فکر سخن رات کے پرسکون اوقات میں کیا کرتے ہیں اس لئے شعر میں دودِ چراغ کی رعایت رکھی ہے اور پھر شاعری سے جو فطری اور گہرا لگاؤ لڑکپن سے ہے اس کو "تریاکیٔ قدیم" کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔

۵۔ سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بند = قید۔ فراغ = آزادی۔

فرماتے ہیں کہ ہم کوشش کر کے قید عشق سے رہائی پاتے ہیں مگر مجبوری یہ ہے کہ دل نچلا بیٹھنے نہیں دیتا اس کو عشق کا چسکا ہے۔ پھر کسی پر آ گیا۔ پھر گرفتار ہو گئے۔

۶۔ بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

فرماتے ہیں جبتک خون دل آنکھوں سے ٹپکتا رہا موج نگہ شاداب رہی اور جوں ہی خون خشک

ہوا آنکھیں برباد یا بیکار ہوگئیں۔ ٹھیک اسیطرح کہ جبتک میکدہ میں شراب رہی میخانہ آباد رہا۔ جہاں شراب ختم ہوئی اور اس کا پتہ نہ رہا۔ وہ غیر آباد و بیکار ہوگیا۔ حاصل یہ کہ آنکھوں کی رونق خون دل سی ہی جیسے کہ میکدہ کی مئے سے۔

۷۔ باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاط دل ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

بساط: سرمایہ۔ باغ شگفتہ: حُسن معشوق۔ خمکدہ۔ منبعٔ نشاط و فرحت۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے دل کا سرمایۂ سرور و نشاط حُسن معشوق ہی۔ ابر بہار موجب فرحت و انبساط دماغ نہیں۔ اس شعر میں دل اور دماغ دو علیحدہ لفظ ہیں مگر منشاء ایک ہی مطلب صرف اس قدر ہے کہ موجب نشاط حسن یار ہے نہ کہ موسم بہار کی آرایش گل و بلبل وغیرہ۔ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر حاوی ہے۔

غزل نمبر ۳۴

۱۔ وہ میری چینِ جبین سی غم پنہاں سمجھا راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنوان سمجھا

مطلب یہ ہیکہ دوست نے ہماری صورت دیکھتے ہی غم دل کو سمجھ گیا جس طرح عنوان کی بے ربطی سے مضمون خط کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ گویا میری پیشانی لفافہ تھی اور پیشانی کے شکن غم دل کی تحریر

۲۔ یک الِف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یک الف = ایک لکیر۔ صیقل آئینہ = صفائی قلب۔ گریبان چاک کرنا = حالت عشق و جنون۔ گریبان سمجھا = شعور پیدا ہوا

اپنے ایک مکتوب میں جو ماسٹر پیارے لال صاحب کا موسومہ ہی حضرت مرزا صاحب نے اس شعر کا مطلب یوں تحریر فرمایا ہی۔ پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینہ سے ہی ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہو تو اب اس مفہوم کو سمجھئے۔ مصرعہ۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا۔ یعنی ابتداء سن تمیز سے مشق جنون ہے اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا بس وہی ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے۔ چاک کی صورت

الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے" ۱۲ - غالب (ماخوذ از اردوئے معلیٰ)

۳- شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

شرح: کسی بات کا کھول کر بیان کرنا۔ گرفتاری خاطر: پریشانی خاطر۔ شرح و تنگ، گرفتاری و زنداں کی لفظی رعایتیں رکھی گئی ہیں۔ دل جس قدر تنگ ہوگا اسی قدر پریشانی اور رنج لاحق ہوگا اور اس کا انشراح موجب فرحت و مسرت۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ پریشانی خاطر کے اسباب کی تفصیل مت پوچھ وہ تو ایک بڑی داستان ہے تیرا مقصد تو صرف رنج کی مقدار معلوم کرنا ہے۔ وہ ہم بتلائے دیتے ہیں۔ میرا دل تنگ ہوتے ہوتے اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ میں اس کو زنداں سمجھ رہا ہوں۔ پس دل کی تنگی سے رنج و غم کی مقدار کا اندازہ کر لے۔

۴- بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام — رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

رشک و رقابت بھی غالب کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ اس شعر سے بھی رقابت ٹپک رہی ہے فرماتے ہیں کہ دوست جب سرگرم خرام ہوتا ہے اس کے رُخ پر عرق کے قطرے آجاتے ہیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قطرہ ایک دیدۂ حیراں ہے جو اس کے جمال میں محو ہے اور مجھ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میرے سوا اس کو کوئی دیکھے خواہ وہ عرق کے قطرہ ہی کیوں نہ ہوں۔ رشک کا خاصہ بدگمانی ہے قطرہ ہائے عرق سے بھی بدگمانی کا اظہار کرتا ہے۔

۵- عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا — نبضِ خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

قاعدہ ہے کہ اشیاء کے خواص اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہم بعض نتائج اخذ کر لیتے ہیں مثلاً خس کو دیکھ کر یہ اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ آگ اس کو جلا دے گی۔ پتھر یا لوہے کی متعلق یہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ ان میں جلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے بدخوئی خاکساروں کیساتھ ظلم کمزوروں پر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اپنے عجز و خاکساری سے اس بات کا پتہ چلا لیا کہ معشوق بدخو ہے اور تنکے پر ہاتھ رکھتے ہی شعلہ سوزاں کی تپش کا اندازہ کر لیا

۶- سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی — ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

سائے اور شبستان میں تاریکی وجہ شبہ ہے۔ فرماتے ہیں سفرِ عشق تھکا دینے والا ہے تھکن کا نتیجہ ضعف اور ضعف کا خاصہ راحت طلبی اس لئے قدم قدم پر اپنے سائے کو شبستان سمجھ کر ستاتا رہا۔

۷۔ تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا؟

یعنے پیکانِ قضا سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ یہ دل کا بھولا پن تھا کہ مژۂ یار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا یہ نہ سمجھا کہ پیکانِ قضا اور مژۂ یار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دوسرا مصرعہ استفہامیہ ہے اور دل کی سادگی پر طنز۔ یہ شعر بھی مژۂ یار کی طرح دل میں اثر جاتا ہے۔

۸۔ دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ — غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ معشوق سخت بے وفا ہے تو نے اس کو وفادار سمجھ کر اپنا دل اس کے حوالے کر دیا تیرا یہ عمل بالکل غلط تھا کہ تو نے ایک بے وفا کو باوفا سمجھا۔ معشوق کے القاب میں سے "کافر" بھی ایک لقب ہے اس لئے اس کی ضد مسلمان لائی گئی ہے۔ مطلب وہی ہے کہ تو نے غلطی کی کہ معشوق کو باوفا سمجھا۔

غزل نمبر ۳۵

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

جگر تشنۂ فریاد = دل کی صفت ہے۔ یعنے فریاد کا تشنہ۔ جگر تشنہ و تشنہ دونوں کے معنی ایک ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دل پھر فریاد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے میں دیدۂ تر سے رجوع کر رہا ہوں تاکہ اس کی فریاد کی تشنگی دور کرے۔ اس شعر میں تشنگی کی رعایت سے دیدۂ تر لایا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس خیال کو یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ "دل رونا چاہتا تھا اور میں رو رہا ہوں"

۲۔ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دم لینا = ٹھیرنا۔ قیامت = طوفانِ گریہ

"دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قیامت کے

دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعراردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔ (از یادگارِ غالب)

۳۔ سادگی ہائے تمنا یعنی پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

سادگی۔ نادانی۔ نیرنگ نظر۔ معشوق جس کا جلوہ ہماری نظر کو مسحور کرتا ہے۔

سادگی اور نیرنگ نظر دو متقابل کے لفظ اور پھر اسلوب بیان اس نو لفظی شعر کو طلسم ہوشربا بنا رہے ہیں مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس سے پہلے جتنی بار ہم نے معشوق کی تمنا کی تو کیا ملا اور اب جو پھر یاد کر رہے ہیں کیا حاصل ہوگا۔ اتنے تلخ تجربوں کے بعد اُس بے وفا کی آرزو سادہ دلی نہیں تو پھر کیا ہے؟

۴۔ عذر واماندگی اے حسرتِ دل نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

حسرت دل کا تقاضہ تو گریہ و نالہ ہی ہے اور گریہ و نالہ کیلئے خون کی ضرورت۔ مگر جگر میں ایک قطرہ خوں بھی نہیں اس لئے حسرت دل سے معذرت خواہی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میں تو نالہ کرنے کو ہی تھا کہ یاد آ گیا جگر میں ایک خون کا قطرہ بھی باقی نہیں۔ مجبوری ہے۔

۵۔ زندگی یوں ہی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

زندگی گذرنے کی لفظی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں راہ گذر لایا ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ ہماری زندگی بری بھلی کسی طرح بیت ہی جاتی تیرے رہگذر کی یاد سے کرب و بے چینی میں کچھ اضافہ ہو گیا اب تیرے کوچہ کی خاک چھان رہے ہیں۔

۶۔ کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

فرماتے ہیں کہ خلد میں لے جا کر ہم کو جبراً محبوس کر دیا گیا ہے۔ جب ہم کو تیرے گھر کی یاد آئیگی تو تڑپ کر نکلنا چاہیں گے۔ مگر پہرہ دار رضوان نکلنے نہ دیگا۔ دھینگا مشتی مار کٹائی تک نوبت پہنچ جائیگی۔ یا یہ کہ رضوان سے اس بات پر لڑائی ہوگی کہ وہ جنت کی تعریف کریگا اور ہم تیرے

گھر کو جنت پر ترجیح دیں گے۔

۷۔ آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

جرأت کا تعلق عام طور پر جگر سے ہی سمجھا جاتا ہے چنانچہ "جگرداری" سے جرأت کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ جو جرأتِ فریاد کی جگر میں ہے وہ دل میں نہیں اس لئے دل کی کم ہمتی سے تنگ آ کر ہم جگر کو یاد کرتے ہیں۔ یا یہ کہ جب تک جگر میں خون تھا ہم میں جرأتِ فریاد تھی اب جگر کا خون ختم ہو چکا فریاد کی طاقت نہ رہی مگر دل ہے کہ برابر فریاد کا تقاضہ کئے جا رہا ہے اس لئے بار بار جگر یاد آجاتا ہے کاش اس میں خون ہوتا اور تقاضائے دل پورا کرتا۔

۸۔ پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے تیرے کوچہ کا خیال آیا تھا۔ اور ہم تیرے دیدار کے طالب بھی تھے چنانچہ تیرے کوچہ میں پہنچ گئے۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو دل کھو چکے تھے اب پھر تیرا کوچہ یاد آرہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کھویا ہوا دل یاد آگیا ہے اب اسکی تلاش کیلئے جائیں گے۔

۹۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

"اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہیں ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔" (از یادگارِ غالب)

۱۰۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بظاہر بہت صاف شعر ہے لیکن لفظ "کہ" جس انداز سے رکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دو حرفی چھوٹے سے لفظ میں جس کے مستقل کوئی معنی نہیں شاعر نے جادو بھر دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ لڑکپن میں میں نے بحالتِ جذب بے خودی مجنوں پر پتھر اٹھایا تھا کہ دفعتاً بے خودی جاتی رہی اور مجھے اس غریب کے سر کا خیال آگیا۔ دفعتاً چونکنے میں نکتہ یہ ہے کہ پتھر اٹھانے تک اپنے آپ سے

بے خبر تھا اور حالت بیخودی طاری تھی۔ بے خودی تو عاشق کی صفت ٹھہری پھر نتیجہ یہ نکلا کہ مجنوں سن شعور کو پہنچ کر عاشق ہوا تھا اور ہم پیدائشی عاشق ہیں۔

غزل نمبر ۳۶

۱۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عنان گیر بھی تھا

عنان گیر۔ روکنے والا ـــــ اس شعر کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ ہر مصرعہ ایک سوال کے طور پر پڑھا جائے۔ اس صورت میں معشوق سے وجہ تاخیر دریافت کیجا رہی ہے اور رقیب پر روکنے کا شبہ کیا جا رہا ہے، دوسرے یہ کہ بلا استفہام اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ عاشق یقین کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ تاخیر کا باعث رقیب ہوا ہے۔

۲۔ تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شائبہ۔ لگاؤ۔ خوبی تقدیر۔ طنز ہے، مراد شومی قسمت

فرماتے ہیں کہ میری تباہی کے ذمہ دار تنہا آپ ہی نہیں میری شومی قسمت کو بھی اسمیں دخل ہے پھر آپ کیا کریں گے

۳۔ تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

فتراک۔ شکار بند جو ڈور زین کے بازو لگا ہوتا ہے۔ نخچیر۔ شکار

مدت کے بعد دوست کی نظر آپ پر پڑی ہے اس کو غیر ملتفت دیکھ کر پہلی آشنائی یاد دلائی جا رہی ہے

۴۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

قید، وحشی، زلف، زنجیر لفظی رعایتیں موجود ہیں۔

فرماتے ہیں کہ ترے عاشق کو قید میں بھی تیرے زلف کی یاد ہے گویا وہ زلف کی زنجیر سے جکڑا ہوا ہے پھر یہ جو دوسری زنجیر ڈالی گئی وہ زائد اور غیر ضروری ہے۔ زائد اور فضول چیز گرانبار ہی ہوتی ہے اس شعر میں لوہے کی ثقالت موجب گرانباری نہیں بتلائی گئی۔

۵۔ بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

بجلی کوندنا۔ معشوق کا تھوڑی دیر کے لئے سامنے آنا۔ لب تشنہ۔ تشنہ، آرزومند لب کا لفظ تقریر کی رعایت سے

لایا گیا ہے جو زائد ہے۔

"یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اس طرح ادا کیا ہے: بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا" (از یادگار غالب)

فرماتے ہیں کہ اے دوست تھوڑی دیر کے لئے اپنا جلوہ دکھانے سے آنکھوں میں روشنی تو آ گئی۔ مگر اس سے ہماری دلی آرزو پوری نہ ہو سکی البتہ کچھ عرصہ ٹھیرتے اور بات کرتے تو مراد بر آتی۔ بجلی کی طرح چمک کر غائب ہو گئے ہماری تشنگی کیسے دور ہوتی؟۔

۶۔ یوسفؑ اسکو کہوں۔ اور کچھ نہ کہے۔ خیر ہوئی ۔۔۔ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

تعزیر = سزا ـــــ فرماتے ہیں کہ کہاں حسن معشوق اور کہاں جمال یوسفؑ۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ حسن کا معیاری پیمانہ بجز یوسفؑ کوئی اور نہیں اس لئے ہم نے بھول سے اس کو یوسفؑ کہدیا۔ بڑی خیر گذری کہ معشوق نے اُس کا بُرا نہ مانا۔ اگر اس توہین پر وہ ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر بیٹھتا تو میں لائق تعزیر تھا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شعر میں حضرت یوسفؑ کی غلامی کا بھی اشارہ ہو۔

۷۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ۔۔۔ نالہ کرتا تھا دلے طالب تاثیر بھی تھا

رقیب کا نالہ کرنا اور طالب تاثیر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ معشوق اس پر مہربان نہیں تھا ہمارے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

۸۔ پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام ۔۔۔ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

جوانمیر = مُردن مصدر سے صیغہ امر میر لیا اور اس پر جوان ایک اسم لگا کر اسم فاعل ترکیبی بنا لیا۔ اب معنی ہوئے بحالت جوانی مرنے والا۔ جواں مرگ۔ آشفتہ سر = عاشق۔ اس شعر میں فرہاد پر چوٹ کی ہے۔ پہلے مصرعہ میں تو اُس کے پیشہ (مزدوری) کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور پھر روتے کی آنکھیں یہ کہہ کر پونچھ رہے ہیں کہ پیشہ میں کوئی عیب نہیں۔ غریب کو برا مت بولو آخر اس کا شمار بھی تو عاشقوں میں ہی ہے۔

مطلب شاعر کا یہ ہے کہ کہاں وہ پتھر پھوڑنے والا فرہاد اور کہاں ہم جب پانچ انگلیاں اللہ نے برابر نہیں بنائی ہیں تو سب عاشق ایک مرتبہ کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ فرہاد کی تنقیص اور اپنی برتری غیر محسوس

طریقے سے بیان کی ہے۔

۹۔ ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی　　آخر اس شوخ کی ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

فرماتے ہیں۔ کہ ہم مرنے کیلئے کھڑے تھے مگر اس آرزو کے ساتھ کہ وہ پاس آکر خنجر سے ہلاک کرے لیکن یہ مرتبہ شہادت ہمارے مقدر میں کہاں؟ جب مرنا ہی ٹھیرا تو شہادت کیا اور مردار موت کیا دونوں کا نتیجہ موت ہے۔ اس لئے ہم نے اس شوخ سے کہا کہ خنجر نہ سہی دور سے تیر ہی سہی۔ کیا تیری ترکش میں کوئی تیر بھی نہیں ہے؟ دور ہی سے ایک نگاہِ غلط انداز سے ہمارا کام تمام کر۔

۱۰۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

فرشتے۔ کراماً کاتبین۔ یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کیلئے کسی کی شہادت ہونی ضروری ہے صرف فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں ہے۔" (یادگارِ غالب)

۱۱۔ ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ریختہ = اُردو زبان کی نظم یا شاعری۔ میرؔ = میر تقی میرؔ۔

غالبؔ نے کسی ریختہ گو کو اپنے ہم پلہ نہیں سمجھا صرف میرؔ کو استاد مانا ہے۔

غزل نمبر ۳۷

۱۔ لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا　　زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

فرماتے ہیں کہ تشنگی کی تاب نہ لاکر جن لوگوں نے جان دیدی ہے میری حالت ان کے لبِ خشک کی سی ہے میں نہایت خاموشی سے اس تشنگی کو برداشت کر رہا ہوں اور زندہ ہوں۔ اُن کے ظرف اور میرے ظرف میں بس اتنا ہی تفاوت ہے اور پھر کہتا ہوں کہ میں عاشقوں کا سردار ہوں۔ جتنے عشاق ہیں سب اسی آستانہ پر اپنا سر جھکاتے ہیں۔

۲۔ ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی　　میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

کہتا ہے کہ میں سراپا مایوسی اور بدگمانی کا پتلا بنا ہوا ہوں۔ سراب وفا کے ہزاروں دھوکے کھائے ہیں۔ دوسرے عشاق نے بھی میدانِ وفا میں دھوکے کھائے ہیں۔ لیکن میری اور ان کی فریب خوردگی میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ جسم ہیں اور میں دل۔

غزل نمبر ۳۸

۱۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ معشوق فطرۃً بے وفا اور ستمگر ہے۔ اس سے دوستی کی امید ہی نہیں۔ نہ ہمارا دوست نہ غیر کا۔ وہ سب پر ظلم کرتا ہے۔ مگر اس فرق کیساتھ کہ مظالم کا اصل نشانہ تو میں ہوں۔ سب ظلم مجھ پر ہی توڑے جاتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار کوئی ظلم بچ رہتا ہے تو وہ اوروں کے حصہ میں آتا ہے۔

۲۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

مہِ نخشب۔ یہ ایک تلمیح ہے۔ نخشب ترکستان کا ایک شہر ہے۔ حکیم ابن عطا معروف بہ مقنع جو پہلے زمانہ کا بڑا سائنسدان تھا اس شہر کا باشندہ تھا۔ اس نے بعض عناصر کو کیمیائی طور پر مرکب کر کے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا جو مسلسل دو ماہ تک روشن رہتا اور پھر ایک کنوئیں میں غروب ہو جاتا اور پھر اسی کنوئیں سے طلوع ہوتا۔ کہتے ہیں کہ اس کی روشنی اطراف میں ۲ میل تک ہوتی تھی۔ چونکہ حکیم ابن عطا کی یہ صنعت مکمل نہ تھی کچھ عرصہ بعد یہ چاند خود بخود فنا ہو گیا۔ شاعری میں مہِ نخشب و چاہ نخشب کی تلمیح اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے + دستِ قضا۔ قدرت کا ہاتھ

مطلب ہے کہ دستِ قضا نے ہمارے معشوق پر تنویر کو سامنے رکھکر اس کی نقل آمادنی شروع کی اور اس کا نام خورشید رکھا۔ ابھی جمال محبوب کی پوری تنویر خورشید میں نہیں آئی تھی کہ دستِ قضا نے اس کام کو ادھورا چھوڑ دیا۔ جس طرح حکیم ابن عطا نے مہِ نخشب کو ادھورا چھوڑا تھا۔

۳۔ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

توفیق = تائید ایزدی ـــ " بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جسقدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا " (از یادگار غالب)

۴۔ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

مطلب یہ ہے کہ فتنۂ قیامت کی مولانا کیاں سن کر اس پر یقین نہ آتا تھا اور خیال کرتے تھے کہ یہ بھی ایک افسانہ ہے۔ لیکن جب یار کے قد کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ اس نے صدہا فتنے برپا کر رکھے ہیں صدہا بسمل اور ہزاروں وارفتہ ہو رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے۔ شور و فغاں سے فضا گونج رہی ہے۔ تب قیامت اور اس کی پریشانیوں پر اعتقاد آیا کہ واقعی ایسا ہونا ممکن ہے۔

۵۔ میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ دوست کی آزردگی موجب رنج و ملال ہے نہ کہ باعثِ خوشی۔ یہ میری ناتجربہ کاری اور بے وقوفی ہے کہ میں یار کی آزردگی سے خوش ہوں اسکی وجہہ یہ ہے کہ یہ سبق محبت میں نے صرف ایک مرتبہ پڑھا ہے۔ بار بار دہرا کر اس کو ازبر نہیں کیا۔ اگر سبق محبت مکرر سکرر ہو کر پختہ ہو جاتا تو ایسی غلطی نہ ہوتی۔

۶۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریا معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلو تک نہیں بھیگا۔ تذکرۂ آبحیات میں لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی۔ یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جیسا مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سنکر اس کی تعریف کرتے وقت کہا تھا اس میں مرزا کا کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے ...." (از یادگار غالب)

۷۔ جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل　　آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

تحصیل ۔ مالگزاری، آمدنی + سمندر ۔ ایک پرند جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آتشکدہ میں پیدا ہوتا اور آگ ہی میں نشو نما پاتا ہے۔ جسطرح مچھلی پانی میں۔ فرہنگ آصفیہ میں اس کو گرگٹ نما چوپایہ بیان کیا گیا ہے + تحصیل اور جاگیر میں لفظی مناسبت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں داغ جگر سے اس وقت سے استفادہ کر رہا ہوں جبکہ دنیا میں آتشکدہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ بعد کی چیز ہے۔ عرصۂ دراز بعد آتشکدہ تیار ہوا اور سمندر نے جاگیر لکھوالی۔

غزل نمبر ۳۹

۱۔ شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا   رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

ناموس = حرم سرائے + کسوت = لباس + خارکسوت = بے چین کرنیوالی چیز۔

فرماتے ہیں کہ رات جبکہ معشوق حرم سرائے کی خلوت میں رونق افروز ہوا۔ اس کے جمال کے سامنے فانوس کی روشنی ماند پڑگئی اور فانوس رشک و حسد کی آگ سے بے چین ہوگیا۔ گویا شمع کی بتی اس کے لئے کانٹے کا کام کر رہی تھی۔

۲۔ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا   کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

مشہد = جائے شہادت، قتل گاہ۔

فرماتے ہیں کہ عاشق کی قتل گاہ سے کوسوں تک صرف درخت حنا اگ رہے ہیں۔ کوئی دوسرا درخت قتل گاہ کی زمین سے نہیں اُگا۔ اس سے شہیدِ عشق کی آرزوئے پابوسی کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ روپ بدل کر معشوق کے قدموں سے چمٹا رہنا چاہتا ہے۔

۳۔ حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو   دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

الفت = دل کا دل سے ملنا، محبت + شکستِ آرزو = آرزو کا خون ہونا۔ دلوں کے ملنے کو لبِ افسوس کے ملنے سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل سے دل ملتا ہے تو اس کا نتیجہ بجز افسوس اور شکستِ آرزو کے کچھ نہیں۔

۴۔ کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں   جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

کیموس = غذا کا معدہ کے بعد جگر میں دوسری مرتبہ پکنا، طبخ دوم + اس کے بعد ہی کیموس خون ہو کر جگر سے دل میں منتقل ہو جاتی

فرماتے ہیں کہ بیماریٔ غم میں ایک اطمینان یہ تو حاصل ہے کہ کسی دوسری غذا کی ضرورت نہیں تیار خون کھانے کے لئے مل جاتا ہے۔ عمل کیموس کے احسان سے بچ جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۴۰

۱۔ آئنہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اپنا منہ لے کے رہ جانا = شرمندہ ہونا

مطلب یہ ہیکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "تمہاری طرح ہم تو اپنا دل کسی کو نہیں دینگے" مگر جب آئینہ دیکھا یہ دعویٰ باطل ہوگیا۔ اور اپنے جمال پر آپ فریفتہ ہوگئے۔

۲۔ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارئے اسکی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

معشوق کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں جو کچھ میں نے کہلوایا وہ آکر آپ سے کہا۔ اس میں قاصد کا کیا قصور۔ قصور میرا ہے۔ گردن مارنی ہو تو میری گردن مارئے مطلب یہ ہیکہ دوست کے ہاتھ سے قتل ہونیکا حق تو مجھ کو ہے۔ یہ سعادت قاصد کو کیوں نصیب ہو۔ کس انداز سے رشک اور شوق شہادت کو چھپایا ہے؟

غزل نمبر ۱۴۱

۱۔ عرض نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیاز ۔ آرزو، خواہش، اظہار محبت۔

فرماتے ہیں کہ پہلے دل میں توان تھا۔ زندہ دلی تھی۔ عشق و محبت کے ولولے تھے یعنی جوشِ جوانی تھا۔ ہمکو اپنی اس حالت پر ناز تھا اور دل کھول کر اظہارِ عشق و محبت کرتے تھے۔ اب ضعیفی میں وہ تاب و توان نہیں۔ دل میں وہ جوش و خروش نہیں دل افسردہ ہوگیا اس لئے اظہارِ آرزوئے محبت کے قابل نہیں رہا۔

۲۔ جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

درخور ۔ قابل، لایق + حسرت ۔ پشیمانی + داغ ۔ رنج

فرماتے ہیں کہ مجھکو اپنی ہستی کی وجہہ جو پشیمانی اور ندامت حاصل ہوئی ہے وہ داغ لئے جارہا ہوں یعنی وجود میں آتے ہی داغدار ہوگیا۔ اور پھر جو چیز داغدار ہوتی ہے محفل میں رہنے کے قابل نہیں جسطرح بجھی ہوئی شمع بوجہہ داغدار ہونیکے محفل سے ہٹا دی جاتی میں بھی یہاں سے نکال دیا جارہا ہوں۔

۳۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

شایان ۔ لایق، قابل۔

یعنی معشوق کی رائے میں میں اس قابل نہیں ہوں کہ وہ مجھے قتل کرے یا وہ مغرور مجھ نحیف و نیم جان کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اس لئے مرنے کی اب دوسری ہی تدبیر کرنی ہوگی

۴۔ بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

آئینہ ۔ دل ___ فرماتے ہیں کہ دل صاف ہو کر مثل آئینہ ہو گیا ہے اور اس کے دروازے شش جہت پر کھل گئے ہیں۔ گویا دل ایک آنکھ ہے جو شش جہت کو بیک وقت دیکھ سکتی ہے۔ تعینات کے دھوکے میں جبتک ہے موجودات میں ناقص و کامل کا امتیاز رہا۔ اب تعینات کے پردے اٹھ گئے ہیں۔ یہ امتیاز ختم ہو گیا ہر چیز کامل ہی کامل نظر آتی ہے۔

۵۔ وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

وا کرنا ۔ کھولنا ___ فرماتے ہیں کہ عشق نے حسن مطلق کا نقاب کھول دیا ہے یعنی معرفت الٰہی ہمکو حاصل ہو چکی ہے۔ ذرہ ذرہ میں جمال محبوب نظر آسکتا ہے بشرطیکہ نگاہ کام کرے اور تجلیات حسن سے خیرہ نہ ہو جائے

۶۔ گو میں رہا رہین ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

فرماتے ہیں کہ اگرچہ زمانہ نے مجھ پر صدہا ستم ڈھائے اور تمام عمر میں پریشان حال رہا لیکن اے دوست (خدا) ان پریشانیوں میں بھی میں دم بھر تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔ یعنی ہمیشہ تیری یاد میرے دل میں رہی۔

۷۔ دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں — حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

دل کو مزرعہ فرض کیا ہے جسمیں جنس وفا بوئی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس مزرعہ میں صدہا مرتبہ جنس وفا بوئی، خون دل سے اس کی آبیاری کی۔ مگر کسی وقت بھی کچھ حاصل کشت ہاتھ نہ آیا اور حاصل کی صرف آرزو ہی آرزو رہی۔ پھر کوئی دہقان ایسا بیوقوف ہے جو اسی جنس کی کاشت کا ارادہ کرے۔ اسی لئے ہمارے دل سے کشت وفا کی آرزو مٹ گئی ہے۔

۸۔ بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

فرماتے ہیں کہ اے اسد میں عشق کے ظلم اور اس کی ایذا رسانی سے نہیں ڈرتا لیکن مجبوری یہ ہے

کہ پہلا سا توانا دل باقی نہیں رہا جو عشق کی سختیوں کو برداشت کر سکے۔

غزل نمبر ۴۲

۱۔ رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اس شعر میں رشک اور عقل کی خصوصیات بیان کیگئی ہیں۔ یعنی دوست جب کسی غیر سے ہمکلام یا اسطرف ملتفت ہوتا ہے تو بوجہہ تقاضائے رشک ہم سمجھتے ہیں کہ رقیب سے اس کو خلوص ہے اور جب سوچتے اور غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھہ میں آجاتی ہے کہ وہ تو طبعاً بے وفا و بے مہر ہے۔ اس میں وفا اور اخلاص کہاں سے آئے۔ جس طرح ہم سے بیوفائی کرتا ہے غیر کو بھی ضرور دھوکہ دیتا ہو گا۔

۲۔ ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

نیرنگ = طلسم، جادو + میخانہ = استعارہ ہے عالم امکان سے + چشمک = اشارہ + ساغر = پیالہ جو گردش میں رہتا ہے یہاں مراد صرف گردش ہے۔

فرماتے ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک ایک ساغر ہے جو ساقی کے اشاروں پر گردش کر رہا ہے۔ ساغر کی حرکت اسکی اختیاری نہیں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی خیال کو ایک مثال کے ذریعہ واضح فرماتے ہیں کہ مجنوں کی گردش لیلیٰ کے اشاروں کی آشنا ہے مجنوں کا اختیاری فعل نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو موجود ہے آفتاب سے لیکر ذرہ تک عشق الٰہی سے سرشار ہے۔ ان کے حرکات تغیرات، انقلابات، ہست و نیست کا سبب وہی ایک ذاتِ احدیت ہے۔

۳۔ شوق ہے سامان طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

سامان طراز = سبب + اربابِ عجز = عشاق اہلِ دل + صحرا دستگاہ = جس میں صحرا کی سی وسعت و قدرت ہو + دریا آشنا = دریا دوست، مثل دریا۔ شوق = عشق

فرماتے ہیں کہ ارباب عجز یعنی فقرائے اہلِ دل کو عشق صاحب فخر و صاحب عزت بنا دیتا ہے عشق کے وسیلے سے وہ دریائے کبریائی میں محو ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے فخر و ناز کا کیا کہنا۔ دوسرا مصرعہ تمثیلاً پیش کیا گیا یعنی ذرہ جبتک اپنا علحدہ وجود باقی رکھے ناچیز و بے مقدار ہے۔ اور جونہی صحرا میں شامل ہو گیا

صحرا وسعت وصحرا دستگاہ بن گیا۔ اسی طرح قطرہ ایک حقیر بوند پانی کی ہے لیکن یہی قطرہ جب دریا میں گرجائے تو اس کی بڑائی کی کوئی حد نہیں۔

۴۔ شکوہ سنج رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے	میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فرماتے ہیں کہ اے دوست عشق و محبت کے تعلق سے ہمیں ایک دوسرے کا گلہ نہ کرنا چاہیئے یعنی آپ یہ نہ فرمائیں کہ تو فلاں پر عاشق ہے اور میں یہ نہ کہوں آپ کسی اور پر فریفتہ ہیں۔ اصلی کہ ہم دونوں ایک ہی حسن کے دل دادہ ہیں آپ بار بار جس حسن کو آئینہ میں ملاحظہ فرماتے ہیں میں اسی کو سر بزانو ہو کر تصور میں دیکھتا ہوں۔ آئینہ زانو جبیں کو کہتے ہیں یہاں زانو سے شاعر کی مراد آئینہ زانو ہی ہے۔ اس لئے کہ سوچ و فکر کے وقت سر جبیں پر ہی رکھا جاتا ہے نہ کہ زانو پر۔

۵۔ میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے	عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا ۔ یعنی دونوں میں جنگ جاری ہے۔

مطلب یہ کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ امن و عافیت سے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاؤں مگر دلِ وحشی میرا کہا نہیں مانتا وہ مصائب اور آوارگی کو پسند کرتا ہے بس دونوں میں یہ جھگڑا ہے۔

۶۔ کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد	سنگ سے سر مار کر ہوئے نہ پیدا آشنا

تمثال ۔ تصویر + نقاش ۔ مراد بت تراش + آشنا ۔ عاشق

فرماتے ہیں کہ کوہکن محض ایک نقاش تھا جو شیریں کی تصویریں پتھر پر اتارا کرتا تھا عشق سے اس کو کیا واسطہ؟ کیا پتھر پر سر مارنے سے کوئی عاشق بن سکتا ہے۔ بلا وجہ اس کا نام ایک عاشق کی حیثیت سے مشہور ہو گیا ہے۔ اصل میں عاشق تو ہم ہیں۔

غزل نمبر ۳۴

۱۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا	بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

پری وش ۔ پری چہرہ ۔ حسین + اس شعر میں معشوق کے حسن سے زیادہ اپنی جادو بیانی کی تاثیر مذکور ہے مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس شعر کی شرح اسطرح فرمائی ہے:۔

کہتا ہےکہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشیں تھا وہ بھی سن کر میرا رقیب بن گیا۔ اس واسطے کہ اول تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے۔ پہلے مصرعہ کا دوسرا رکن یعنی "اور پھر بیان اپنا" شعر کی جان ہے جس کی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی"

۲۔ مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحان اپنا

یعنی بزمِ غیر میں معشوق شراب زیادہ نہیں پیتا۔ ہوش و حواس درست رہتے ہیں۔ ہنستا بولتا رہتا ہے۔ ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ آج ہماری بزم میں آئے تو یکایک انکو اپنی مے نوشی کے امتحان کی سوجھی۔ ساغر پر ساغر چڑھانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نشہ میں چور، مست اور بے خود ہو گئے اب ہم کس سے بات کریں، اظہارِ تمنا کس طرح کی جائے، لبِ شیریں کی حلاوت کیسے نصیب ہو؟ غرض یہ کہ انکی آمد سے جتنی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کی تھیں سب خاک میں مل گئیں۔

۳۔ منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ہیں عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

منظر = جھروکہ + روحانی جغرافیہ کے محققین نے جو مقامات دریافت کئے ہیں۔ ان میں سب سے بلند مقام کا نام عرش ہے۔ شاعر کہتا ہےکہ شوقِ تحقیق یعنی عشق نے منازل طے کرکے یہاں تک تو پہنچا دیا اگر اس سے بھی کوئی اعلیٰ مقام دریافت ہو جائے تو عرش سے اٹھ کر وہاں ایک مسکن بنا لیں گے۔ عرش پر پہنچکر بھی شوقِ ارتقا مفقود نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہےکہ فنا فی اللہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچگیا ہوں پھر بھی شوق باقی ہے۔ اسی خیال کو دوسری جگہ یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

یعنی بال بال سے حسن کو دیکھ رہا ہوں پھر بھی تشنگیٔ دید باقی ہے۔

۴۔ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

بارے = اتفاقاً + یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان۔ ہمارا جان پہچان نکلا اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہےکہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہینگے اور یہ ظاہر

کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے" (از یادگار غالب)

۵۔ درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلادوں　　انگلیاں فگار اپنی خامہ خون چکاں اپنا

فرماتے ہیں۔ درد دل لکھتے لکھتے انگلیاں زخمی اور قلم خون چکاں ہو گیا۔ اس پر بھی غم کی داستان ختم نہیں ہوئی۔ آخر کب تک لکھتا رہوں۔ مناسب تو یہی ہے کہ اسی حالت میں جا کر دوست کو اپنی زخمی انگلیاں اور خون آلود قلم دکھلا دوں۔ اس حالت کو دیکھ کر ممکن ہے کہ وہ ہمارے درد دل کو سمجھ سکے۔

۶۔ گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا　　ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

یعنی میں آپ کے آستان پر اس کثرت سے سجدے کرتا ہوں کہ میرے سجدوں سے شرما کر پتھر خود ہی فنا ہو جاتا۔ آپ نے فضول اس پتھر کو بدلا۔ آستان یار پر اپنا شوق جبین سائی ظاہر فرماتے ہیں کہ پتھر تک گھس گیا ہے۔

۷۔ تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو　　دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

غمازی : چغلی ۔ فرماتے ہیں کہ اس خوف سے کہ رقیب کہیں ہمارے شکوے شکایت کی معشوق سے چغلی نہ لگائے ہم نے معشوق کی شکایت میں اس کو بھی شریک کر لیا ہے اب اسکو منہ کہاں کہ وہ ہماری شکایت کرے

۸۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

شاعری میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آسمان صرف اہل ہنر و صاحب کمال کا دشمن ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ جس کا آسمان دشمن ہوا یقیناً وہ صاحب کمال ہے پس نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کے جیسا دانا اور اہل ہنر دنیا میں کوئی نہیں۔ اپنے صاحب کمال ہونے کو کس خاکسارانہ انداز اور کیسے دل کش اسلوب میں ثابت کیا ہے اس کی نظیر نہیں۔ اس شعر کی مولانا حالی نے یوں تعریف فرمائی ہے "آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بنائے ہیں اور اپنی دانائی و ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے" (یادگار غالب)

غزل نمبر ۴۴

۱۔ سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

خریدار : یہاں اس سے مراد غالب کی تصانیف پڑھنے والا۔

مطلب یہ ہے کہ سرمہ سے بصارت کو فائدہ پہنچتا ہے اور آنکھوں کا میل دور ہو جاتا ہے۔ میرے کلام کو پڑھنے سے نور بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور خیالات کی خامی دور ہو جاتی ہے اور پھر اس سرمہ کی کوئی قیمت بھی نہیں صرف پڑھنے والا فائدہ اٹھالے اور بس۔

۲۔ رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

"یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہوگی تو ہم اس کو ضبط کریں گے اور اس کا اثر تجھ تک پہنچیگا" (یادگار غالبؔ)

غزل نمبر ۵۴

۱۔ غافل بوہم نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

طرہ = خوشہ، زلف + گیاہ = گھاس + خود آرا = اپنے کو سنوارنے والا + وہم = وسوسہ، دھوکہ + ناز خود آرا = اپنے کاروبار کو بنانے کا گھمنڈ یا اپنی کارگزاری و عقل پر اترانا۔

مطلب یہ ہے کہ عام طور پر انسان یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار کو وہ خود چلاتے ہیں۔ یہہ خیال کرنا انکی غلطی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کارخانۂ قدرت میں ایک پتہ بھی بغیر اللہ کے حکم کے نہیں ہل سکتا

۲۔ بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ — صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

قدح = پیالہ + بزم قدح = محفل مے نوشی + رنگ = عیش و نشاط + دام گاہ = دنیا۔

فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں عیش کی مثال ایسی ہے جیسے جال سے چھوٹا ہوا شکار۔ ایسا شکار ہاتھ نہیں آسکتا۔ لہذا دنیا میں عیش بھی میسر نہیں۔ یہاں بزم مے اور مجلس عزی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے اسلئے بزم مے سے عیش کی تمنا مت رکھ۔ اسی خیال کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرماتے ہیں ؎

حنائے پائے خزاں ہے بہار گر ہے یہی — دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

۳۔ رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

یعنی قصور کے بعد قصوروار یا تو اپنی غلطی کا کوئی نہ کوئی عذر پیش کریگا اور معافی چاہے گا۔ یا وہ شرمندگی و خجالت سے ساکت و صامت پسینے میں شرابور کھڑا ہوگا۔ اب بآسانی ہر شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ رحم کے قابل تو وہی ہے جس کی زبان تو بند ہے اور عرقِ انفعال ہر بنِ مو سے جاری ہے

پس اللہ تعالیٰ بھی اگر ہماری خموشی اور شرمندگی کو بطور توبہ قبول فرمالیں تو رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے۔

۴۔ مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے ۔۔۔ پر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

زخم اور گل کی تشبیہ ظاہر ہے + مطلب یہ ہے کہ قتل گاہ کو جاتے ہوئے ان زخموں کا تصور کیا جا رہا ہے جو قاتل پہنچائیگا۔ کھلے ہوئے سرخ سرخ زخم گلوں کی طرح تصور کی نگاہ کیلئے سامان نشاط مہیا کر رہے ہیں۔ اس لئے مقتل کو جاتے ہوئے خوف وہراس یا رنج وغم کی بجائے مسرت وشادمانی میرے ساتھ ہے۔

۵۔ جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسدؔ ۔۔۔ پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

ہوا ، آرزو + نگہ گرم ، برق تجلی + وکیل ، ترجمانی کرنے والا + دادخواہ ، عاشق یا طالب۔

فرماتے ہیں اے دوست میں ایک برق تجلی کا طالب ہوں جو میرے وجود کو پھونک دے ٹھیک اسی طرح جس طرح شعلہ پروانہ کو جلا دیتا ہے۔ پروانہ جلکر ہماری آرزو کی ترجمانی کرتا ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ تیرا طالب بھی اسی طرح جلنے کا آرزومند ہے۔

غزل نمبر ۴۶

۱۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۔۔۔ کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

فرماتے ہیں دوست بہ ظاہر ظلم سے باز آ تو گیا۔ مگر اس انداز سے کہ پہلے سے زیادہ ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ اب وہ ستم ظریف ہمارے سامنے نہیں آتا اور کہتا ہے کہ "ہم شرمندہ ہیں کیا منہ دکھلائیں" یہ بھی ایک نئے انداز کا ظلم ہے کہیں سفاک ظلم پیشہ بھی اپنی خوئے جور وجفا سے باز آتے ہیں۔ البتہ ظلم کی نوعیت بدل دیتے ہیں۔

۲۔ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۔۔۔ ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے اچھے برے واقعات وحادثات کا باعث آسمان کی گردش ہے جب ساتوں آسمان گردش میں ہیں تو حوادث بھی کثرت سے ہونگے لیکن اہل ہنر اور صاحب کمال ویسے بد قسمت ہوتے ہیں اس لئے ان کے حصے میں اطمینان، مسرت وشادمانی تو نہیں آسکتی البتہ آلام و مصائب ضرور آئیں گے۔ اس کے بعد موت تو یقینی ہے۔ پھر گھبرانے کی کیا بات ہے؟

۳۔ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

" لاگ ۔ دشمنی + لگاؤ ۔ محبت + یہ مضمون عجب نہیں کسی اور نے بھی باندھا ہو مگر ہم نے آجتک نہیں دیکھا اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے نہیں باندھا ہوگا مطلب یہ ہے کہ معشوق کو ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اسی کو دوستی سمجھتے لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکہ کھائیں قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چار چاند لگا دیا ہے" (یادگار غالب)

۴۔ ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا ؟

یعنی دوست کے نام خط لکھا ۔ نامہ بر کے حوالہ کیا اور اس کو دوست کے گھر کا پتہ تبلا دیا مگر وفور شوق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس نوبت پر اس کو جدا کریں چنانچہ نامہ بر کیساتھ ہو لئے کہ معشوق اگر پوچھے تو یوں کہنا خط پڑھتے وقت اس کی حالت دیکھتے رہنا ۔ اگر خوش پاؤ تو ہماری سفارش کر دینا ہماری محبت و وفاداری کا کسی نہ کسی طرح اس کو یقین دلانا وغیرہ وغیرہ ۔ نامہ بر سے یہ سب گفتگو حالت جذب و بیخودی میں ہو رہی ہے ۔ شدہ شدہ معشوق کا دروازہ آ ہی گیا ۔ اس نوبت پر چونکے اور حیرت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ " یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا " شاعر نے ان دو چھوٹے مصرعوں میں عشق و محبت اور جذب و وارفتگی کی پوری داستان بھر دی ہے

۵۔ موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا ؟

موج خون ۔ آفات و تکالیف + سر سے گزرنا ۔ حد سے زیادہ ہونا ۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کے در پر پڑے رہنے میں خواہ کتنے ہی مصائب و آفات ہم پر نازل ہوں لیکن ہمارے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوگی ان سب آفات کو جھیلتے ہوئے در پر پڑے رہینگے بوالہوس نہیں جو تکالیف سے گھبرا کر بھاگ جائیں ۔ مصرعہ ثانی کی خوبی خصوصاً استفہام کی خوبصورتی بیان میں نہیں آسکتی ۔

۶۔ عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ　　مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

فرماتے ہیں غم سے نجات پانے کیلئے تمام عمر مرنے کی آرزو کرتے رہے۔ خدا خدا کر کے موت آئی اور مر گئے۔ اب یہاں تو غم کا قصہ ختم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ اب آگے دیکھئے مقدر کیا دکھلاتے ہیں۔ آیا جس بہتر حالت کی توقع تھی وہ نصیب ہوتی ہے یا یہاں بھی بلائیں ہماری منتظر ہیں؟۔

حضرتِ غالب استادِ ذوق کے اس شعر کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی خیال کو اس انداز سے دہرایا ہے ؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

۷۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

یعنی ظالم جانتے بوجھتے پوچھ رہا ہے۔ یہ ایک چھیڑ ہے۔ اس شرارت کا کیا جواب دیا جائے۔

غزل نمبر ۲۴

۱۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئنۂ بادِ بہاری کا

نہایت سادہ الفاظ، دلنشین پیرایہ اور لطیف تمثیل کے ذریعہ وحدۃ الوجود کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لطافت غیر مرئی اور غیر محسوس چیز ہے۔ تاوقتیکہ اس میں کثافت نہ پیدا ہو وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ بھاپ غیر مرئی اور لطیف ہے کثیف ہونے کے بعد ابر، پانی، اور اولے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح موجوداتِ عالم کی اصل بھی غیر مرئی اور لطیف ہے۔ یہ ظاہری صور و اشکال اسی لطافت کی کثافت ہیں۔ بادِ بہاری غیر مرئی ہے اس کی صفائی و لطافت کی وجہ آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ آئینہ نم ہو کر زنگ آلود اور کثیف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بادِ بہاری بھی زنگ آلود ہو کر چمن کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

۲۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل　　جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر

محمول ہوسکتا ہے"   (از یادگارِ غالب)

غزل نمبر ۴۸

۱۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

"یعنی جب درد حد سے گزر جائیگا تو مر جائینگے یعنی فنا ہو جائیں گے۔ گویا قطرہ دریا میں کھپ جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا بھی اس کا دوا ہو جانا ہے (یادگارِ غالب)

۲۔ تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد   تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

قفلِ ابجد = حلقہ دار قفل جس کے ہر حلقہ پر کچھ حروف کندہ ہوتے ہیں۔ ان حلقوں کو اس ترتیب سے جمایا جاتا ہے کہ ہر حلقہ کا ایک خاص حرف دوسرے حلقوں کے حروف سے ملکر۔ کوئی مخصوص بات (لفظ) بناتا ہے۔ جوں ہی بات بنی اور قفل کھل گیا

فرماتے ہیں کہ جس طرح قفل ابجد بات بنتے ہی جدا ہو جاتا ہے میری قسمت میں بھی یہ لکھا تھا کہ معشوق سے وصال کی صورت پیدا ہوتے ہی جدائی ہو جائے۔ انتہائی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے؟

۳۔ دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام   مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

کشمکش = کوشش، تدبیر + چارۂ زحمت = علاج دردِ دل + وا ہو جانا = کھلنا

فرماتے ہیں کہ ہم نے دردِ دل کے علاج کی بہت کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کشمکش میں دل ہی ختم ہو گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ گرہ کے کھولنے کی کوشش کی جب وہ آسانی سے نہ کھل سکی تو اس کو گھس گھس کر کھولنا چاہا۔ گھسنے گھسنے ہی میں گرہ مٹ گئی۔

۴۔ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟

فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پر لطف و کرم کی بارش ہوتی تھی یا اب یہ حال ہے کہ مہربانی و عنایات تو کجا جفا سے بھی محروم ہیں یعنی دوست نے ہم سے تعلق ہی منقطع کر لیا ہے۔ اپنے عاشقوں سے اس درجہ بے مروتی اور بے تعلقی بہت بڑی دشمنی ہے۔ کیا یہ بات آپکے لئے مناسب ہے؟

مصرعہ ثانی میں استفہام ہے اور نہایت پیارا استفہام ہے۔

۵۔ ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

یعنی آنسو خون سے بنتے ہیں جب جسم میں خون نہ رہے تو گریہ بھی نہیں ہو سکتا البتہ اسکی بجائے سرد آہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے آنسو بوجہ ضعف دم سرد سے مبدل ہو گئے اب ہمکو یقین آیا کہ پانی بھی اسی طرح ہوا بن کر اڑ جاتا ہے۔

۶۔ دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

یعنی جس طرح گوشت سے ناخن جدا نہیں ہو سکتا اسی طرح تیری انگشت حنائی کا تصور بھی دل سے نہیں مٹ سکتا۔

۷۔ ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا　　روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

"یعنی غم فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے" (یادگار غالب)

۸۔ گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچہ کی ہوس　　کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا

نکہت گل۔ گل کی خوشبو پراگندہ صفت ہوتی ہے اور گرد وہ بھی ہوا میں پراگندہ ہوتی ہے دونوں میں پراگندگی وجہ شبہ ہے ـــــ فرماتے ہیں کہ باد صبا کی گزرگاہ تیرا کوچہ ہے۔ اسی راستہ پر وہ منڈلایا کرتی ہے۔ اسلئے کہ اس کو تجھ سے محبت ہے مگر باد صبا کے ساتھ ساتھ نکہت گل بھی گرد و غبار بنی ہوئی منڈلاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نکہت گل بھی تیری فریفتہ ہے۔

۹۔ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل　　دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

اعجاز = معجزہ، کرشمہ + صیقل = نور + ہوا = خواہش

مطلب ہے کہ نور بے رنگ اور محسوسات سے بالاتر ہے اس کو اپنی اصلی حالت میں نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ پہچان سکتا ہے۔ البتہ جب خود کو خواہش ہوئی کہ میں پہچانا جاوں تو پھر یہ عالم رنگ و بو پیدا ہوا۔ اگر اس کرشمۂ قدرت کو تو سمجھنا چاہتا ہے تو موسم برسات میں فولادی آئینہ کو دیکھ لے کہ صیقل جو نور سے مشابہ ہے سبز رنگ میں مبدل ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب　　چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

فرماتے ہیں کہ جلوۂ گل میں ہم ذوقِ تماشائے دوست پاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر جلوۂ گل ہمارے لئے تماشائے محبوب ہے۔ ہاں۔ آنکھ ایسی ہی ہو کہ ہر چیز میں جلوۂ یار کو دیکھ پائے۔

غزل نمبر ۴۹

۱۔ ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

ربط: تعلق + شیرازۂ وحشت: ایسی ڈوری جس میں وحشت زدہ اجزا منسلک ہوں + سبزۂ بیگانہ: خود رو گھاس

فرماتے ہیں کہ سبزہ، صبا، گل یہ بہار کے اجزاء ہیں۔ ان کے مجموعہ کا نام بہار ہے اور ان سب میں صفت وحشت مشترک ہے۔ بیگانگی، آوارگی اور نا آشنائی وحشت کی علامات ہیں گویا اجزائے بہار ایک ہی شیرازۂ وحشت میں منسلک ہیں۔ وحشت کا تقاضہ بے چینی، بیقراری اور فرار ہے لہذا ان وحشت زدہ اجزا کو بھی قرار و ثبات نہیں۔ جب اجزا کو ثبات نہیں تو ان اجزا کا مجموعہ یعنی بہار بھی بے ثبات ہے۔

غزل نمبر ۵۰

۱۔ برنِ شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اس کا — نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا نام اس کا

شوخی: بے چینی، بے قراری، طراری، شوقِ نمائش + اہتمام: بندوبست، انتظام + نگین: مہر، انگوٹھی جس پر قیمتی پتھر جڑا ہوا ہوتا ہے اور اس پر بادشاہ کا نام کندہ ہوتا ہے فرامین کو اس سے موثق کیا جاتا ہے لوازمات شاہی سے ہے + برنِ شرم ہے: محجوب ہے، بوجہہ شرم پوشیدہ ہے۔ شرم کا خاصہ پوشیدہ رہنا اور شوخی کا تقاضہ ظاہر ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ اس بادشاہِ حقیقی کا انتظام شوقِ نمائش کے باوصف محجوب ہے یعنی اس کارخانۂ قدرت کی جملہ کارسازی اسی کے یدِ قدرت میں ہے۔ اس عالم کون و مکان کا ذرہ ذرہ اسی کے زیر اہتمام وجہہ تخلیق کی تکمیل میں مصروف ہے لیکن کارساز، بادشاہ، مہتمم کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ حجاب میں رہ کر یہ سب انتظام فرما رہا ہے۔ شرم کا یہ عالم ہے کہ مہرِ سلطنت میں نام نمایاں نہیں بلکہ شرر کی صورت نگین میں چھپا ہوا ہے۔

۲۔ مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ ظاہر ہے — کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا

نوازش نامہ ، مکتوب دوست + مسی اور مہر دونوں میں سیاہی مشترک ہے ۔

مطلب یہ ہیکہ دوست نے خط لکھا اور دستور کے موجب ملفوف کر کے اس پر مہر لگا دی جب یہ خط عاشق کو پہنچا تو بغیر کھولے لفافہ کو دیکھکر اس نے خط کا مضمون سمجھ لیا مہر داغ سے مشابہ ہوتا ہی اور سیاہی مسی کی ہمرنگ ۔ اس مہر سے عاشق نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ معشوق اپنے مسی آلودہ لبوں سے داغ کا نشان بنا دیا ہے تاکہ لفافہ ہی سے خط کا مضمون سمجھ لیا جا سکے ۔ لہذا مکتوب کا مضمون لازماً یہی ہو سکتا ہے کہ "بوسہ تو نہیں مل سکتا البتہ آرزوئے بوسہ کا داغ ضرور دیا جائیگا"

۳۔ بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کش حسرت مبادا ہو عناں گیر تغافل لطفِ عام اس کا

غالباً اسی قسم کے چند اشعار کو پیش نظر رکھکر غالب کے بعض معاصرین نے مہمل گوئی کا الزام لگایا ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ معترضین کی شکایت صرف ایسے بعض اشعار سے متعلق اس حد تک درست ہی کہ بڑی کاوش کے بعد مطالب تک رسائی ہوتی ہی ۔ عام اذہان الفاظ اور استعارات کی بھول بھلیوں میں گم کردہ راہ ہو جاتے ہیں لیکن ان چند سونے چاندی کے سکوں کی آمیزش سے غالب کے جواہر پاروں کے خزانے کی قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی ۔

محمل کش ، محمل کو تھامنے والا + حسرت ، آرزو + محمل کش حسرت ، حسرت کو محمل فرض کیا ہے معنی یہ ہوا کہ آرزو کو تھامنے والا' آرزومند + عناں گیر تغافل ۔ تغافل کو ہی عناں گیر فرض کیا گیا ہی یعنی دوست کا تغافل جو ہماری آرزو بر لانے سے روکتا ہے + مبادا ، ایسا نہ ہو +

اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ میں تو نگاہِ خاص کا آرزومند ہوں اور دوست لطفِ عام میں معروف ہی اس لئے اندیشہ تھا ہیکہ اس معروفیت میں کہیں ہم کو نہ بھول جائے اور ہماری آرزوئے لطفِ خاص پوری نہو ۔

غزل نمبر ۵۱

۱۔ دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

شاعر نے اپنے وجود کو ماتم خانہ تعبیر کیا ہے اور دل اس ماتم خانہ کا چراغ ۔

مطلب یہ ہیکہ دل جو ماتم کدہ کا چراغ تھا آج بالکل ہی جل گیا ۔ دل کے جلنے سے جو دھواں اٹھا وہ اب دل کا ماتم کر رہا ہے ۔ دھویں کی سیہ پوشی اس کے ماتم کرنیکا ثبوت ہے ۔

۲۔ شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا　　غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

شکوہ = شکایت + یاران ۔ مراد اس سے معاصرین مخالف + گنج = یہ لفظ کثیر المعانی ہے یہاں اس کے معنی ایسا چاقو جس میں کئی پھل اور مختلف اوزار ہوں ۔ مخالفین کے سب وشتم اور ٹیڑھی ترچھی باتوں کو چاقو چھری سے تشبیہ دی ہے + شایاں = لائق

فرماتے ہیں کہ مخالفین نے بہت سی چوٹیں چلیں دل مکدر ہوتا رہا تکلیف ہوئی لیکن میں نے نہ تو اس کا اظہار کیا اور نہ کوئی جوابی کارروائی کی ۔ بلکہ ان سب شکایتوں کو اپنے غبار دل ہی میں دفن کر دیا ۔ مخالفین کی ٹیڑھی ترچھی باتیں اور ان کی دشنام طرازیاں اسی قابل تھیں کہ ان کو دفن ہی کر دیا جاتا ۔

غالبؔ کے بعض کم ظرف و سفلہ مخالفین اور تو اور مغلظ گالیاں بھی لکھ بھیجا کرتے ۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اور کس شائستگی کے ساتھ دل سے خود بخود "واہ" نکل جاتی ہے ۔

غزل نمبر ۵۲

۱۔ پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے　　رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

ہوادار = دوست، عاشق، خیر خواہ یہاں اس سے مراد گل و بلبل و قمری بھی ہو سکتے ہیں یا دوسرے حسین جو روزانہ سیر و تفریح کیلئے باغ جایا کرتے ہیں ۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق پھر قصد گلستان کر رہا ہے نہیں معلوم کہ آج اس کو دیکھکر کتنے حسینوں کا رنگ فق ہو جائے ۔ یا یہ کہ پھول حیرت زدہ ہو کر بے رنگ ہو جائیں اور پرندے چہچہانا بھول جائیں ۔

ردیفِ بائے موحّدہ

غزل نمبر (۱)

۱۔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب　　دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

بال کشا ہو = اڑنے کیلئے پر کھولے، حرکت میں آئے + بطِ مے = قدیم زمانہ میں انگوری شراب بنانے کا یہ طریقہ تھا کہ انگور کی فصل تیار ہونے پر انگوروں کو پاک صاف حوضوں میں ڈال دیا جاتا ۔ آفتاب کی تمازت سے جب رس نکلنے لگتا

اور خمیر پیدا ہو جاتا تو انکو کھلا جاتا۔ اس کے بعد مٹی کی سر بند صراحیاں ان حوضوں میں چھوڑ دی جاتیں۔ انگور کا عرق مسامات کے ذریعہ ان صراحیوں میں جمع ہو جاتا یہی انگوری شراب کہلاتی۔ پس بطے سے یہی صراحی مراد ہے۔

دل = ارادہ، خواہش + دست = قدرت۔

شعر کا مطلب ہے کہ پھر شراب بنانے کا موسم آگیا ہے۔ اب موج شراب کو چاہیئے کہ انگوروں سے نکل کر حوض میں آئے اور بطے کو تیرنے کی خواہش و قدرت دے۔ بطے تیرنے لگیگی تو میخواروں کو خالص شراب میسر ہوگی۔

۲۔ پوچھ مت وجہ سیاہ مستیٔ ارباب چمن ۔۔۔ سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

سیہ مستی = بدمستی، مخموری = تاک = انگور کی بیل + پوچھ مت = وجہ کی انتہائی اہمیت جتانا مقصود ہے یا یہ کہ وجہ اس قدر کھلی اور معلوم ہے کہ اسکی نسبت سوال کرنا ہی فضول ہے۔

فرماتے ہیں موسم بہار ایسا کیف آفرین ہے کہ ارباب چمن سب کے سب مسرور و مخمور ہیں۔ بہار کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ ہوا کی موج بھی جب انگور کی ٹہنیوں کے سایہ میں گزرتی ہے تو موج شراب بنجاتی ہے لہذا ارباب چمن کی بدمستی کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں پھر کیوں پوچھتا ہے۔

۳۔ جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے ۔۔۔ سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

غرقہ = غرق + بخت رسا = خوش بختی + سر سے گزرنا = حد سے زیادہ ہونا + ہما = ایک خیالی پرند جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ فضا ہی میں رہتا ہے۔ اس کے ایک ہڈی پیدا ہوتی ہے۔ وہی ہڈی کھا کر زندہ رہتا ہے۔ اور جس کسی کے سر پر اس کے پروں کا سایہ پڑجاتا ہے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔

مطلب ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت انسان کیلئے بے فکری اور اطمینان قلب ہے جس کسی کو یہ نصیب ہے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ بادشاہوں کو بھی یہ دولت حاصل نہیں۔ پھر یہ دولت یعنی مسرت و بفکری کیسے ہاتھ آئے؟ تو فرماتے ہیں کہ مے میں غرق ہو جاؤ۔ شراب پینے سے مسرت حاصل ہوگی اور بے خودی کی حالت طاری ہو جائیگی اور خود بخود دنیا کی جملہ فکریں کافور ہو جائیں گی۔ یہی خوش بختی ہے

اور مے نوشی کا حد سے گزر جانا تو بادشاہ بنا دیتا ہے موجِ شراب سایۂ ہما کا کام کرتی ہے۔ اس شعر کے ظاہری الفاظ سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ شاعر مے نوشی کی ترغیب دے رہا ہے۔ مے و ساغر وغیرہ تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ مے سے مراد مئے عرفان و عشقِ الٰہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

۴۔ ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

موجِ ہستی = موجوداتِ عالم یعنی ہستی کی بھی موجیں اٹھتی ہیں ساحلِ وقت سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی اور پھر نئی موجیں اٹھتی ہیں۔ گویا موجوں کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔ نہایت بلیغ تشبیہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ برسات کا موسم بھی عجیب جان نواز ہے۔ ہر چیز پر بے خودی کا عالم طاری ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی اٹکھیلیاں، بادلوں کا جھوم جھوم کر برسنا۔ دریاؤں کا جوش و خروش۔ ندی نالوں کی ہوتی چٹیل زمین کی سبز پوشی، موروں کی جھنکار، کوئل کی کوک، پپیہے کی پی ہو پی ہو، کسانوں کی خوشیاں غرض ہر چیز میں مستی اور کیف ہی کیف ہے۔ پھر غلط کیا ہے کہ موجِ ہستی فیضِ ہوا سے موجِ شراب بن گئی ہے۔

۵۔ چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

مطلب یہ ہے کہ عیش و نشاط کا طوفان ان ہی چار عناصر سے مرکب ہے اور موسمِ بہار میں یہ طوفان ہر طرف برپا ہے۔

۶۔ جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکین بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

ناز = روئیدگی، نوخیزی + جگر تشنۂ ناز = تشنہ برائے روئیدگی و نشو و نما + روحِ نباتی = جملہ نباتات دم = پانی کا گھونٹ + موجِ شراب = موسمِ بارش کی مرطوب ہوا + آبِ بقا = آبِ حیوان۔

فرماتے ہیں کہ جملہ نباتات اپنی نمو کیلئے پانی کو ترس رہی ہیں۔ موسمِ بارش کی ہوائیں آبِ بقا سے انکی جان نوازی کریں گی۔ چونکہ اس سے پہلے شعر میں شاعر نے فیضِ ہوا کو موجِ شراب سے تشبیہ دی ہے لہٰذا اس شعر میں بھی موجِ شراب سے مراد بارش کی مرطوب ہوا ہے۔ یعنی جب بارش ہوگی نباتات زندہ ہو جائینگی

۷۔ بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

رگِ تاک = انگور کی بیل کے ریشے + رنگ = سرور، نشاط۔

فرماتے ہیں کہ پہلے شراب انگور کی بیل کے رگ و ریشہ میں خون ہو کر دوڑتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے اور جب فصل تیار ہو جائے تو مستی و سرور کے پر لگا کر سوئے میخانہ آمادۂ پرواز ہوتی ہے۔

۸۔ موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

گزرگاہِ خیال = دماغ + فرماتے ہیں کہ موسمِ بارش بھی عجیب پُرلطف موسم ہے۔ ایک طرف پھولوں کا خیال دماغ کو روشن کر دیتا ہے تو دوسری طرف تصور میں شراب ہی شراب کے جلوے ہیں۔ حاصل یہ کہ فرحت مے کشی میں ہے اور مے کشی کا سامان موسمِ برسات میں۔

۹۔ نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

پردہ = روپ + نشو = پیدا ہونا، اُگنا + نما = بڑھنا، بلند ہونا۔

فرماتے ہیں کہ شراب میں بوجہ جوشِ بالیدگی اور نشو و نما کی زبردست خواہش ہے اس لئے نشہ کا روپ اختیار کر کے اعضاء و جوارح سے گزرتی ہوئی انتہائی بلندی یعنی دماغ تک پہنچ چکی ہے اور دماغ کی کیفیت کے مشاہدہ میں محو ہے۔

۱۰۔ ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

فرماتے ہیں کہ موسم بارش میں سبزۂ نوخیز سے لے کر موجِ شراب تک ہر چیز فصلِ بہار کی کیفیت کا طوفان بنی ہوئی ساری دنیا پر چھا گئی ہے۔ مطلب یہ کہ اس پرلطف موسم میں ہر چیز سے کیفیت ٹپکی پڑتی ہے۔

۱۱۔ شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

زہے، خوشا، مرحبا، سبحان اللہ وغیرہ کلماتِ تحسین ہیں۔

فرماتے ہیں مرحبا موسمِ بہار ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے۔ وہ تفصیلِ ہستی کیا ہے؟ یہی ابرِ بہاری کا برسنا، سوکھی زمین سے سبزہ و گل نکل آنا، پرندوں کا چہچہانا، حشرات الارض کی فراوانی باغ و راغ کی سرسبزی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوئی۔ پھر شراب کیا ہے تو فرماتے ہیں

کہ قطرہ کو دریا میں ملانیوالی ہے یعنی قطرہ کو دریا بنا دیتی ہے۔ شراب سے بیخودی اور بیخودی سے فنائیت حاصل ہوتی ہے۔

۱۲۔ ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جلوۂ گل = ہنگامۂ ہستی۔

فرماتے ہیں کہ موسم بہار میں طوفان ہستی کو دیکھکر میں خوف زدہ اور پریشان ہو رہا ہوں۔ اس پریشانی کا علاج صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ اب شراب جس کتنا میں آئے اور اس طوفان سے مجھے بے خبر کر دے

ردیف (ت)

غزل نمبر (۱)

۱۔ افسوس کہ دیدان کا کیا رزق قضا نے جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

دیدان = کیڑے — درخور = لایق + عقد گہر = موتیوں کی انگوٹھی

فرماتے ہیں وہ حسین جن کی انگلیاں اس قابل تھیں کہ ان میں لعل و گہر کی انگشتریاں ہوتیں آج ان انگلیوں میں بجائے موتیوں کی انگوٹھی کے۔ کیڑوں کے چھلے ہیں۔ یہ مشیت ایزدی ہے اس میں کسی کو جائے دم زدن نہیں۔ موتیوں اور کیڑوں میں تشبیہ موجود ہے۔

۲۔ کافی ہے نشانی تیری چھلہ کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

خالی = صرف، محض — مطلب یہ ہے کہ جب کوئی دوست دوست سے وداع ہو کر کسی طویل سفر پر جاتا ہے تو رسم و رواج کے لحاظ سے اس کو بطور نشانی انگوٹھی یا چھلہ دیا جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ دوست وہ چھلہ اپنی انگلی میں پہن لے اور ہر وقت دینے والے دوست کی یاد اس کے دل میں قایم رہے۔ لیکن معشوق نے یہ شوخی کی کہ بوقتِ سفر ناز و انداز سے چھلہ صرف دکھلا دیا۔ دیا نہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ معشوق کی یہ کافرادا تیر کی طرح دل میں اتر گئی۔ اب معشوق کی یاد کیلئے انگوٹھی کی کیا ضرورت ہے۔ کیا

یہ نازوانداز بھلایا جا سکتا ہے؟

۳۔ لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پہ انگشت

سوزشِ دل۔ غور و فکر، جان کاہی + سخن گرم۔ مزیدار اور پرتاثیر اشعار جو سوزِ دل کا نتیجہ ہیں + حرف پر انگلی رکھنا

عیب چینی کرنا، اعتراض کرنا۔

فرماتے ہیں کہ میرا کلام بڑے ہی غور و فکر اور سوزِ دل کا نتیجہ ہے۔ پھر کس کی مجال ہے جو کسی حرف پر انگلی رکھ سکے اگر کسی نے میرے حرف پر انگلی رکھی تو انگلی جل جائے اور اعتراض کرے تو زبان کٹ جائے

غزل نمبر ۲

۱۔ رہا گر کوئی تا قیامت سلامت تو اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

یعنی اگر کوئی قیامت تک بھی زندہ رہے پھر بھی ایک دن اس کو مرنا ہے موت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

۲۔ جگر کو میرے عشق خوں نابہ مشرب لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

مشرب۔ مسلک، جائے شرب + خداوندِ نعمت۔ مالک، آقا، صاحب عز و جاہ

چونکہ عشق کی پرورش خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ اس لئے عشق جب کبھی عرضی لکھتا ہے تو میرے جگر کو "خداوندِ نعمت سلامت" کے القاب سے مخاطب کرتا ہے۔

۳۔ علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت

یعنی دشمن بیوفا ہے اس کے برخلاف میں شہیدِ وفا ہوں۔ اس کی ذلت کی اور میرے مدارج بلندی کی کوئی حد نہیں۔ دشمن کے مقابلہ میں یہ کامیابی یقیناً قابل مبارکباد ہے۔

۴۔ نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

ادراک۔ عقل، سمجھ + معنی۔ ظاہر کی ضد، باطن، حقیقت + نیرنگ صورت۔ ظاہری طلسم، موجودات کی ظاہری اشکال

فرماتے ہیں کہ اگر تجھکو دیدۂ حق بین نہیں ملا ہے یا تجھ میں اس کائنات کے باطن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو پھر جمالِ ظاہری ہی کو دیکھ، غور کر اور لطف اندوز ہو تیرے لئے یہ بھی غنیمت ہے۔

غزل نمبر ۳

۱۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ ۔۔۔ یار لائے مرے بالین پہ اسے پر کس وقت

آنکھیں مند گئیں = آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں، موت آگئی۔

فرماتے ہیں کہ میں عالم نزع میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ احباب دوست کو میرے پاس لائے جوں ہی دوست کی آنے کی خبر ہوئی خوشی سے آنکھیں کھول دیں اور ساتھ ہی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں افسوس کہ احباب ایسے وقت دوست کو میرے پاس لائے کہ میں جی بھر کر اس کو دیکھ بھی نہ سکا۔ مرتے ہوئے بھی ایک نیا داغ ساتھ لئے جا رہا ہوں۔

غزل نمبر ۴

۱۔ آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ۔۔۔ دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

دوست و ساقی ۔۔۔ اردو اور فارسی شاعری میں جہاں اس قسم کے شعر آتے ہیں طبیعت میں ایک ناگواری اور خیال میں ایک پراگندگی پیدا ہوتی ہے کہ لڑکوں سے معاشقہ کیسا ؟ اردو شاعری میں فارسی کی کورانہ تقلید چلی آرہی ہے اور فارسی شاعری میں اس قسم کے مضامین کی اصل یہ ہے کہ کم عمر، معصوم اور بھولے بھالے لڑکوں کو خواہ اپنے ہوں یا دوسروں کے ہر شخص پیار کرتا ہے۔ ان کے پاکیزہ صاف چہرے، روشن آنکھیں، بھولی بھولی باتیں اور بے ضرر شوخیاں سب کو گرویدہ کر لیتی ہیں ایران کی سرزمین بھی زمانۂ قدیم میں بڑی رنگین تھی جگہ جگہ مے خانے۔ مے نوشی کی محفلوں کی گرم بازاری شراب پلانے اور ساغر گھمانے کا کام کمسن ملازموں سے لیا جاتا غالباً اس لئے کہ کام آسان جو بچے بخوبی انجام دے سکیں۔ دوسرے یہ کہ عمر والے ملازمین کے مقابلہ میں ان کا مشاہرہ بھی کم۔ تیسرے یہ کہ میکشوں کے لئے بھی ان کی شوخیاں موجب فرحت و انبساط ہوتیں۔

ایران میں کیانی دور کے خاتمہ پر یہ رنگینیاں بھی ختم ہو گئیں لیکن شاعری میں گل و بلبل کے ساتھ مے و ساغر، مغ و ساقی کے قدیم چرچے قایم رہے۔ اسلام کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد علمائے محققین اشراقین و مشائین کی طرح دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ علمائے ظاہر یا فقہا اور علمائے باطن اولیا یا صوفی۔ صوفیانہ خیالات کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اس راز سربستہ کو کھلم کھلا عوام کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک آڑ ایک پردے کی ضرورت

تھی۔ صوفیاء نے دیکھا کہ شاعری سے بہتر دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ بس یہاں سے ایک نئی صنف شاعری میں داخل ہوگئی لیکن اصطلاحات، تشبیہات، تمثیلات، استعارے، کنائے، تلمیحیں سب وہی باقی رہیں۔

ہندوستان میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو شعرا پر چونکہ پہلے سے ہی فارسی شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا وہی رنگ، وہی اسالیب وہی اصطلاحات آسانی سے اردو میں منتقل ہوگئیں۔ "ساقی" شاعری کی ایک اہم اصطلاح ہے اس سے یار یا معشوق کے علاوہ کبھی مرشد اور کبھی رسول اور کہیں ذات باری تعالیٰ سے بھی استعارہ کیا جاتا ہے۔ اور کبھی صرف شاعرانہ تخیل کی جولانگاہ جیسا کہ مندرجہ بالا شعر میں۔ حاصل کلام یہ صرف شاعرانہ اصطلاح ہے ان مواقع پر معاشقہ کا خیال درست نہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ساقی جب تک کم سن تھا اس کے رخسار مثل شمع کے روشن تھے معشوق مست اس سے ٹکٹکی تھی اور میخوار پروانہ وار اس کے گرد جمع ہوتے تھے جوانی کے آغاز پر چہرے کی صفائی اور روشنی جاتی رہی۔ گویا رخسار کی جو شمع روشن تھی وہ بجھ گئی۔ شمع کے بجھنے سے جو دھواں نکلا خط رخسار بن گیا شاعر نے صرف شمع رخسار کے دھویں سے داڑھی اگا دی ہے۔ اس کے سوا کوئی خاص خیال شعر میں نہیں ہے۔

۲۔ اے دلِ نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر — کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

فرماتے ہیں اے دلِ نا عاقبت اندیش جہاں موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر تجلیات کی تاب نہ لا سکے دوسرے کی کیا حقیقت۔ اس لئے ضبط شوق کر۔

۳۔ خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے — صورت نقش قدم ہوں رفتۂ رفتار دوست

خانہ ویران سازیٔ حیرت = حیرت کی وجہ گھر کی بربادی ۔ رفتہ = وارفتہ، عاشق

فرماتے ہیں کہ دوست کی رفتار کیا ہے ایک قیامت ہے۔ اس کی رفتار دیکھ کر میں وارفتہ و حیران ہوگیا اور اس درجہ ساکت و صامت جیسے دوست کا نقش قدم جب سکتہ کا عالم اس طرح طاری ہو جائے تو گھر کی خبر کون لے۔ غرض یہ کہ حیرت نے گھر کو اور ہم کو دونوں کو برباد کر دیا۔

۴۔ عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

فرماتے ہیں کہ میں دوست کا عاشق تھا اس کا دیوانہ اور بیمار تھا لیکن رقیب بھی آدھمکا اور اظہار محبت کرنے لگا پہلے سے تو دوست کا بیمار تھا ہی رشک رقیب نے کام تمام کر دیا۔ حاصل کلام بیمار تو دوست نے کیا تھا اور قتل دشمن نے۔

۵۔ چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے — دیدۂ پرخوں ہمارا ساغر سرشار دوست

چشم ما روشن دل ماشاد ایک عام محاورہ ہے + دیدۂ پرخون اور ساغر سرشار میں تشبیہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہمکو روتا ہوا دیکھ کر دوست مسرور ہوتا ہے۔ گویا ہماری پرخون آنکھیں دوست کیلئے جام مے کا اثر رکھتی ہیں۔ دوست کو اس طرح خوش اور مسرور دیکھکر ہماری آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ گریہ کا اعجاز ہے کہ عاشق و معشوق دونوں خوش ہیں۔

۶۔ غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

پرسش کرتا ہے = اظہار ہمدردی کرتا ہے، مزاج پرسی کرتا ہے + یوں۔ نیچے کے اشعار میں تفصیل ہے۔

مطلب یہ کہ رقیب ایک سچے دوست کی طرح بظاہر اظہار ہمدردی کرتا ہے لیکن اس کا اصل مقصد تو ہمکو جلانا اور ایذا پہنچانا ہے۔

۷۔ تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک — مجھکو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

یعنی غیر دوران پرسش میں دلاسا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "آپ اطمینان رکھیے میں اس کو آپکے پاس لاتا ہوں اس سے ملاقات کا وعدہ لے چکا ہوں" یہ اسلئے کہتا ہے کہ دوست کے پاس اپنا اثر و رسوخ ثابت کرے اور ہمکو جو پہلے ہی سے ہجر کے جلے ہوئے ہیں رشک کی آگ سے جلا ڈالے۔

۸۔ جبکہ میں کہتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ — سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

سر کرنا = سر منڈھنا، زبردستی گلے باندھنا + حدیث = بات، ذکر + ضعف دماغ کا علاج خوشبو ہے۔

فرماتے ہیں کہ رقیب بلائے بے درمان کی طرح سر ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس ظالم کی نجات ملے۔ یوں تو یہ بلا ٹلتی نظر نہیں آتی اس کو ٹالنے کیلئے ضعف دماغ کا عذر پیش کرتا ہوں کہ اب دماغ چکرا رہا ہے آپکی ہمدردی کا شکریہ خدا حافظ۔ مگر وہ تو ٹھہرا دشمن جان لے کر ہی ٹلنا چاہتا تھا۔ لگا

ہمدردی جتلائے اور کہا کہ میں ابھی ضعف دماغ کا علاج کئے دیتا ہوں۔ پھر زبردستی دوست کی زلف عنبر بار کا قصہ سنانا شروع کر دیا (ظاہر ہے کہ ضعف دماغ کا علاج خوشبو ہے)

(یہ شعر ایک منتر ہے۔ جتنی دفعہ اس کو پڑھا جائے اس کے اثر میں زیادتی ہوتی جائے)

۹۔ چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

یعنی ہم کو روتا ہوا دیکھکر رقیب کو مسرت ہوتی ہے۔ اور بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے لیکن بظاہر ہمکو رونے سے باز رکھنے اور اپنے ساتھ ہنسانے دوست کے لطیفے سناتا ہے۔

۱۰۔ مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجئے یا بیان کیجئے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

مہربانیہائے دشمن = دشمن کے نفاق اور ظلم کو طنزاً مہربانی سے تعبیر فرماتے ہیں = سپاس۔ شکر = لذتِ آزارِ دوست دوست کی یاد یا اس کے ناز و انداز لذت آمیز آزار ہیں۔

فرماتے ہیں کہ دشمن کے اس ظلم وستم کی شکایت کیجائے جو بہ لباس دوستی ہم پر کیا جا رہا ہے یا دوست کے ناز و انداز اور اسکی خوشگوار یاد سے جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی شکر گزاری کریں۔ مطلب یہ کہ رقیب کی منافقت ایذا رساں ہے اور دوست کی یاد لذت بخش۔

۱۱۔ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ ہے ردیف شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

فرماتے ہیں چونکہ اس غزل کی ردیف ہی "دوست" ہے اور بار بار دوست کا ذکر اس غزل میں آیا ہے اس لئے یہ ہماری غزل ہم کو دل سے پسند ہے۔ اور یہ ثبوت ہے ہماری دوست سے محبت کا۔

ردیف ج

غزل نمبر (۱)

۱۔ گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

فرماتے ہیں کہ آج گلشن میں غیر معمولی اہتمام سے یوم آزادی منایا جا رہا ہے کہ اب کوئی کسی کا

غلام نہ ہوگا۔ اور جو گرفتار تھے وہ سب چھوڑ دیئے جا رہے ہیں۔ کوئی صیاد اب کسی کو اسیرِ دام نہیں کر سکتا اس انتظام کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے یعنی قمری کا طوقِ غلامی نکال کر گلشن کے بیرونی دروازے پر بطور اعلان لگا دیا گیا ہے تاکہ ہر ہوا خواہِ چمن واقف ہو جائے۔

یا

یہ کہ آج گلشن میں سخت روک تھام ہے۔ کسی نا اہل یعنی غیر عاشق کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ قمری کا طوق بطور اعلان باہر لگا دیا گیا ہے کہ جو بھی اندر آنا چاہے اس طرح طوقِ عشق و غلامی پہن کر داخل ہو (قمری کے طوق اور حلقۂ در کی مشابہت ظاہر ہے)

۳۔ آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

کمند = ڈور جس سے شکار باندھا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں بڑی مدت کے بعد آج آہ و فغاں میں اثر پیدا ہوا ہے اور تارِ نفس میں اثر گرفتہ ہو چکا ہے۔ مگر اثر کا نتیجہ الٹا ہے۔ بجائے اس کے کہ اثر آرزوئے دل یعنی معشوق کو کھینچ کر لائے پارہ ہائے دل کو اندر سے کھینچ کر باہر لا رہا ہے۔ سچ ہے بدقسمتوں کی آہ ایسا ہی اثر پیدا کریگی۔

۴۔ اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

انتظام کا حاصل سکون و اطمینان ہوتا ہے یہاں انتظام مراد نتیجۂ انتظام یعنی اطمینان ہے۔ قاعدہ ہے کہ سیلاب زدہ مقامات سے تخلیہ کر دیا جاتا ہے۔ کہ در و دیوار کے انہدام کی صورت میں جان و مال محفوظ رہے۔ فرماتے ہیں کہ آج گریہ کا طوفان ہے۔ طوفان کا نتیجہ سیلاب۔ یہ سیلاب در و دیوار کو گرائے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لئے ہمارے گھر سے عافیت و اطمینان کو جلد نکل جانا چاہیئے۔ ان کی سلامتی اسی میں ہے کہ یہاں سے چل دیں ان کے رخصت ہونیکے بعد حیرانی اور پریشانی جو مقدر ہو چکی ہے باقی رہیگی۔

۵۔ معزولیِ تپش ہوئی افراطِ انتظار — چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

معزولیِ تپش = حرارت کا اخراج۔

مطلب یہ کہ دوست کے انتظار میں آنکھ اس طرح کھلی کی کھلی ہے گویا دروازہ کا حلقہ بن گئی

ہی۔ اس کھلے راستہ سے تپش خارج ہو رہی ہے۔ یا۔ شاعر کا منشا یہ ہے کہ افراط انتظار کی وجہ آنکھ کھلی ہے اور گریہ جاری ہے لہٰذا آنکھوں کے ذریعہ سوزِ دل خون بن کر خارج ہو رہا ہے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

فرماتے ہیں۔ لوگ مریض عشق کی حالت زار کو دیکھکر کہتے ہیں اس میں معالج یعنی معشوق کی کوئی غلطی نہیں۔ ساری خرابی اس وجہ سے ہیکہ اس بیچارے کو بحالت کس مپرسی چھوڑ دیا گیا ہے کوئی اس کا خبر گیراں نہیں اسی بے توجہی سے اس کا مرض بڑھ رہا ہے ورنہ معالج حاذق اور مرض قابل اصلاح ہے۔ لیکن شاعر کو لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کو کامل یقین ہے کہ مرض عشق کا ازالہ ممکن نہیں اس لئے کہتا ہے کہ اچھا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ آج سے ہم مریض عشق کی تیمارداری اپنے سر لیتے ہیں۔ تیمارداری کے بعد بھی وہ اگر اچھا نہ ہو تو معالج یعنی معشوق کو کیا سزا دی جائے جو عوام کو غلط باور کروا رہا ہے۔

ردیف چ

غزل نمبر (۱)

۱۔ نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

انجمن آرزو سے نفس باہر کھینچنا = مایوس ہونا + ساغر = مراد ساغر کی گردش

فرماتے ہیں۔ تو کسی حالت میں مایوس مت ہو۔ اگر تجھکو پہلے ہی شراب نہ ملے تو محفل مے نوشی سے مایوس ہو کر مت اٹھ۔ ساغر کی گردش کا انتظار کر۔ کبھی نہ کبھی تیری باری آ ہی جائیگی اور تجھکو شراب ضرور ملیگی۔ حاصل یہ کہ انسان کو کسی حالت میں مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ایک نہ ایک وقت کامیابی ضروری ہے۔

۲۔ بکمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ — برنگِ خار میرے آئینہ سے جوہر کھینچ

آئینہ = آنکھ، خار اور جوہر تارِ نظر سے استعارہ ہے۔

فرماتے ہیں شوقِ دیدار میں آنکھوں نے معشوق کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ گھومتے گھومتے ان کے پاؤں میں آبلے آ گئے اور صدہا کانٹے ٹوٹے۔ آئینہ چشم کے جوہر یعنی تارِ نظر ہی انتظارِ دید میں کانٹے بن گئے ہیں اس لئے جلوہ دکھا دے اور یہ انتظار کے کانٹے کھینچ لے۔

۳۔ تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ‏ ‏ ‏ کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

بستر کا ناز کھینچنا = بستر پر لیٹے رہنا۔

فرماتے ہیں کہ دل بستر پر لیٹے ہوئے معشوق کا انتظار کر رہا ہے کہ اب معشوق آئیگا۔ شاعر دل کو بستر پر لیٹا ہوا دیکھ کر طنزاً کہتا ہے کہ اے دل اس طرح انتظار کرنا آرام کیلئے ایک بہانہ ہے۔ ورنہ معشوق نے تو یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ آئیگا۔ اور تو لیٹا رہ۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انتظار کو بہانہ بنا کر تو آرام کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس ‏ ‏ ‏ بہ کوریٔ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

نرگس = نہایت خوبصورت متوالی آنکھ مگر بینائی سے محروم + رقیب = دشمن + بکوریٔ دل و چشمِ رقیب = تجھکو نرگس کے دل و آنکھ کی بے بصری کی قسم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق سیرِ چمن میں مصروف ہے۔ نرگس معشوق کی متوالی خوبصورت آنکھوں کو رشک و حسد سے دیکھ رہی ہے۔ حسرت و رشک اس بات کا ہے کہ دنیا میں آجتک مجھ جیسی آنکھ کسی کی نہیں تھی۔ یہ کافر پریزاد کون ہے کہ اس کی آنکھیں مجھ سے بھی سبقت لے گئیں۔ شاعر کہتا ہے کہ نرگس حسد سے جل رہی ہے بھلا نرگس بے نور کی یہ مجال کہ تجھ پہ رشک کرے۔ اے دوست تجھکو نرگس کے دل و چشم کی بے بصری کی قسم ہے۔ اس کو اور بھی جلانے کیلئے ساغر پر ساغر چڑھا تا کہ تیری آنکھیں اور بھی متوالی ہوں اور تیری دشمن یعنی نرگس اور بھی جلے۔

۵۔ بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ‏ ‏ ‏ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

غمزہ و ناز ہم معنی ہیں + فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے آدھے غمزے یعنی نیم نگاہی نے تو جگر میں خنجر

گھونپ دیا ہے۔ اور جگر ہی میں بطور امانت چھپا دیا ہے۔ گویا زخم جگر خنجر کیلئے نیام بن گیا ہے یعنی تیری نیم نگاہی کی یاد دل میں باقی ہے، اور دل چاہتا ہے کہ ایسا ہی نیم غمزہ پھر دیکھے۔ اس لئے اب جو دوسرا آدھا غمزہ باقی رہ گیا ہے اس سے اس خنجر کو کھینچ لے اور جسکی امانت اس کو پہنچا دے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر ایک نگاہ غلط انداز ہو جائے تاکہ ہماری تمنا پوری ہو اور خلش دور ہو جائے۔

۶۔ مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

قدح: پیالہ مراد دل۔ صہبا: شراب + آتش پنہاں: عشق + سمندر: آگ میں رہنے والا جانور۔

فرماتے ہیں کہ میرے دل میں شراب عشق ہے۔ اس شراب کی حرارت کا کیا پوچھنا۔ اسکے سامنے آگ بھی ٹھہر جائے۔ ایسی شراب کیلئے کباب بھی آتش صفت ہوں تو کچھ مزہ آئے۔ اسلئے سمندر کے دل کے کباب ہی دستر خوان پر موزوں ہو سکتے ہیں۔

ردیف (د)

غزل نمبر (۱)

۱۔ حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

اہل جفا: حسین + فرماتے ہیں کہ میرے بعد ناز و غمزہ کا قدر شناس کوئی نہیں رہا اس لئے حسینان عالم نے ناز و غمزہ ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح ان کو اس کشمکش سے نجات مل گئی آخر ناز و غمزہ کیلئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے

۲۔ منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

معزولی: برطرفی + منصب: عہدہ۔

فرماتے ہیں انداز و ادا پر فریفتہ ہونے والا میں ایک تھا۔ اب اس منصب کے قابل کوئی اور نہیں رہا۔ اس لئے میرے بعد شیفتگی کا عہدہ توڑ دیا گیا اور انداز و ادا برطرف کر دیئے گئے۔ اس شعر میں بھی وہی خیال ہے جو اس سے پہلے کے شعر میں ہے۔

۳۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

فرماتے ہیں کہ جس طرح شمع کے بجھنے کے بعد دھواں اسکے ماتم میں سیاہ پوش ہوتا ہے۔ اسی طرح عشق کا شعلہ بھی میرے ساتھ بجھ گیا۔ اب اس شعلہ کا دھواں سیاہ پوش ہو کر عشق کا ماتم کر رہا ہے کہ افسوس دنیا سے عشق اٹھ گیا۔

۴۔ خون ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

دل خون ہونا۔ سخت رنج ہونا + احوال بتاں۔ حسینوں کی گری ہوئی حالت۔

فرماتے ہیں کہ قبر میں بھی حسینوں کی فکر لگی ہوئی ہے اور اس بات سے سخت رنج ہوتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد انہوں نے بناو سنگار چھوڑ دیا اور ان کی حالت گر گئی۔ اب کون ہے جس کیلئے وہ مہندی لگائیں۔ شاعر نے مغالطہ میں ڈالنے خون، دل، ناخن اور محتاج حنا شعر میں اس انداز سے جمع کئے ہیں کہ خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حسینوں کے ناخن پہلے عاشق کے خون سے رنگے جاتے تھے اس کے مرنے کے بعد اب مہندی لگائی جا رہی ہے۔ اگر ذوق سلیم نہ ہو تو دھوکہ کھا جائے۔

۵۔ درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

درخور عرض۔ ظاہر کرنے کے قابل + جوہر بیداد۔ ظالم نگاہیں۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کی ظالم نگاہوں کو اپنے ظلم کا مظاہرہ کرنے کیلئے اب کوئی دوسری جگہ نہیں ہے تنہا میں تھا جو ان سرمگیں آنکھوں کے ظلم سہا کرتا تھا اس لئے میرے بعد معشوق نے آنکھوں میں سرمہ لگانا ترک کر دیا + شعر میں عرض کی رعایت سے جوہر کا لفظ لایا گیا ہے۔ یعنی بغیر عرض کے جوہر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

۶۔ ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

آغوش وداع ہے۔ رخصت ہونے کیلئے گلے مل رہا ہے + چاک۔ گریبان کا دھجیاں ہونا یا چاک ہونا۔

فرماتے ہیں کہ جنون محض میرے لئے دنیا میں آیا تھا میرے ساتھ وہ بھی رخصت ہو رہا ہے قبل اسکے کہ وہ روانہ ہو۔ اہل جنون سے گلے مل رہا ہے کہ دوستو خدا حافظ اب ہم چلے جب جنون اس

طرح رخصت ہو جائے تو پھر کپڑے کون چاک کریگا۔ اب کپڑوں کی دھجیاں نہ اڑینگی چاک بھی کرتے کے گریبان سے جدا ہو رہا ہے۔

۷۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حریف: مقابلہ کرنیوالا + مئے مرد افگنِ عشق: شرابِ عشق جو جوانمردے سے جوانمرد کو پچھاڑ دے۔

فرماتے ہیں میرے بعد ساقی دوسروں کو بلا رہا ہے کہ آئیں اور مئے مرد افگن عشق کا مقابلہ کریں۔ کوئی ہے مقابلہ کرنیوالا؟ ساقی کو اس صلا کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اور نہ کوئی مقابلہ کیلئے آگے آتا ہے۔ کچھ انتظار کے بعد ساقی مایوس ہو کر کہتا ہے کہ "کون ہوتا ہے" یعنی ایسا جگرہ دار کوئی نہیں جو تھا وہ تو چل بسا۔ پہلی صلا میں دعوتِ مقابلہ ہے اور مکرر وہی الفاظ ساقی کی زبان سے بہ تبدیل لہجہ نکلتے ہیں جس سے مایوسی ظاہر ہوتی ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں اس شعر کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

۸۔ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

فرماتے ہیں میں مرگیا اور میرے ساتھ مہر و وفا کا بھی جنازہ نکل گیا۔ اب رنج اس بات کا ہے کہ مہر و وفا کی تعزیت کرنیوالا دنیا میں کوئی نہیں۔

۹۔ آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے عشق کی سختیاں خندہ پیشانی سے برداشت کی تھیں اور اس کو اپنے پاس جگہ دی تھی تو وہ میں تھا۔ اس لئے اس نے بھی اپنا ٹھکانہ میرے گھر کو بنا لیا تھا اب میرے بعد دوسرا کون ہے جو اس بلا کو اپنے گھر جگہ دے۔ عشق کی اس بیکسی اور بے گھری پر مجھکو رونا آتا ہے۔

اس پوری غزل میں صرف ایک مختصر خیال ہے کہ "عاشق بجز میرے دوسرا کوئی نہیں" مگر استاد نے کس کس انداز سے اس کو باندھا ہے کہ ہر شعر میں ایک نیا خیال اور نیا مزہ معلوم ہوتا ہے

ردیف (ر)

غزل نمبر (۱)

۱۔ بلا سے ہیں جو بہ پیشِ نظر در و دیوار　　نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

در و دیوار = حجاب نظر + نگاہِ شوق = نگاہِ عارف

فرماتے ہیں کہ جو اشیاء و اشکال پیش نظر ہیں در و دیوار کی طرح دوسروں کیلئے حجاب نظر بنے ہوئے ہیں لیکن ہم عارف ہیں۔ یہی حجاب ہماری نظر کیلئے بال و پر کا کام دیتے ہیں اور ان ہی کے وسیلہ ہماری رسائی دوست تک ہو جاتی ہے۔

۲۔ وفورِ اشک نے کاشانہ کا یہ حال کیا　　کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

اشکوں کی زیادتی سے سیلاب آ گیا اور گھر منہدم ہو گیا۔ دیواریں گر کر دروازہ بن گئیں اور دروازے گر کر ڈھیر ہو گئے جو دیواروں کا کام دے رہے ہیں۔

۳۔ نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار　　گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

فرماتے ہیں کہ دیواروں کا سایہ جو دیواروں سے کچھ آگے نکل گیا ہے وہ سایہ نہیں ہے بلکہ خود دیوار و درِ دوست کی پیشوائی کیلئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

۴۔ ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مئے جلوہ　　کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

یعنی دوست کی گزرگاہ میں مئے دیدار کی کیا کمی۔ اس لئے اس کوچہ کے دیوار و در مست و بے حس و حرکت ہیں۔ دیوار و در کے سکوت و سکون کا باعث مئے جلوہ ہے۔

۵۔ جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ　　کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

سر = خیال + سودا = جنون + متاع نظر = انتظار کا سامان یا مال و دولت، سودا، دکان، متاع رعایات لفظی ہیں۔

شاعر رقیبوں کو دعوت دے رہا ہے کہ اگر کسی میں ہماری طرح معشوق کے انتظار کا حوصلہ ہی تو ہمارے گھر آئے اور انتظار کرے۔ انتظار کے متاع کی دوکان صرف ہمارے ہی در و دیوار ہیں۔ دوسری جگہ یہ جنس نہیں مل سکتی اس لئے کہ وہ ہر جائی ساری دنیا میں جاتا ہی۔ اگر نہیں آتا ہی تو صرف ہمارے گھر۔ پس انتظار کا لطف تو یہیں آسکتا ہے اور صرف یہیں انتظار کیا جاسکتا ہی۔

۶۔ وہ آرہا میرے ہمسایہ میں تو سایہ سے ‏ ‏ ‏ ‏ ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

فرماتے ہیں کہ دوست میرے پڑوس میں آرہا۔ زہے نصیب۔ میں اس پر فدا ہو رہا ہوں اور میرا گھر اس کے گھر پر نثار ہو رہا ہے۔ یعنی میرے گھر کے در و دیوار کا سایہ اس کے در و دیوار پر جا رہا ہی۔ اس سایہ کے ذریعہ وہ دوست کے گھر کی بلائیں لے رہا ہے اور تصدق ہو رہا ہے۔

۷۔ نظر میں کھٹکے ہی بن تیرے گھر کی آبادی ‏ ‏ ‏ ‏ ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھکر در و دیوار

مطلب یہ ہے کہ گھر میں سب کچھ ہیں مگر ایک تو نہیں ہے۔ ایسی آبادی ہم کو بھلی نہیں لگتی اور ہر وقت تیری یاد اور تیرے انتظار میں در و دیوار کو دیکھتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں۔

۸۔ ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

فرماتے ہیں کہ جب کبھی میں آمادۂ گریہ ہوا در و دیوار میرے پاؤں پر گر پڑے مطلب صرف اسقدر ہی کہ میں جب کبھی روتا ہوں تو معمولی رونا نہیں روتا۔ ہر گریہ کے ساتھ سیلاب آتا ہی اور در و دیوار منہدم ہو جاتے ہیں

۹۔ نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

فرماتے ہیں کہ سیلاب گریہ کے خیر مقدم سے جو مسرت حاصل ہوتی ہی وہ بے خود کر دیتی ہی اور حالتِ وجد میں ہر چیز رقص کرتی ہی چنانچہ در و دیوار بھی بوجہ سیلاب رقص کناں ہیں۔ سیلاب گریہ میں در و دیوار کے منہدم ہونے اور تیرنے کی شاعرانہ توجیہہ یہ ہے کہ خوشی سے ناچ رہے ہیں۔

۱۰۔ نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

فرماتے ہیں کہ اے غالب زمانہ میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو رازِ محبت کو چھپائے رکھ سکے اسلئے کسی سے رازِ محبت کہنا دانائی نہیں۔ البتہ در و دیوار میں راز پوشیدہ رکھنے کی صلاحیت ہی۔ اگر ان سے

کہا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

غزل نمبر (۲)

۱۔ گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

شعر طنزیہ ہے فرماتے ہیں کہ اے دوست تجھکو ہمیشہ یہ عذر رہا کرتا تھا کہ بغیر کہے ہمارے گھر کا پتہ کیسے چلے اور تو کیسے آئے حالانکہ یہ عذر غلط تھا تجھکو ہمارا گھر معلوم تھا محض ہم کو ستانے بہانے کرتا تھا۔ خیر۔ اب تو ہم نے تیرے در پر ہی اپنا مسکن بنا لیا ہے اور بغیر کہے یعنی تجھکو اطلاع دیئے بغیر۔ کیا اب بھی تجھکو یہ عذر ہو سکتا ہے کہ "بغیر کہے میں کیسے جانوں کہ تیرا گھر کہاں ہے"۔ شعر کا سارا لطف مصرعۂ اول کے "کہے بغیر" میں ہے۔

۲۔ کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

فرماتے ہیں کہ معشوق بڑا ستم ظریف ہے طرح طرح سے ستاتا ہے جب تک قوت گویائی تھی کسی وقت یہ نہ پوچھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اور جب ضعف بڑھ گیا اور قوت گویائی ختم ہوگئی تب کہہ رہا ہے کہ بن کہے میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں۔ اس سے زیادہ شرارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

۳۔ کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

فرماتے ہیں کہ مجھ کو ایسے شخص سے کام پڑا ہے جس کو دنیا ستمگر کے نام سے یاد کرتی ہے پھر ایسے آدمی سے کام نکلنے اور مہربانی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

۴۔ جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم — سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

فرماتے ہیں کہ ہمارا دل آئینہ کی طرح صاف ہے کسی سے ہم کو کدورت اور شکایت نہیں۔ ہماری خموشی اسی سینہ صافی کا نتیجہ ہے نہ کہ خوف کا۔ اگر دل میں کچھ میل ہوتا تو بے باکی سے اس کا اظہار کرتے

۵۔ چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

فرماتے ہیں کہ میں معشوق کا پوجنا نہیں چھوڑوں گا خواہ خلق مجھے کچھ ہی کہے۔ معشوق کو بت کہا جاتا ہے۔ چونکہ عاشق اس کی پرستش کرتا ہے اس لئے بت پرست ٹھہرا۔ بت پرست کو کافر کہا جاتا ہے

۶۔ مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مطلب یہ ہے کہ حسینوں کے ناز و انداز سے بھی دل گھائل ہو جاتا ہے اور دشنہ و خنجر سے بھی اس لئے گفتگو میں اور شاعری میں معشوقوں کے ناز و غمزہ کا دشنہ و خنجر سے استعارہ کیا جاتا ہے۔ اس استعارہ کے بغیر ناز و ادا کا اثر واضح نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی طرح مسائل تصوف میں معرفت اور دیدار حق سبحانہ سے بحث کی جاتی ہے لیکن یہ مسائل ایسے نہیں کہ دیگر علوم کی طرح برملا بیان ہوں۔ اس لئے ہر وقت تمثیل اشارہ، کنایہ، تشبیہ و استعارہ کی ضرورت واقع ہوتی ہے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً عارفانِ الٰہی جن کو مشاہدۂ ذات حاصل ہے خود فراموشی اور جذب کی حالت میں رہتے ہیں۔ بغیر بے خودی تجلیات کا نزول نہیں ہوتا بشراب سے بھی بے خودی طاری ہوتی ہے۔ اس لئے بجائے مشاہدہ، بادہ و ساغر کہنا پڑتا ہے۔

۸۔ بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

حضرت غالب کو اواخر عمر میں ثقل سماعت ہو گیا تھا۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے فرماتے ہیں کہ دنیا کا قاعدہ ہے۔ بہرے آدمی سے جب بات کرتے ہیں تو ایک ایک بات کو مکرر سکرر کہنا پڑتا ہے پس جب میں بہرا ہوں تو مجھ پر بھی دونا التفات چاہیئے۔ اس کے بغیر میں سن نہیں سکتا گویا کسی کا بہرا ہونا اس کے مستحقِ التفات ہونے کی دلیل ہے۔

۹۔ غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

فرماتے ہیں کہ اے غالب بادشاہ روشن ضمیر ہیں۔ بغیر کہے تیری سب حالت اُن پر روشن ہے ایسی صورت میں بار بار عرض حال کرنے سے کیا حاصل؟ درخواست اور استدعا کو موثر بنانے کا اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا۔

غزل نمبر ۳

۱۔ کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی طاقت دیدار پر رشک آ رہا ہے۔ اس کی یہ مجال کہ رُخ یار دیکھے اور جل کر
خاک نہ ہو جائے۔ غرض استاد نے رشک کی بھی انتہا کر دی۔ غیر پر تو سب جلتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ پر
رشک کرنا غالب ہی کا کمال ہے۔ شعر میں رشک کے علاوہ تفاخر اور اپنی طاقت دیدار کی تعریف بھی ہے۔

۲۔ آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے　　سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

مطلب ہے کہ جسطرح آتش پرستوں کے گھر میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے میرے سینے کی
آگ بھی روشن ہے۔ اس لئے ہر آہ کے ساتھ چنگاریاں نکل پڑتی ہیں۔ یہ دیکھ کر لوگ میرے سینہ کو
آتشکدہ اور مجھ کو آتش پرست سمجھتے ہیں۔

۳۔ کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا　　رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

رُکتا ہوں = رنجیدہ ہوتا ہوں، منقبض ہوتا ہوں۔

فرماتے ہیں کہ ظلم و جفا کے حقدار صرف عاشق ہیں۔ یہ عشق ہی کی شان ہے جو سخت سے سخت
اذیت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ بوالہوس ظلم و جفا کی تاب نہیں لا سکتے۔ اگر عشاق سے
ہٹ کر دوسروں پر جفا کی جائے تو وہ بلبلا اٹھیں۔ اور لوگ سمجھیں کہ یہ عاشق ہی ہیں جو ذرا سی بات
میں رو پڑے۔ غرض کم ظرفی کریں غیر اور آبرو جائے عاشقوں کی اس لئے میں تم کو رقیب پر ظلم کرتے
ہوئے دیکھ کر رنجیدہ ہوتا ہوں بجز میرے کوئی دوسرا دولتِ آزار کا مستحق نہیں۔

۴۔ آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے　　مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مطلب ہے کہ معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونے کی مدت سے تمنا تھی۔ خدا خدا کر کے اب وہ آمادہ
قتل ہوا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اب تو اپنی خوش بختی سے میں مطمئن ہو جاتا۔ اور تلوار ہلال عید کا نظارہ پیدا
کرتی۔ مگر ہم تو ٹھہرے پیدائشی بدقسمت یہ نصیب کہاں کہ اس کے ہاتھ سے قتل ہوتے اور دیرینہ آرزو
پوری ہوتی۔ معشوق کے ہاتھ میں تلوار دیکھتے ہی رشک کی آگ بھڑک اٹھی کہ تلوار کی یہ قسمت کہ اسکے
دستِ نازک سے مس کرے اور اس کی مصاحبت میں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قتل بھی نہ کرنے پایا تھا
کہ رشک نے ہمارا کام تمام کر دیا اور آرزوئے شہادت جوں کی توں باقی رہ گئی۔

۵۔ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موجِ مے تیری رفتار دیکھ کر

مینا ۔ شراب کی بوتل ۔

فرماتے ہیں کہ معشوق نے شراب خوب پی لی ہے جس کی وجہ سے چال میں مستانہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ معشوق کی اس مستانہ چال کو دیکھ کر عشاق تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے ہیں عشاق کے خون کی ذمہ داری معشوق پر اس لئے عائد نہیں ہو سکتی کہ وہ تو بے ہوش اور بے خبر ہے۔ پھر اس خون کا ذمہ دار کون ہے تو فرماتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری تمام تر گردنِ مینا پر ہے۔ اگر معشوق نے شراب پی ہوتی تو نہ چال میں مستانہ پن پیدا ہوتا اور نہ خلق خدا کا خون ہوتا۔ اب موجِ مے تیری رفتار اور عشاق کے خون کو دیکھ کر خوف سے لرز رہی ہے کہ دیکھئے اب کونسی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے۔

۶۔ وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

فرماتے ہیں کہ معشوق جفا پیشہ ہے۔ کسی حال میں وہ عشاق کو ستانا چاہتا ہے۔ جب اس نے ظلم کرنا شروع کیا تو ہم کو تکلیف کی بجائے مزہ آنے لگا۔ اُدھر وہ ظالم خوش کہ میں جفا کئے جا رہا ہوں اور اِدھر ہم دل ہی دل میں خوش کہ آزار میں لذت مل رہی ہے لیکن خدا بھلا کرے حرص کا کہ ہم نے معشوق سے ظلم میں کچھ اضافہ کی خواہش کی۔ وہ طرار ہمارے دل کی پا گیا۔ اور دفعتاً ظلم سے ہاتھ کھینچ لیا۔

۷۔ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

عیار ۔ کسوٹی ــــــ قاعدہ ہے کہ چاندی اور سونے کو کسوٹی پر گھس کر دیکھتے ہیں اگر معیار پر پوری اُترے تو اس سے اشیاء کا تبادلہ کیا جاتا ہے ورنہ کھوٹا سکہ واپس کر دیا جاتا ہے۔

شعر کا مطلب ہے کہ ہم بھی اپنا کلام سننے والوں کو پرکھتے ہیں۔ اگر کسی میں سخن فہمی اور قدر شناسی کا جوہر اور کامل عیار پاتے ہیں تو دل کھول کر اس کو اپنا کلام سناتے ہیں اور اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں کم سواد اور کج فہموں کے لئے متاعِ سخن کی دوکان بند رہتی ہے۔

۸۔ زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ دے رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

شعر کا ظاہری منشا تو بالکل واضح ہے کہ عشاق حسنِ معشوق کی پرستش کرتے ہیں ان کو

تسبیح وسجادہ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا چونکہ معشوق کو بت بھی کہتے ہیں اس لئے عاشق بت پرست ٹھیرا۔ بت پرستی کے لوازم سے زنار بھی ہے۔ اس لئے آپ عشاق کو دعوت دے رہے ہیں کہ تم بھی تسبیح توڑ دو اور زنار باندھ کر بت پرست بن جاؤ۔ اگر اس شعر کا یہی مفہوم لیا جائے تو غالب مغلوب سا ہو جائے گا۔ کوئی بات ٹھکانے کی نہیں معلوم ہوتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس شعر کے ذریعہ عرفان اور خدارسی کی ایک تعلیم دی جارہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ لوگ مختلف طریقوں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں۔ نماز ہے۔ روزہ ہے، اوراد و وظائف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو اور اس تک رسائی ہو جائے۔ یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر ان سب راستوں سے زیادہ ہموار اور قریب ترین راستہ منزلِ مقصود کا وہ ہے جو اہلِ باطن یا اولیاء اللہ نے بتلایا ہے۔ اور وہ راستہ پاسِ انفاس ہے زنار باندھ سے منشا یہ ہے کہ تارِ نفس کی حفاظت کر ایک بھی سانس ضائع ہونے نہ دے۔ ظاہر ہے کہ تارِ نفس اور زنار میں مشابہت ہے۔

۹۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

فرماتے ہیں کہ صحرا نوردی سے پاؤں میں آبلے آ گئے تھے۔ ان آبلوں کے علاج کی فکر لاحق تھی کہ یکایک سامنے کا راستہ پرخار نظر آیا۔ اب تو فکر جاتی رہی اور دل خوش ہو گیا کہ کانٹے خود بخود ان آبلوں کا علاج کر دیں گے۔

۱۰۔ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

بظاہر شعر کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کو ہماری محبت کا اعتبار نہیں۔ ہم تو اس پر مرمٹے ہیں اور اس کی یاد میں ایسے مستغرق رہتے ہیں کہ ہم کو کسی چیز کی خبر نہیں۔ حتیٰ کہ گھر کی دیکھ بھال کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ہر چیز گرد آلودہ اور زنگ آلودہ ہو گئی ہے جو ہمارے عشق کی دلیل ہے لیکن ظالم کی بدگمانی کی انتہا تو دیکھئے زنگ آلود آئینے کو دیکھ کر طوطی کا عکس سمجھ رہا ہے اور نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اس کو ہماری محبت کیوں ہونے چلی تھی۔ ہماری یاد کی بجائے اس کے اسباب تفریح کچھ اور ہیں دیکھئے

دل بہلانے جناب نے طوطی بھی پال رکھا ہے۔

۱۱۔ گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

فرماتے ہیں کہ جس بار کو آسمانوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اگر طور جیسے معمولی پہاڑ پر ڈالا جائے تو وہ کیسے برداشت کرے۔ طور برق تجلی کے لئے صحیح مقام نہیں تھا۔ اس بار امانت کو اٹھانے کی صلاحیت صرف انسان میں ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جو اس کی تاب لا سکے۔ پھر شاعرانہ ناز و شوخی کیساتھ جناب باری سے عرض کرتے ہیں کہ برق تجلی ہم پر گرنی تھی نہ کہ طور پر۔ بادہ خوار کے حوصلے اور ظرف کے لحاظ سے شراب دی جاتی ہے۔ طور میں یہ حوصلہ کہاں کہ اس شراب کو برداشت کر سکتا۔

مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں "یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے"

۱۲۔ سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا — یاد آگیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر

فرماتے ہیں کہ غالب شوریدہ حال تیری اسی دیوار سے سر پھوڑ کر مر گیا۔ جب کبھی میں تیری دیوار دیکھتا ہوں وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے اور اسکی شوریدہ سری اور دیوار سے سر ٹکرانے کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے۔

غزل نمبر ۱۴

۱۔ لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

مہر درخشاں کی بزرگی، شان و شوکت، جاہ اور جلال کی کوئی حد نہیں۔ اسی طرح اس قطرۂ شبنم کی جو کانٹے کی نوک پر ہو بے بضاعتی اور بے مایگی کی بھی کوئی حد نہیں۔ جب ایسی عظیم الشان ہستی اس حقیر ترین قطرۂ شبنم پر توجہ فرمانے کی زحمت گوارا کرے اور اپنی تنویر سے پہلے تو اس کو منور کر دے اور پھر اس کے حقیر وجود کو لطافت میں مبدل فرما دے تو کیسا احسان عظیم ہے۔ اس احسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خیال کے ساتھ ہی دل لرز جاتا ہے۔ کہاں ایک قطرۂ حقیر اور کہاں مہر درخشاں اور اسکی زحمت فرمائی۔ مہر درخشاں استعارہ ہے ذاتِ باری سے۔

۲۔ نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں حضرت یوسفؑ کے فراق میں رونے کی وجہ سفید ہو گئی تھیں اور نور چشم جاتا رہا تھا۔ یہی نور چشم زندان زلیخا میں منتقل ہو گیا اور زندان کو منور اور سفید کر دیا۔

شاعر کہتا ہے کہ جب تک نور یعنی حضرت یوسفؑ کنعان میں رہے۔ خانۂ یعقوبؑ یا دیدۂ یعقوب کا نور بنے رہے اور جب زندان زلیخا میں قید کر دیئے گئے تو زندان کو بھی منور کر دیا۔ گویا دیدۂ یعقوب کی سفیدی ہی زندان کی رونق کا باعث ہو گئی۔

۳۔ فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

فنا تعلیم درس بے خودی = بے خودی کے سبق سے فنا کی تعلیم حاصل کرنیوالا۔ لام + الف = لا + دبستان = مکتب سلوک کی ابتدائی تعلیم اپنے وجود کی نفی ہے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ورد سے کی جاتی ہے۔

اب شعر کا مطلب ہوا کہ جس زمانے میں مجنوں طفل مکتب تھا اور عشق اور بے خودی کا ابجد خوان۔ میں فنائیت اور بے خودی کی تعلیم میں کامل بلکہ اکمل ہو چکا تھا۔ مجنون عشق و بے خودی کا درس مجھ سے ہی لیا کرتا تھا۔ لیکن کافی شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسلئے مدرسہ کی دیواروں پر لام + الف لکھتا پھرتا تھا۔ آخر بچہ ہی تو تھا۔

۴۔ فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

تشویش = فکر، جستجو + مرہم = زخموں کے ٹکڑوں کو یکجا اور مندمل کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دل معشوق کے ناز و ادا یا جور و ستم سے یا کسی اور وجہ سے پارہ پارہ ہو گیا ہے ان پاروں کو یکجا کرنے کی تدبیر یہ کی گئی کہ ان کے سامنے نمکدان لا کر رکھدیا گیا۔ لیکن یہ علاج اس لئے کارگر نہ ہو سکا کہ ہر پارۂ دل تنہا پورے نمکدان پر قبضہ کر کے اس سے لذت اندوز ہونا چاہتا تھا۔ آخر دل عاشق کے ٹکڑے تھے ایک نمکدان سے سب کی سیری کیسے ہوتی۔ کان نمک بھی ہوتی تو نا کافی تھی اس لئے پارہ ہائے دل میں صلح نہ ہو سکی اور افتراق باقی رہا۔ اب ان کو جوڑنے کے لئے مرہم کی جستجو کرنی پڑی۔ اگر یہ کمبخت نمکدان پر صلح کر لیتے تو مجھے یہ زحمت اٹھانی نہ پڑتی اور سب نمکدان میں یکجا ہو جاتے

۵۔ نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا کہ پشت چشم سے جس کے نہ ہوئے مہر عنواں پر

اقلیم الفت ۔سلطنت عشق ۔طومار ناز ۔ ناز کا دفتر ۔پشت چشم ۔ بے مہری بے وفائی ۔سلطنت عشق میں دفتر ناز وادا ' غمزہ و عشوہ کا ہی ہوتا ہے ۔

فرماتے ہیں کہ اقلیم الفت میں جتنے دفتر ہیں ان کے سرورق پر بے وفائی کی مہر ثبت ہے ۔مطلب صرف اس قدر ہے کہ "معشوق کی کوئی ادا بے وفائی سے خالی نہیں ۔"

۶۔ مجھے اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا   کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

شام کا وقت ہے ۔محبوب کے ساتھ چمن میں ٹہل رہے ہیں ۔راز و نیاز اور محبت و پیار کی باتیں ہو رہی ہیں ۔عاشق اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہے کہ دفعتاً اس کی نظر آسمان کی طرف اٹھی اور شفق کی سرخی مسکراتی نظر آئی ۔آپ معشوق سے شفق کو بتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھئے شفق آج کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے لیکن اس سے پہلے جب کبھی سیر گلستان کو آیا اور آپ سے ملاقات نہ ہوئی تو یہی چمن میرے لئے دوزخ تھا اور یہی شفق گلستان پر آگ برسایا کرتی تھی ۔

۷۔ بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا   قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پرواز شوق ناز ۔شوق ناز کی پرواز

روز قیامت حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے جس سے سخت آندھیاں چلیں گی اور سب مردے زندہ ہو کر قبروں سے نکل آئیں گے لیکن جب یہی تند و تیز ہوا شہیدوں کی قبروں پر چلیگی تو ان قبروں سے کوئی بر آمد نہ ہوگا ۔ وہ تو پہلے ہی شوق بن کر واصل بہ جانان ہو چکے ہیں ۔اس لئے شہیدان ناز قیامت کی دار و گیر سے بے فکر ہیں ۔اب صرف پرواز شوق کے کچھ آثار ہوں تو ہوں ان کے لئے قیامت ایک طوفانی ہوا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔

۸۔ نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی   ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

فرماتے ہیں کہ ناصح ہم کو عشق و جنون سے منع کر رہا ہے ۔مگر نصیحت کا طرز نہایت سخت اور لہجہ نہایت درشت گویا ہم اس کے غلام اور محکوم ہیں اور وہ ہم پر زور چلا رہا ہے ۔ ناصح کے اس طرز عمل سے ہماری وحشت میں اضافہ ہو گیا اور چاہتے تھے کہ اس سے دست و گریبان ہو جائیں

لیکن خیال آیا کہ ناصح سے کیا لڑیں اگر اس نے ہم پر زور چلایا تو مضایقہ نہیں۔ ہمارا بھی تو آخر اپنے گریبان پر زور چلتا ہے۔ کیوں نہ گریبان کے پُرزے اڑا کر وحشت کا علاج کریں۔ یہ تو اپنی اختیاری بات ہے۔ اور پھر ناصح پر بھی اسکی نصیحت کا اثر واضح ہو جائیگا۔

غزل نمبر ۵

۱۔ ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور　　کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

اشارہ ؛ ادا، انداز۔ نشان ؛ مطلب، معنی۔ اور ؛ دوسرا، الٹا

فرماتے ہیں کہ معشوق کیا ہے فریب و طلسم کا ایک پتلا ہے۔ بھلا اس کو ہمارے سوا اور کون ہے جو سمجھ سکے۔ اس کی ہر بات اور ہر ادا کا مطلب الٹا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر وہ اظہار محبت کرے تو یقین مانئے کہ اس کو نفرت ہے اور زیادہ ظلم ڈھانا چاہتا ہے اگر وہ وعدے کرے کہ میں ضرور آؤں گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ یقیناً نہیں آئیگا۔ وَقِس علیٰ ھٰذا۔

۲۔ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

سمجھنا ؛ ماننا + فرماتے ہیں کہ ایک مدت سے میں التجا کئے جا رہا ہوں۔ عاجزی کرتا ہوں خوشامد کرتا ہوں پر وہ میری بات مانتے نہیں اس سے ثابت ہوا کہ میری زبان میں ہی اثر نہیں۔ اگر مجھ کو اثر والی زبان نہیں مل سکتی تو پھر اے مقلب القلوب! ان کا دل پھیر دیجئے کہ وہ مجھ پر مہربان ہو جائیں اور میری بات مان لیں۔ یادگار غالب میں مولانا حالی نے لکھا ہے "یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔"

۳۔ ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند　　ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

ابرو ؛ معشوق کی ابرو کو عموماً شعراء کمان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ نگہ ناز ؛ ایسی نظر جو ناز و ادا سے ڈالی جائے۔ پیوند ؛ تعلق، رشتہ۔ مقرر ؛ یقیناً، ضرور۔ اس شعر میں استاد نے اپنا کمال استادی ظاہر کیا ہے۔ تیر کو کمان میں جوڑ کر سامنے رکھدیا مگر "اور" کا منتر اس طرح پڑھا کہ تیر تو سب کو نظر آتا ہے مگر کمان کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کسی کی نظر بجز اہل نظر کے اس کمان پر نہیں پڑتی۔

مطلب یہ ہے کہ عام طور پر شعرا ابرو کو کمان اور نظر کو تیر باندھتے آئے ہیں۔ مگر شاعر کہتا ہے کہ ابرو سے تیر نظر کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں۔ معشوق کی نظر تیر ضرور ہے لیکن یہ تیر کمان ابرو سے نہیں نکلتا بلکہ اس تیر کی کمان اور ہے۔ "وہ" اور "یعنی کمان "ناز" ہے۔ نگہ ناز ہی تیر کا کام کرتی ہے نہ کہ محض نگہ۔ اس شعر کے ذریعہ غالب نے صدہا سال کی مسلمہ اور مقبول عام تشبیہہ کو کس آسانی اور کس انداز سے غلط محض ثابت کیا ہے اور دلیل کتنی صحیح ہے۔ داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

۴۔ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جان اور

فرماتے ہیں کہ اے دوست تمہاری موجودگی میں دل و جان کی کچھ کمی نہیں۔ ہزاروں دل گلی گلی پڑے ملیں گے جن کو عشاق نے گم کر دیا ہے اور ہزاروں جانیں بہت ہلکی قیمت میں بلکہ مفت ہی مل جائیں گی۔ اس لئے کہ سب عشاق اپنی جانوں سے بیزار ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو اپنا ایک دل اور ایک جان جانیکی فکر ہی کیا۔ جب جی چاہا بازار گئے اور بہت سے دل اور جان خرید کر لائے۔

۵۔ ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گران اور

بت شکنی = غیر اللہ کی نفی کرنی۔ سبک دست = چالاک، مشاق۔

" اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے۔ یعنے جب تک ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سد راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔" (از یادگار غالب)

۶۔ ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

فرماتے ہیں کہ خون جگر کا طوفان جوش میں ہے خون جگر بہہ جائے تو طوفان تھمے اور سکون نصیب ہو لیکن اس طوفان کے خارج ہونے کے لئے صرف دو آنکھیں کافی نہیں۔ اس لئے دل کھول کر خون نہیں بہا سکتے۔ ہاں اگر اور کئی دیدہ خون بار ہوتے تو دل کھول کر روتے، جگر کا خون بہہ جاتا، طوفان تھم جاتا اور مجھکو سکون حاصل ہوتا ہمیشہ روتے رہنے کی کیا اچھی توجیہہ ہے۔

۷۔ مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند سر اڑ جائے جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

مجھے اپنے قتل ہونے اور سر اڑنے کی کوئی فکر نہیں میں تو اس کی آواز کا شیدائی ہوں۔ جو کہہ رہا ہے" ہاں اور" سر اڑنے کی تکلیف سے کہیں زیادہ اس ہاں اور" ہیں لطف آرہا ہے۔

۸۔ لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا   ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

فرماتے ہیں کہ میرے سینہ میں ہزاروں داغ ہیں اور ہر داغ اپنی تابناکی میں خورشید جہاں تاب کا ہمسر ہے۔ ہر روز ایک نیا داغ دکھاتا ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ آفتاب ہے جو روزانہ طلوع ہو رہا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے سینہ میں صدہا راز ہائے عشق پوشیدہ ہیں۔ ہر روز ایک نیا نکتہ لوگوں کے سامنے رکھتا ہوں جس سے دنیائے خیال منور ہو جاتی ہے۔

۹۔ لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین   کرتا جو نہ مرتا۔ کوئی دن آہ وفغاں اور

فرماتے ہیں کہ اے دوست اگر تم پر عاشق نہ ہوا ہوتا تو کوئی دم چین لیتا۔ دل دینے کے بعد چین کہاں۔ جب تک زندہ رہا آہ وفغاں کرتا رہا۔ البتہ موت نے مجھے سکون و چین دیا۔ اگر اور زندہ رہتا تو وہی آہ وفغاں کرتے گذرتی۔

۱۰۔ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے   رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

" نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالے۔ مثال کس قدر مثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقعہ کے ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔" (از یادگار غالب)

۱۱۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے   کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب نے شاعری کی پرانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ ایک نیا اسلوب نئی اصطلاحات نئی تراکیب نئے پیمانے، نئے خیالات ایجاد کر لئے۔ اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر اس شان سے کہ دوسرے اساتذہ کے کمال فن کا اعتراف بھی ہو اور اپنی برتری کا پہلو نکل آئے۔

غزل نمبر ۶

۱۔ صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

ساکن پانی اور آئینہ میں لحاظ صفائی مشابہت ہے سکون، حیرت کی علامت ہے۔ اس لئے ساکن پانی میں بھی صفت حیرانی ہے اور اس کے مشبہ بہ یعنی آئینہ میں بھی گویا ہر دو ساکن و حیران ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ سکون اور حیرانی کوئی اچھی چیز نہیں۔ ٹھہرا ہوا شفاف پانی کچھ عرصہ بعد سڑ کر اپنا مزہ اور رنگ بدل دیتا ہے۔ اسی طرح آئینہ کی حیرانی بھی اس کی صفائی کو زنگ میں بدل دیتی ہے یہی حال افراد و اقوام کا ہے۔ اگر یہ ساکن و حیران ہیں تو ان میں بھی سڑاہند اور خرابی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ ان کا عروج پستی سے اور ان کی چمک خیرگی سے بدل جاتی ہے۔ پس اگر آسمان شہرت کے تابناک تارے بننا چاہو تو سکون کی بجائے حرکت اور حیرانی کی بجائے سعئ مسلسل کی ضرورت ہے۔

۲۔ نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

فرماتے ہیں کہ وحشت میرے خمیر میں قدرت نے ودیعت کر رکھی ہے جس طرح ہرن کی طبیعت میں رمیدگی اور وحشت فطری ہے بھلا اس کا علاج کیسے ہو؟ قید و بند کی تدبیر کارگر نہ ہوئی وہاں بھی وحشت رہی۔ آزاد رکھا گیا تو بھی وحشت نے سر وسامانی سے علاج کیا گیا پھر بھی وحشت۔ آخر تنگ آ کر یاروں نے سامانِ عیش و نشاط، جاہ و حشم مہیا کیا کہ کم از کم ان اسباب تعیش کو دیکھ کر خوش ہوگا اور وحشت دور ہو گی چنانچہ جام زمردیں میں شراب پیش کی گئی میں وحشی صفت جام زمرد سے اس طرح گھبرا کر صحرا میں بھاگ گیا جس طرح ہرن چیتے سے گھبرا کر چوکڑیاں بھرتا ہوا فرار ہوتا ہے۔

غزل نمبر ۷

۱۔ جنوں کی دست گیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

گریباں چاک = چاک گریباں، یعنی عریانی۔

فرماتے ہیں کہ جنوں کی دستگیری کرنے والا بجز عریانی اور کوئی نہیں۔ بحالت جنون گریباں چاک کر کے کچھ تسکین حاصل کر لیتا ہوں گویا عریانی ہی میرے جنون اور وحشت کا علاج کرتی ہے۔ اس لئے اس کا احسان ہمیشہ میری گردن پر رہے گا۔

۲۔ برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ اک طپیدن پر

غالب کی ہر بات انوکھی ہے اس کے پیمانے نرالے اس کی گنتی بھی نئی۔ ہزار آئینہ دل = ہزار دل لفظ آئینہ زائد ہے جسطرح ہزار زنجیر فیل، ہزار دانہ انبہ، ہزار راس میش، ہزار نفر سپاہی وغیرہ میں۔ زنجیر، راس، دانہ اور نفر زاید ہے۔ بالِ اک طپیدن = بال زائد ہے۔ طپیدن کو ہی بال فرض کرلیا گیا ہے۔ دل اور آئینہ میں حیرانی اور صفائی مشترک ہے۔ اس لئے استاد نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دل اور آئینہ کو ایک ہی چیز فرض کرلیا ہے۔ اسی طرح مرغ بسمل کے بال ہیں اور نفسِ طپیدن میں تڑپ مشترک ہے۔ اس لئے یہ دونوں بھی ایک ہوئے۔ نیرنگ بے تابی۔ فسونِ بے تابی یعنی بیتابی نے جادو کیا ہے۔

اب شعر کا مطلب ہوا کہ جس طرح آگ سے کاغذ پیچ و تاب کھاتے ہوئے جلتا ہے۔ مجھے بھی بیتابی تڑپاتی ہے چونکہ بیتابی غیر معمولی شدت کی ہے۔ اس لئے تڑپ بھی غیر معمولی ہے۔ میری ایک تڑپ عاشقوں کے ہزار دلوں کی تڑپ کے برابر ہے۔ گویا بے تابی نے ذریعہ فسون میری ایک تڑپ میں ہزار دل باندھ دئے ہیں۔ جو تڑپ رہے ہیں۔

۳۔ فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

عیش رفتہ کی متاع بُردہ سے تمثیل اپنی نظیر آپ ہے۔ عیش رفتہ = گذری ہوئی خوشیاں جیسے جوانی کا عیش پیری میں یا خوش حالی کا دور عسرت میں رفتہ ہیں۔ متاع بردہ = چوری گیا ہوا مال۔

"متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع، یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔" (یادگار غالب)

۴۔ ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

رنج آشنا = بات بات پر خفا ہونے والا۔

فرماتے ہیں کہ ہم کو ایسے بدگمان ظالم سے سابقہ پڑا ہے کہ جس کی بدگمانی کی دنیا میں نظیر نہیں بلا وجہہ بات بات پر بدگمان ہوتا اور بگڑ جاتا ہے۔ حجرے کے جھروکوں سے جب شعاعیں آتی ہیں تو سمجھتا ہے

کہ جھروکہ آنکھ اور شعاعیں تارِ نظر ہیں جو تاک جھانک میں معروف ہیں۔ بدگمانی اور بلاوجہ خفگی کی کوئی
حد بھی ہے؟ ایسے ظالم سے سابقہ پڑا ہے صرف ہمارا ہی دل و گردہ ہے جو نباہ رہے ہیں۔

۵۔ فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ۔۔۔ فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

فروغ۔ روشنی، درخشندگی۔ طالع۔ قسمت۔ گلخن۔ بھاڑ، چولہا۔

فرماتے ہیں کہ اگر تو اپنی حقیقت جاننے کا مشتاق ہے تو اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اُس وقت تجھ
کو اپنی حقیقت سے آگاہی ہو گی اور معلوم ہو گا کہ تیرا مرتبہ کیا ہے۔ دیکھ کہ خاشاک یعنی گھاس پھوس کیسی بے
مقدار اور حقیر چیز ہے لیکن جب یہ اپنے آپ کو فنا کے حوالے کر دیتا یعنی آتش دان میں جھونکا جاتا ہے
تو شعلہ بن کر بلند ہوتا اور آس پاس کی چیزوں کو بھی منور کر دیتا ہے گویا آگ میں پڑنا اس کی عین خوش
قسمتی ہے اس لئے تو بھی اپنی خودی کو خاکستر کر کے اپنی قسمت کو چمکا دے۔

۶۔ اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے ۔۔۔ کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

فرماتے ہیں کہ اسدؔ بھی عجیب بسمل ہے خود گھائل ہو کر تڑپ رہا ہے اور قاتل سے بار بار کہہ رہا ہے کہ
ایسے ہی وار اوروں پر بھی کئے جا یعنی مشقِ ناز بار بار ہو۔ اس میں بڑی حلاوت ہے۔ اگر اس مشق میں
ہزاروں لاکھوں جانیں تلف ہو جائیں کوئی حرج نہیں تو اس کا اندیشہ نہ کر یہ سب خون میں اپنی گردن
پر لیتا ہوں پھر تجھے کیا خوف ہے مشقِ ناز کئے جا۔

غزل نمبر ۸

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں ۔۔۔ تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

فرماتے ہیں کہ میں مصلحت سے تیرے ظلم اٹھائے جا رہا ہوں اس لئے کہ تجھ پر بہت سے حسین بھی عاشق
ہیں۔ سچی بات کہنے میں پس و پیش کس بات کا ہے۔ اب ہم تجھ سے مایوس ہو چکے۔ تجھ کو تو حاصل کرنا
ممکن نہیں البتہ جہاں تیرے دیدار کیلئے صد ہا مہ جبین آتے ہیں ان میں آخر کوئی نہ کوئی تیرے
لگ بھگ نکل ہی آئیگا۔ بس اسی سے محبت کرنے لگیں گے۔ تیرے ظلم سہنے میں یہی مصلحت ہے۔ تو نہ
سہی تجھ سا رقیب ہی سہی۔

غزل نمبر (۹)

۱۔ لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور   تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ درحقیقت ایک نوحہ ہے جو زین العابدین خاں عارف کے انتقال پر لکھا گیا تھا عارف مرزا صاحب کی بی بی کے بھانجے تھے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ "زین العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجہ کا تعلق تھا کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے اسی لئے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گذرا۔ مرزا نے ان کے مرنے پر ایک غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے" (یادگار غالب)

فرماتے ہیں کہ اے جواں مرگ تم نے میرے مرنے کا انتظار نہیں کیا اور چل بسے چاہیئے تو یہ تھا کہ میرے بعد تم آتے خیر اب تنہا گئے ہیں اور چند روز تنہا رہو اس کے بعد میں تو آنے والا ہی ٹھہرا

۲۔ مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا   ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

فرماتے ہیں کہ تیرے سنگ مزار پر اور چند روز ناصیہ فرسائی کرتا رہوں گا حتیٰ کہ سر مٹ جائے "تیرا پتھر نہ گھسے گا" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میری زندگی کے تھوڑے ہی روز باقی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اثناء میں پتھر تو گھس نہیں سکتا البتہ سر کا مٹ جانا یقینی ہے۔

۳۔ آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں   مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

فرط الم میں فرماتے ہیں کہ تم کل ہی تو آئے تھے یعنی اس دنیا میں آئے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری اور آج جانے کی اجازت مانگ رہے ہو۔ خیر ہمیشہ نہ سہی اور چند روز تو رہ جاتے۔

۴۔ جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے   کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

فرماتے ہیں کہ تم جو یہ کہہ کر جا رہے ہو کہ اب قیامت کے روز ملاقات ہوگی۔ کیا قیامت کا دن کوئی دوسرا ہے میرے لئے تو تمہارا رخصت ہونا ہی قیامت ہے۔

۵۔ ہاں اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارف   کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

فرماتے ہیں اے ظالم کہنہ مشق فلک تو نے عارف کی جدائی سے ہم پر ایک بڑا ظلم کیا۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ عارف ابھی جوان تھا۔ اگر وہ اس وقت نہ مرتا اور کچھ مدت کے بعد گذرتا تو اس میں تیرا کیا نقصان تھا تو دوسرے ظلم کیئے جاتا۔ تیرے لئے مظالم کی کچھ کمی نہ تھی۔ بعد میں عارف کو اٹھاتا۔

۶۔ تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

مطلب یہ کہ چاند شباب کو پہنچنے کے بعد یعنی ۱۴ تاریخ سے بتدریج گھٹتا ہے دفعتاً غائب نہیں ہو جاتا۔ سلخ ماہ سے دو چار روز پہلے تک اس کی کچھ نہ کچھ روشنی دنیا کو منور کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عارف تم چودہویں کا چاند تھے میرا گھر تم سے روشن تھا اور کچھ مدت تمہاری روشنی گھر کو منور کرتی رہتی تم نے دفعتاً میرے گھر کو بے نور کر دیا اور چلدئے۔

۷۔ تم کونسے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دن اور

یعنی انسان کی جان ایک امانت ہے۔ یہ امانت مالک حقیقی کو لوٹائی جانی ضروری ہے لیکن قرض یا امانت کئی بار کے تقاضے کے بعد بدیر بھی دیا جا سکتا ہے۔ پہلے ہی تقاضے پر ادائی کچھ ضروری نہ تھی

۸۔ مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشہ کوئی دن اور

نیر۔ نواب احمد ضیاء الدین خاں، فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ استاد کے خاص شاگردوں میں اور نہایت صاحب کمال تھے۔ مرزا صاحب کی بیوی ان کی حقیقی چچازاد بہن تھیں اس لحاظ سے عارف مرحوم ان کی چچازاد بہن کے صاحبزادہ تھے۔ بلحاظ رشتہ و باعتبار عارف کی خوش گوئی کے عارف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ نفرت اور لڑائی کے الفاظ شعر میں بطور شکوہ کے لائے گئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تم کو مجھ سے اور نیر سے بڑی محبت تھی۔ محبت کا اقتضا یہ تھا کہ ہم کو چھوڑ کر نہ جاتے۔ اگر تھوڑی دیر کیلئے یہ فرض کر لیا جائے کہ تم ہم دونوں سے روٹھ گئے تھے۔ اچھا ہم اس کو تسلیم کر لیتے ہیں مگر بچوں نے تو کچھ قصور نہیں کیا تھا اور کچھ مدت رہ کر ان کا کھیل کود اور تماشہ دیکھتا تھا۔

۹۔ گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش کرنا تھا جوانمرگ گذارا کوئی دن اور

فرماتے ہیں کہ تم جتنے بھی دن دنیا میں زندہ رہے بلحاظ حالات کبھی خوش رہے اور کبھی رنجیدہ

بہرحال یہ مدت کسی طرح کٹ گئی، اگر اور بھی چند روز اسی طرح گذارا کرتے تو اس میں کیا قباحت تھی۔ زمانہ کی نیرنگیوں سے گھبرا کر کیوں چلے گئے۔

۱۰۔ ناداں ہو جو کہتے ہو کہ جیتے ہو کیوں غالبؔ　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فرماتے ہیں کہ احباب مجھ پر طعن کرتے ہیں کہ عارف کے ساتھ تم بھی کیوں نہیں مر گئے، زندہ کیوں ہو۔ یہ کہنے والے نادان ہیں۔ مشیت ایزدی کی انھیں خبر نہیں۔ موت اور حیات دونوں انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ اگر موت ہمارے اختیار میں ہوتی تو آج ہی مر جاتے۔ کیا موت کی تمنا اس سے بڑھ کر اور کوئی دوسرا اسباب ہو سکتا ہے؟ کیا میری قسمت میں موت کی آرزو کرنے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی صدمہ لکھا گیا ہے جس دن کا میں انتظار کروں؟ مصرعۂ ثانی استفہام انکاری ہے اور بطور طنز کہا گیا ہے۔

ردیف ز

غزل نمبر ۱۱

۱۔ فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر　　ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

فارغ = بے فکر + صبحِ مہر = باضافت مقلوب مہر صبح + جیب = گریبان

فرماتے ہیں کہ مرنے پر بھی سوزِ عشق باقی ہے۔ داغِ عشق اب بھی گریبانِ کفن کو آگ لگا کر روشن کر رہا ہے یعنی کفن کی سفیدی اور رونق بوجہ داغ عشق ہے۔ جس طرح صبح کی سپیدی کا باعث مہر ہوتا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے کفن کی سفیدی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو سپیدۂ صبح اور داغ عشق کو مہر سے تشبیہ دی ہے اور کفن کی سپیدی اور زینت کا باعث داغ عشق کو ٹھرایا ہے۔

بعض نسخوں میں صبح و مہر ہے۔ اس صورت میں بھی مفہوم بالکل یہی ہوگا یعنی میں مرنے کے بعد بھی سوزِ عشق سے فارغ نہیں ہوں بلکہ داغِ عشق سینے کو منور کئے ہوئے ہے۔ جیب کفن کی زینت اسی کا نتیجہ ہے۔ جس طرح صبح کی سپیدی کا باعث مہر ہے۔

۲۔ ہے نازِ مفلسان زرِ از دست رفتہ پر　　ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

فرماتے ہیں کہ گردش زمانہ سے مفلس ہونے پر بھی دماغ سے امارت کی بو باس نہیں جاتی وہی امیرانہ ناز اور امیرانہ خیالات باقی رہتے ہیں۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ جوانی اور جوانی کے ولولے تو جاتے رہے لیکن جوانی کی شوخی اور زندہ دلی باقی ہے۔ گویا سرمایۂ جوانی تو ختم ہوگیا پر جوانی کے خیالات باقی ہیں۔ اور اشعار کے ذریعہ ان شوخیوں کی گلفروشی کی جاتی ہے۔ داغ کہن سے مراد عشق ہے جواب پرانا ہوگیا۔

۳۔ میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں　　خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

خمیازہ ۔ انگڑائی + بیداد فن ۔ جس کا پیشہ اور ہنر ظلم ہو۔

فرماتے ہیں معشوق بڑا ہی بیداد فن ہے۔ انگڑائیوں سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہے اس کی انگڑائی میں غضب کا ناز اور بلا کی ادا ہے۔ اس کی یہ ادا دل اور جگر کو تڑپا رہی ہے دل چاہتا ہے کہ خوب خون بہائیں مگر افسوس کہ جگر میں ایک قطرۂ خون بھی نہیں۔ اگر خون ہوتا تو اس بیداد گر کی تسکین و تواضع کرتے۔ (خمیازہ کی رعایت سے میخانہ کا لفظ لایا گیا ہے)

یا

جگر میں جس قدر خون تھا معشوق کی بیداد کی نذر ہو چکا۔ خوب روئے۔ پھر بھی اس ظالم کے ظلم کی تشنگی نہیں گئی۔ انگڑائیاں لے رہا ہے۔ لیکن جگر میں خون ہی نہیں۔ کشمکش میں ہیں کہ اسکی تواضع کس طرح کریں۔ خون ہوتا تو خوب روتے۔ وہ مسرور ہوتا اور انگڑائی جاتی رہتی۔

غزل نمبر (۲)

۱۔ حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

حریف ۔ دوست، کام بنانے والا، مقابلہ کرنے والا + فسون نیاز ۔ عاجزی، منت، دعا۔

فرماتے ہیں کہ ہم نے مشکلات کے حل کے لئے فسون نیاز سے کام لیا۔ لیکن ہماری کوئی مشکل حل نہیں ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ مطلب مشکل کے مقابلہ میں محض دعا یا عاجزی کارگر نہیں ہوتی عمل پیہم اور سعی مسلسل سے مشکلات حل ہوتی ہیں نہ کہ دعاؤں سے۔ مہمات اور مشکلات میں صرف

دعاؤں سے کام بننے کی امید اتنی ہی بے معنی ہے جیسے کہ حضرتِ خضر علیہ السلام کی درازیٔ عمر کی دعا مہمل ہے۔

مولانا حالیؔ مرحوم نے یادگارِ غالبؔ میں اس شعر کی شرح اس طرح فرمائی ہے :-

"چونکہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بند ھنے کا مقتضی تھا اس لیئے پہلا مصرعہ اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہوگیا ہے۔ مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے دیجا چکی ہو۔"

۲۔ نہ ہو بہرزہ بیابان نوردِ وہمِ وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

بہرزہ = نادانی سے، بیہودگی سے + بیابان نورد = بیابانوں کو روندنے والا مطلب تلاشی + وجود = وجودِ مطلق، واجب الوجود + وہمِ وجود = جو وجود نہ ہو اس کو وجود سمجھنا + نشیب و فراز = پستی و بلندی مراد تعینات

مطلب: یہ کہ جبتک سالک تعینات کے نشیب و فراز کو دور نہ کردے اور اپنی خودی کو برقرار رکھتے ہوئے تلاشِ حق کے بیابان میں قدم اٹھائے تو ہر قدم پر ٹھوکر کھائیگا ایسا قدم اٹھانا نادانی اور بیہودگی ہے اور پھر اس بیابان میں جو بھی نظر آئیگا وہ وجود نہ ہوگا بلکہ وجود کا وہم ہوگا۔ اس لئے چاہئے کہ پہلے ان نشیب و فراز کو دور کر کے راستہ ہموار کرے اور پھر قدم اٹھائے تو قدم قدم پر جلوۂ حق نظر آئیگا

۳۔ وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

وصال = دوست کی ملاقات، محبوب کی قربت + جلوہ تماشا ہے = جلوے کو دیکھنے کا نام ہے + پر = مگر + دماغ کہاں = تاب کہاں، مجال کہاں + آئینۂ انتظار = دیکھنے کا ذریعہ مراد دل + پرواز = پرداختن مصدر سے حاصل مصدر بمعنی جلا۔

فرماتے ہیں کہ صوفیا کی اصطلاح میں وصال سے مراد رویتِ باری تعالیٰ ہے۔ بالفاظِ دیگر تماشائے جلوہ کا نام وصال ہے لیکن بجز خاصانِ خدا اور اولیاء اللہ کے دوسروں میں یہ طاقت اور یہ تاب کہاں کہ آئینۂ انتظار یعنی دل کو اس درجہ مجلا کریں کہ اس میں جمالِ محبوب نظر آنے لگے اور وصال نصیب ہو۔

۴۔ ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

ذراتِ خاک کے چمکنے کی شاعرانہ توجیہ فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جبتک عاشق زندہ رہا جلوۂ ناز یعنی دیدار معشوق سے لطف اندوز اور حسن معشوق کی تنویر سے منور ہوتا رہا۔ اس کے بعد مرگیا پیوند زمین ہوگیا۔ خاک ہوگیا۔ اتنے مرحلوں سے گزرنے پر بھی دیدار کی چاٹ اور جلوۂ ناز کی خواہش نہیں گئی۔ اب ذرات میں مبدل ہو کر حسن آفتاب کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ گویا پھر بھی حسن کی پرستش جاری ہے۔ حاصل یہ کہ عاشق غیر فانی حقیقت ہے۔

۵۔ نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنون غالب   جہاں یہ کاسۂ گردون ہو ایک خاک انداز

جنون۔ عشق۔ کاسہ۔ پیالہ نما ہر ظرف۔ خاک انداز۔ مٹی، کوڑا کرکٹ اٹھانے کی ٹوکری جو کار نما ہوتی ہے۔ غالب نے اس شعر میں ایک بڑی حقیقت بیان کی ہے چشم باطن سے قطع نظر ظاہر بین نگاہوں نے عالم امکان یا کارخانۂ قدرت کی وسعتوں کا جو اندازہ لگایا ہے اس کے تصور سے خیال کانپ جاتا ہے۔ نظام شمسی ہی کو لیجیے ہمارے لئے آفتاب سب سے بڑا وجود ہے۔ اس کرۂ آتش سے جو شعلے بلند ہوتے ہیں انکی لمبائی کا اندازہ ۷ لاکھ میل کیا گیا ہے۔ آفتاب کی بزرگی کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ماہران فلکیات نے نظام شمسی سے کروڑہا گنا بڑے نظاموں کی اس فضا میں نشاندہی کی ہے ان کا تعداد اور ان کی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اعداد نہیں مل سکتے فاصلوں کو ناپنے کے لئے نور کی رفتار کے سال بنائے گئے پھر بھی کوئی عدد ایسا نہیں ہے جو اس فضائے بسیط کی پہنائیوں کا صحیح تصور اور اس فضا میں پھیلے ہوئے نظاموں اور کارخانوں کی بزرگی کا صحیح اندازہ کر سکے۔ اگر کوئی کہے کہ اس کرۂ ارض کی کیا حقیقت ہے یہ تو ایک نارنگی سے زیادہ نہیں یا آفتاب کے متعلق یہ کہے کہ اس کی حیثیت ایک مشعل سے بڑھکر نہیں تو کیا غلط ہوگا؟ پھر مے خانۂ عشق کے سرمست جن پر ہر دو جہان کی حقیقت آشکار ا ہے کاسۂ گردون کو خاک انداز نہ سمجھیں تو اور کیا سمجھیں مے خانۂ جنون کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔

غزل نمبر ۳

۱۔ وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سرتا سر خاک   گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز

کرم ۔ ابر گہربار کی بخشش + وسعت سعی ۔ سعی کی زیادتی + سر تا سر و سب ، بالکل سر تا پا

فرماتے ہیں کہ ابر گہربار کی بخشش کے کیا کہنے اور بخشش میں اس کی سعی کی کوئی حد نہیں۔

چلتے چلتے پاؤں میں آبلے آگئے ہیں اس پر بھی وہ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک گہر برساتے پھرتا ہے۔ آبلہ ہائے پا اس کی سعی کے مانع نہیں ہوتے اور نہ بخشش کا سلسلہ ٹوٹتا ہے۔

۲۔ یکقلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت　　نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

یک قلم ۔ بالکل، پورا + صفحۂ دشت ۔ صحرا

فرماتے ہیں کہ وحشت میں بجلی کی تیز رفتاری سے ہم دشت سے گزر گئے۔ مگر نقشِ پا میں حرارت باقی ہے جو پورے دشت کو کاغذ کی طرح جلا رہی ہے۔ معلوم نہیں نقشِ پا کی یہ حرارت کب دور ہو۔ جب نقشِ پا میں اس قدر حرارت ہے تو رفتار کی گرمی اور وحشت کی فراوانی کا اندازہ کون کر سکے۔

غزل نمبر (۱۴)

۱۔ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

"اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں، اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو ایمان لے دیگا اسلئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنی تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔" (از یادگار غالب)

۲۔ دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

پیکان ۔ تیر یا برچھے کی نوک + دل سے نکلا یعنی تیر + نہ نکلا دل سے یعنی پیکان۔

فرماتے ہیں کہ تیرا تیرِ نظر دل کو چھیدتے ہوئے نکل گیا۔ لیکن اس کا پیکان دل ہی میں رہ گیا اسلئے کہ وہ ہمکو عزیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نگہِ ناز تیر کی طرح دل کے پار ہو گئی اب اس کا خیال دل سے نکلنا مشکل ہے۔

۳۔ تاب لائے ہی بنے گی غالب　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

فرماتے ہیں کہ موت کا واقعہ بڑا سخت ہے اور جان بھی بہت عزیز ہے مگر اس کے باوجود موت کی سختی اٹھانی پڑے گی اس سے کسی کو گزیر نہیں۔

غزل نمبر ۵

۱۔ نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز		میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گلِ نغمہ = نغمہ کی شگفتگی + شکست = شکستِ خاطر، رنج۔

مطلب یہ ہے کہ مجھ میں نہ شگفتگی ہے نہ مسرت۔ صرف رنج اور سوز و گداز ہے اسلئے نغمہ ہائے مسرت کی بجائے نالہ ہائے سوز و گداز مجھ سے نکلتے ہیں۔

۲۔ تو اور آرائشِ خمِ کاکل		میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

فرماتے ہیں کہ آپ اپنے زلفوں کو سنوارنے میں معروف ہیں۔ ادہر میرے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی ہیں کہ کسی رقیب کے گھر جانیکی تیاری تو نہیں ہے؟ زلف کی درازی کی مناسبت سے مصرعۂ ثانی میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" رکھا گیا ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہی کہ میں بدگمان ہو رہا ہوں۔

۳۔ لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی		ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

لاف = شیخی، دعوی + تمکین = خودداری، برداشت

فرماتے ہیں کہ سینے میں تو راز ہائے عشق کی آگ لگی ہوئی ہے جو دل اور جگر کو پگھلا رہی ہے۔ ایسی حالت میں یہ دعوی کہ ہم اس آگ پر قابو پا کر خودداری برقرار رکھینگے اور ان راز ہائے سینہ گداز کو چھپا بیٹھنگے نادانی اور ناتجربہ کاری کا دہوکہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راز ہائے عشق کا پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں۔

۴۔ ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد		ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

طاقتِ پرواز = پرواز کی قدرت و آزادی

فرماتے ہیں دوسرے طائروں کی طرح میں گرفتار دام نہیں ہوں۔ ان کی گرفتاری مجبوری و لاچاری کی ہے موقع ملتے ہی وہ پرواز کر جائیں۔ میں تو محبت کا گرفتار ہوں۔ پرواز کی قدرت اور آزادی حاصل ہو لیکن صیاد کی محبت اس سے جدا ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ مطلب ہے کہ

میرا عشق صادق ہے جان جائے مگر درِ یار نہ چھوٹے۔ بوالہوس نہیں کہ موقع ملتے ہی فرار ہو جاؤں۔

۵۔ وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

ناز: یہاں اس سے مراد ظلم ہے + ناز کھینچنا: ظلم اٹھانا، ناز برداری کرنا۔

فرماتے ہیں کہ اب تو صرف معشوق کی ناز برداری اور ستم اٹھانے کی آرزو ہی آرزو ہے خدا وہ دن لائے کہ یہ آرزو پوری ہو۔

۶۔ نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

گلباز: گلوں سے کھیلنے والا۔

فرماتے ہیں کہ دل کا ہر قطرۂ خون آنسو بن کر بہ جاتا ہے۔ ایک بھی قطرہ ایسا نہیں جس سے میری مژگان نے نہ کھیلا ہو۔ یا۔ دل کے ہر قطرۂ خون سے مژگانِ یار نے گلبازی کی ہے یعنی ہر قطرۂ خون کو چھید دیا ہے۔

۷۔ اے ترا غمزہ یکقلم انگیز اے ترا ظلم سربسر انداز

انگیزنا اردو زبان کا مصدر ہے جس کے معنی برداشت کرنا اور سہارنا ہیں۔ لہذا انگیز کے معنی برداشت کے ہوئے۔ مراد اس سے قابلِ برداشت + انداز: غمزہ، ادا۔ شاعر نے فارسی مصادر انگیختن و انداختن سے دو حاصل مصدر لاکر حسب عادت لفظوں کی پیچ پاچ میں صاف سیدھے مطلب کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

فرماتے ہیں کہ تیرا ظلم اور انداز ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یعنی تیرا ظلم بالکل انداز ہے اور انداز سربسر ظلم ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اب رہا غمزہ وہ بھی ناز و انداز کا دوسرا نام ہے۔ پھر نتیجہ یہ نکلا غمزہ مساوی انداز کے اور انداز مساوی ظلم کے اور ظلم مساوی ہے غمزہ و انداز کے پھر ایسا ظلم یک قلم قابل انگیز ہے۔

استاد نے شعر کیا کہا اقلیدس کے مثلث متساوی الاضلاع کو ثابت کر دیا۔

۸۔ تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

فرماتے ہیں کہ تجھکو دیکھتے ہی ہماری جبینِ نیاز سے سجدے ٹپکنے لگتے ہیں ہمکو یہ سجدے مبارک کیوں

۹۔ مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　　　میں غریب اور تو غریب نواز

غضب = ہرج، بری بات + پوچھا = مہربانی کی۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تونے مجھ پر مہربانی فرمائی اور غیر اس کو اپنے پر ظلم سمجھتا ہے مجھکو پوچھنے میں کوئی قباحت نہیں اسلئے کہ میں غریب ہوں اور تو غریب نواز ہے تیرا کام ہی غریبوں کو نوازنا ہے۔

۱۰۔ اسداللہ خاں تمام ہوا　　　　اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

تمام ہوا = مرگیا + اے دریغا = افسوس + رندِ شاہد باز = حسن پرست میخوار

فرماتے ہیں کہ افسوس اسداللہ خاں جو ایک رندِ شاہد باز تھا مرگیا۔ اے دریغا میں یہ نکتہ ہے کہ باوصف رندِ شاہد باز ہونے کے وہ محترم اور سب کو عزیز تھا اسلئے سب اس کا ماتم کر رہے ہیں

ردیفؔ (س)

غزل نمبر ۱

۱۔ مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے　　　　دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

مژدہ = خوشخبری + ذوقِ اسیری = شوقِ گرفتاری + قفس = پنجرا

دامِ خالی۔ خصوصاً تیتر اور بٹیر کے شکار کیلئے شکاری ایسے تیتر اور بٹیر سدھا کر رکھتے ہیں جو شکاری کی سیٹی کے ساتھ بولنے لگتے ہیں۔ ان کی بولی درحقیقت اپنے ہم جنسوں کو دعوتِ مبارزت ہوتی ہے۔ یہ بڑے لڑاکا ہوتے ہیں فوراً چاروں طرف سے آواز پر پل پڑتے ہیں شکاری اطراف میں جال لگائے رکھتا ہے۔ وقتِ واحد میں بیسیوں پرند گرفتار ہو جاتے ہیں۔ شاعر اپنے ذوقِ اسیری کو خوش خبری دے رہا ہے کہ سامانِ گرفتاری مہیا ہیں۔ یعنی مرغِ گرفتار کے پنجرے کے پاس جال خالی ہے۔ بس اب دیر نہ کر چل اور گرفتار ہو جا۔ عاشق صفت آزاد اور نچلے نہیں رہ سکتے ان کو تو گرفتاری اور آزارِ قید و بند ہی میں لطف آتا ہے۔

۲۔ جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا — جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

تشنۂ آزار۔ جگر کی صفت یعنی ایسا جگر جو ہمیشہ طالبِ آزار رہتا ہے + جو۔ نہر + بنِ خار۔ کانٹے کا نچلا حصہ۔ بنِ خار بیان کرنے سے منشا یہ ہے کہ کانٹا پورا گوشت میں پیوست ہو گیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرا جگر آزار طلب ہے۔ مجھے نچلا بیٹھنے نہیں دیتا۔ طلبِ آزار میں مجھکو صحرا نوردی پر اکساتا ہے۔ صحرانوردی سے پاؤں زخمی ہوجاتے ہیں اور خون کی نہریں جاری ہوتی ہیں پھر بھی جگر کے ذوقِ آزار کی تسلی نہیں ہوتی۔

۳۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

بالکل اسی مضمون کا ایک شعر ت کی ردیف میں بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ — یار لائے مرے بالین پہ اسے پر کس وقت؟

اس شعر میں خطاب یاروں سے ہے۔ اور اوپر کے شعر میں مخاطب معشوق ہے۔ طنز آمیز شکوہ ہے۔ شعر کا مطلب واضح ہے۔ محتاجِ تشریح نہیں۔

۴۔ میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے — دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

غمخوار۔ طنزاً غمخوار کہا ہے مراد اس سے دشمن ہے۔ یہ دشمن معشوق بھی ہوسکتا ہے اور رقیب بھی۔

یعنی دشمن غمخوار بنکر ہمدردی اور مزاج پرسی کے لئے آیا ہے مگر اس انداز سے پرسش ہو رہی ہے کہ اس کی باتیں مجھے مارے ڈالتی ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر وہ ایک ایک چوٹ کرتا ہے۔ اور رک رک کے میں مر رہا ہوں۔ اس ایذا رسانی سے بہتر تھا کہ وہ زبان کے بدلے ایک تیز سا خنجر گلے پر چلاتا اور تیغِ زبان کے چرکوں سے نجات مل جاتی۔

۵۔ دہنِ شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل — نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

بیٹھئے اور کھڑے ہوجیے دو مقابل کے لفظ لطف سے خالی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل آزار معشوقوں سے دل لگا کر تمام عمر کا آزار مول لینے سے بہتر تو یہی ہے کہ یک لخت شیر کا لقمہ بن جائیں

۶۔ دیکھ کر تجھکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے — خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

حسین عموماً گلاب کے پھولوں سے اپنے سر کی زینت کرتے ہیں۔ اس کی شاعرانہ توجیہ سنئے فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے چمن میں پہنچتے ہی ہر بیل بوٹا نمو کرنے لگتا ہے نمو بھی اس شدت سے کہ شاخ گل دراز ہو کر گوشۂ دستار تک پہنچ جاتی ہے۔ اور گل خود بخود زیب دستار ہو جاتا ہے۔ لاجواب شعر ہے۔

۷۔ مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے ـــــ بیٹھنا اس کا وہ آکر تیری دیوار کے پاس

دوسرے مصرعہ میں پاس کے بعد یاد آتا ہے مقدر ہے۔ شعر محتاجِ تشریح نہیں۔

ردیف (ش)

غزل نمبر (۱)

۱۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ـــــ لگا دے خانۂ آئنہ میں روئے نگار آتش

خس جوہر = آئنہ کی روشن لکیروں کو خس سے تشبیہ دی ہے + لفظ سبزہ سے طراوت اخذ کر کے اس کو خس کو نم کر دیا + روئے نگار = دوست کے آتشیں رخسار

مطلب یہ ہے کہ دوست کے سبزۂ خط سے جوہر آئنہ نے طراوت حاصل کر لی ہے۔ ورنہ دوست کے رخسار کی ضیا خانۂ آئنہ میں آگ لگا دیتی۔

۲۔ فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق ـــــ نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

فروغ = روشنی، تجلی + خار = موم بتی کا سوتی تار

فرماتے ہیں کہ حسن کی تجلی سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے۔ جبتک اللہ تعالیٰ کی تجلیات طالب کے وجود کو روشن نہ کر دیں طالب کی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ تمثیلاً فرماتے ہیں کہ دیکھو شمع کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا ہے۔ اس مشکل کا حل یعنی کانٹے کا نکل آنا شمع کے روشن ہونے پر منحصر ہے۔ آگ جب اس کو روشن کر دیتی ہے تو کانٹا نکل جاتا ہے۔

ردیف ع

غزل نمبر (۱)

۱ جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع   چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

جادۂ رہ = نشانِ راہ + خور = خورشید + چرخ = آسمان + آغوش وداع = کسی کے رخصت ہوتے وقت بغلگیری کے لئے ہاتھوں کو پھیلانا۔

بجز لطیف تشبیہات کے کوئی خاص خیال اس شعر میں نہیں ہے۔ مطلب ہے کہ سورج شام کے وقت آسمان سے رخصت ہو کر راہ سفر اختیار کر رہا ہے۔ شام کے وقت کی شعاعیں اس کے سفر کی نشاندہی کر رہی ہیں اس لئے یہ شعاعیں نشان راہ یا جادۂ راہ ہوئیں۔ آسمان اپنے اس نورانی عزیز دوست کو بڑی محبت سے وداع کر رہا ہے۔ بوقتِ رخصت بغلگیر ہونے کے لئے اپنے ہاتھوں کو پھیلا رکھا ہے۔ یہ ماہِ نو چرخ کا کھلا ہوا آغوش ہی تو ہے۔

غزل نمبر (۲)

۱۔ رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع   ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

رخِ نگار = جلوۂ دوست + آتشِ گل = جلوۂ دوست + سوزِ جاودانی = ہمیشہ کا سوز + آبِ زندگانی = زندگی + فرماتے ہیں کہ شمع کے سوزِ جاودانی کی وجہ عشق ہے۔ جس طرح دوسرے عشاق رخ محبوب کے پروانے ہیں اور اس کے عشق میں جلتے رہتے ہیں۔ شمع بھی رخِ یار کی عاشق ہے اور جلتی ہے شمع کا روشن ہونا اور جلنا ہی اس کی زندگی ہے۔ یہ زندگی یا آبِ حیات یا روشنی شمع کو کہاں سے نصیب ہوئی۔ تو فرماتے ہیں آتشِ گل یعنی رخ نگار ہی اس آبِ حیات کا چشمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقانِ الٰہی کو سوزِ جاودانی حاصل ہے اور یہ سوز نتیجہ ہے تجلیاتِ باری کا اور درحقیقت یہی حیاتِ ابدی ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

"استاد نے فنونِ شاعری سے آتش کو آب بنادیا"

۲۔ زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

زبان شمع = شمع کی لو جو بزم کو روشن کرتی ہے + اہلِ زبان = شعرا و ادیب

مطلب یہ ہے کہ شمع جبتک روشن ہے یا بالفاظ دیگر اس کی زبان چلتی ہے وہ زندہ ہے جونہی اس کی زبان گم ہوگئی اور وہ خاموش ہوئی اس کی موت ہے۔ اس حقیقت کو وہ بزم میں سب کی سامنے زبانِ حال سے واضح کرتی ہے پس نتیجہ یہ نکلا کہ جو اہلِ زبان ہیں یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے جوہر گویائی یا کلام عطا فرمایا ہے اس نعمتِ خداداد کا شکرادا نہ کریں اور خاموش رہیں تو دوسرے اہلِ زبان کے پاس یہی ان کی موت ہے۔ شکر باری تعالیٰ اس طرح ادا کیا جائے کہ ان فطری صلاحیتوں کو کام میں لائیں۔ اپنی زبان کے خزانوں کو مالا مال کریں۔ اور اہلِ زمانہ کی رشد و ہدایت اور تعلیم فرماویں۔ پھر تو وہ زندۂ جاوید ہیں۔

۳۔ کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

ایما = اشارہ + قصہ تمام کرنا = فنا کرنا + اہلِ فنا = عاشقانِ الٰہی

یعنی جس طرح اہلِ فنا آتش عشق سے اپنے آپ کو فنا کرتے ہیں یہی حال شمع کا ہے۔ وہ بھی صرف شعلہ کے اشارہ پر جلتی رہتی ہے اور جلتے جلتے اس کی فسانہ خوانی یا قصہ تمام ہوجاتا ہے یعنی فنا ہوجاتی ہے۔ شعر میں قصہ اور فسانہ خوانی کی لفظی مناسبت رکھی گئی ہے۔

۴۔ غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

حسرت پروانہ = پروانے کے جل بجھنے کا افسوس۔

فرماتے ہیں کہ شمع پروانہ کے شوقِ شہادت اور فنا ہونے کو دیکھکر افسوس و ملال کرتی ہے اور اسی غم میں گھلی جارہی ہے۔ اے شعلہ تیرا لرزنا اور کانپنا شمع کی ناتوانی اور اسکے غم و ملال کا ثبوت ہے۔

یا

یہ کہ شمع پروانہ کی فدائیت کو دیکھکر رشک و حسد سے جل رہی ہے۔

۵۔ تیرے خیال سے روحِ اہتزاز کرتی ہے بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع

تیرے ، کا مرجع ذاتِ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہے + روح = روحِ کائنات + بہ جلوہ ریزیٔ باد = ہواؤں کے چلنے سے + بہ پرفشانیٔ شمع = شمع کے بھڑکنے سے۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست روحِ کائنات محض تیری یاد اور تیری محبت میں ۔ بہ حالتِ مستی و بیخودی تڑپ رہی ہے اور اپنی اس تڑپ کا اظہار ہوا کے چلنے سے اور شمع کے بھڑکنے سے کرتی ہے یعنی باد کی جلوہ ریزی اور شمع کی پرفشانی اہتزازِ روحِ کائنات ہے۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کی محبت میں اور اسی کے اشاروں پر رقص کناں ہے + بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع میں بائے قسمیہ بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ ہواؤں کے چلنے کی قسم ہے اور شمع کے بھڑکنے کی قسم ہے روحِ کائنات تیری یاد میں تڑپ رہی ہے۔ ہر دو صورتوں میں مطلب واحد ہے۔

۶۔ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

داغِ عشق اور شمع میں صفتِ سوز مشترک ہے اس لئے شمع کا داغِ عشق سے استعارہ کیا گیا ہے۔ شمع کے شعلے اور گل میں سرخی وجہِ شبہ ہے اس لئے شمع کو گل سے تشبیہ دیگئی + نہ پوچھ = اظہارِ زیادتی و اہمیت کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے + موسمِ خزاں میں شاخِ گل بے برگ ہوتی ہے اور شمع بھی ایک سوکھی ٹہنی کے مانند ہے جس پر صرف ایک گل ہے۔

ان لفظی رعایتوں، تشبیہوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد مطلب یہ ہوا کہ داغِ عشق کی بہار بیان سے باہر ہے۔ ایک شمع ہے جو ہر وقت سینے کو منور کرتی ہے۔ اس گلِ خزانی یعنی شمعِ عشق پر شگفتگی یعنی نفسِ بہار بھی مفتون اور شہید ہے۔ پھر جس گلِ خزانی پر بہار قربان ہو رہی ہو اسکی بہار کا کیا پوچھنا۔ شعر میں خزاں اور بہار کا تقابل لطف سے خالی نہیں۔

۷۔ جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

یعنی شمع بالینِ یار پر کھڑی مجھکو دیکھکر جل رہی ہے۔ شمع کے جلنے کا باعث جوشِ رقابت

معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے شمع کی طرف سے مجھے بدگمانی پیدا ہوگئی کہ وہ بھی میرے یار پر عاشق ہے۔ اس بدگمانی کی وجہ میرے دل پر داغ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ محبوبہ پر جل رہی ہے اور میرا دل اس پر جل رہا ہے۔

ردیف (فا)

غزل نمبر (۱)

۱۔ ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش — مجبوریاں تلک ہوئے لے اختیار حیف

ہم رقیب، رقیب کا ڈر + وداع، رخصت

فرماتے ہیں کہ جلوۂ دوست اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم بے اختیار ہو کر ہوش و حواس کو وداع کر دیں یعنی بیہوش ہو جائیں۔ لیکن وہاں دشمن بھی بیٹھا ہوا ہے۔ معلوم نہیں ہماری بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوست کو کس کس طرح سے سکھائے بجھائے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ہوش کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ مجبوری کی یہ انتہا ہے کہ ہوش کھونے کا بھی ہم کو اختیار نہیں ہے۔

۲۔ جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے — اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

فرماتے ہیں کہ ہم کو اس کا رنج ہے اور افسوس ہے کہ ہمارا عشق ہنوز پختہ و کامل نہیں ہوا اسلئے نفسِ شعلہ بار کی تپش و حرارت بھی ناتمام و ناقص ہے۔ تھوڑا سا جلاتی ہے۔ اگر عشق کامل ہوتا تو نفس کی حرارت بھی کامل ہوتی اور ایک ہی نفس شرر بار سے ہم کو پوری طرح جلا دیتی اور اس ہر وقت کی جلن سے نجات ملتی۔

ردیف (ک)

غزل نمبر (۱)

۱۔ زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک — کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

فرماتے ہیں کہ ہم کو دیوانہ پاکر بچے زخمی کرتے اور چل دیتے ہیں۔ بچوں کی طبیعت میں لا پروائی ہوتی ہی کوئی کام سلیقے سے پورا نہیں کرتے چاہیئے تھا کہ زخموں پر تھوڑا سا نمک بھی چھڑک جاتے کہ ہم کو کافی لطف حاصل ہوتا۔ کاش پتھر ہی میں نمک ہوتا علحدہ نمک پاشی کی ضرورت باقی نہ رہتی

۲۔ گردِ راہ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کسقدر پیدا نمک

فرماتے ہیں کہ دنیا میں نمک کی کمی نہیں بہت سا نمک پیدا ہوتا ہے ہمارے زخم دل کیلئے کافی تھا مگر زخم دل تو گردِ راہ یار کا طالب ہے۔ گرد راہ یار ہی زخم دل کے لئے باعث تسکین و مایۂ ناز ہے گردِ راہ یار میں جو نمکینی ہے وہ نمک میں کہاں۔ اس لئے کہ گردِ راہ میں دوست کی ملاحت کا تھوڑا سا اثر آگیا ہے۔

۳۔ شور جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

شور = نمکینی، شور و غل، دھوم دھام

شاعر نے لفظ شور کے دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ پہلے مصرعہ کا مطلب ہے کہ آج معشوق کنارِ بحر پر تفریح کیلئے آیا تھا جس کی وجہہ بڑی دھوم دھام تھی اور گرد و غبار خوب بلند ہو رہا تھا۔ مصرعۂ ثانی میں بتلایا ہے کہ یہی گرد و غبار موجِ دریا پر پڑتا تھا گویا موج زخم تھی اور گرد بوجہہ شور نمک تھا۔ مطلب صرف اسی قدر ہے کہ دوست کی آمد سے موجۂ دریا بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

۴۔ مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہو جیو نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

ارزانی = زیادتی، فراوانی + نمک = مزہ، لطف + نالۂ بلبل کا درد = عشق

فرماتے ہیں کہ مجھکو دردِ عشق کی فراوانی نصیب ہو اور اے دوست تجھکو خندۂ گل کی سی شادمانی و لطف مبارک ہو۔

۵۔ داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ یاد کرتا ہے مجھے۔ دیکھے ہے وہ جس جا نمک

فرماتے ہیں معشوق جہاں کہیں نمک دیکھ پاتا ہے فوراً مجھکو یاد کرتا ہے کہ کاش غالب ہوتا اور اس کے زخم جگر کیلئے یہ نمک کام آتا۔ اس کا اس طرح یاد کرنا میرے زخمِ جگر کی داد دینا ہے۔

۶۔ چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے — دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

فرماتے ہیں کہ اے دوست عاشقِ مجروح کی خبر نہ لینا اور بغیر نمک پاشی اس کو چھوڑ کر جانا قابلِ افسوس ہے۔ دل زخم کا طالب اور مجروح اعضا نمک کے خواہاں ہیں اس لئے ادھر بھی آئیے اور زخموں پر تھوڑا سا نمک چھڑک دیجئے۔

۷۔ غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد — زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

قاتل = رقیب ÷ فرماتے ہیں کہ اگر غیر نے ہم کو زخمی کیا ہے تو توفیرِ درد کیلئے اس سے نمک پاشی کی التجا نہیں کی جائے گی۔ قاتل کی طنز آمیز ہنسی میں اس قدر شوریدگی ہے کہ زخم نمک لذّت بنگئے ہیں پھر غیر کی نمک پاشی کا احسان کس لئے اٹھایا جائے۔

۸۔ یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں — زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

پلکوں سے چننا = تعظیماً و احتراماً ÷ زمانہ قدیم میں نمک بہت کمیاب تھا اس لئے اس کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ احتیاط کو اعتقاد میں داخل کر دیا گیا اور سمجھا جانے لگا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے نمک گر جائے تو قیامت کے روز پلکوں سے چننا پڑیگا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ نمک کی حفاظت کیجائے شاعر نے اسی محاورہ کو باندھا ہے۔

فرماتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ لذتِ درد سے وجد کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسی وجد و شوق کی حالت میں نمک کی کنکریاں اگر زخم سے نیچے گر پڑتی تھیں تو بڑی احتیاط اور احترام سے ان کو چن کر پھر زخموں میں رکھ لیا کرتا تھا۔ اب وہ ذوق و شوق باقی نہیں رہا۔ البتہ کبھی یاد آتی ہے۔

غزل نمبر (۲)

۱۔ آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

زلف کا سر ہونا = زلف کا کھلنا ÷ "اک عمر" اور "زلف کا سر ہونا" دونوں وقت کے پیمانے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کی زلف اتنی لمبی ہے کہ اس کے کھلنے کیلئے عمرِ نوح کی ضرورت ہے اور میری آہ میں اثر پیدا ہونے تک ایک عمر درکار ہے۔ یعنی آہ میں اثر اتنی ہی مدت میں پیدا ہو سکتا ہے

جتنی دیر میں تیری زلف کھل سکتی ہے۔ پھر اتنی مدت تک کون جی سکتا ہے اور کس کا مقصد بر آسکتا ہے۔

۲۔ دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ ‏ ‏ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

فرماتے ہیں کہ دریا کی ہر موج ایک دام ہے اور ہر دام میں سو مگرمچھ منہ کھولے ہوئے ہیں ایسی صورت میں قطرۂ نیسان کیلئے گہر بننے تک صدہا خطرات اور مشکلیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ طالبِ حق کیلئے منزل مقصود تک پہنچنے میں صدہا مشکلات ہیں۔ ان مشکلات کو دور کرنے کے بعد ہی منزل مقصود تک رسائی ممکن ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں اس شعر کا مطلب اسطرح بیان فرمایا ہے۔

"جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے"

۳۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ‏ ‏ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

جگر خون شدن فارسی محاورہ ہے جس کے معنی سخت محنت اٹھانا ہیں + رنگ = حال

مطلب یہ ہے کہ عشق کی تکمیل کیلئے کافی وقت بطور محنت شاقہ درکار ہے۔ تکمیلِ عشق کے بعد ہی دوست کی قربت حاصل ہوگی۔ مگر تمنائے دل بیتاب ہے کہ جلد سے جلد محبوب کا دیدار حاصل ہو جائے اب فکر یہ ہے کہ محنت شاقہ ‏ ‏ برداشت کر کے عشق کی تکمیل کرنے تک اس دلِ بیتاب کو کس طرح بہلاؤں اور اس طویل مدت میں دل کی کیا حالت ہوگی۔

۴۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ‏ ‏ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

فرماتے ہیں کہ اے دوست آپ کا یہ ارشاد درست ہے کہ آپ ہماری مزاج پرسی اور خبر گیری کیلئے تشریف لائینگے اور غفلت نہ فرمائینگے مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کو ہماری حالت کی خبر ہوتے تک ہم دفن ہو چکے ہوں گے۔۔ یا۔۔ یہ کہ آپ نے ہمارے جنازے میں شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اور ہم کو اس کا یقین بھی ہے کہ ضرور آئینگے لیکن ہمارے مرنے کی اطلاع آپ تک پہنچنے میں کافی دیر ہوگی اور اس عرصہ میں ہم دفن ہو چکے ہونگے۔

۵۔ پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ‏ ‏ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فرماتے ہیں کہ جس طرح آفتاب کی شعاعیں قطرۂ شبنم کو لطافت میں مبدل کر دیتی ہیں اور قطرہ فنا ہو جاتا ہے میری انانیت اور خودی بھی فضل ایزدی کی محتاج ہے۔ جونہی اس کا فضل ہوا اور تجلی مجھ پر پڑی میری انانیت فنا ہو گئی۔

۶۔ یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۔۔۔ گرمیٔ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک

فرصت ۔ مہلت + گرمیٔ بزم ۔ انسانی زندگی کی چہل پہل + رقص شرر ۔ چنگاری کی چمک + بزم کی آرائش سے شرر کا شمع سے استعارہ کیا گیا ہے۔

مطلب ہے کہ انسان کی زندگی بہت مختصر اور ناپائدار ہے۔ اگر وقت کو ایک دریائے ناپیداکنار فرض کریں تو زندگی کی مہلت اس کے ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔ یک نظر بیش نہیں سے مراد یہ ہے کہ پلک جھپکنے میں جتنی دیر ہوتی ہے زندگی کی مہلت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر دوسرے مصرعہ میں اسی خیال کو دوسری مثال سے ظاہر کیا ہے۔ مطلب ہے کہ بزم ہستی کی گرمی کے لئے شرر شمع ہے۔ جونہی شمع بجھی اور گرمیٔ بزم ختم ہو گئی ظاہر ہے کہ شرر کی چمک ایک پل سے زیادہ نہیں رہتی اس لئے زندگی کی مصروفیت اور اس کی چہل پہل کے لئے اس سے زیادہ مہلت نہیں ہے

لفظ "غافل" نے اس بات کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ اپنی عمر عزیز کو غفلت میں مت کھو اور یہ مت سمجھ کہ تو زیادہ عرصہ تک زندہ رہیگا۔ پس دائمی قیام گاہ کیلئے کچھ تیاری اور ساز و سامان جھٹ پٹ کرلے۔ "گرمی" "بزم" "رقص" "شرر" کی لفظی مناسبتوں اور تمثیل نے شعر کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔

۷۔ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مطلب ہے کہ وجود کے ساتھ غم لگا ہوا ہے۔ کسی صورت غم ہستی سے جدا نہیں ہو سکتا اس کا علاج صرف موت ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اس حقیقت کو ایک تمثیل سے واضح فرماتے ہیں۔ یعنی شمع کو دیکھو کہ جبتک وہ زندہ ہے جلتی رہتی ہے۔ سحر جو اس کی موت ہے اس کے سوز کو دور کرتی ہے۔ ٹھیک یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔

ایک بڑی حقیقت کو ایسی عمدہ تمثیل کے ساتھ چند لفظوں میں بیان کرنا اور اس انداز سے کہ سنتے ہی دل میں اتر جائے صرف حضرتِ غالب کا ہی حصہ ہے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں" اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں" (از یادگارِ غالب)

ردیف (گاف)

غزل نمبر (۱)

اگر تجھ کو ہو یقینِ اجابت دعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

پہلے مصرعہ میں دعا نہ مانگ سے مراد کوئی دوسری دعا نہ مانگ ہے۔ چنانچہ مصرعہ ثانی میں اس کی توضیح فرماتے ہیں۔ یعنی اگر تجھکو دعا قبول ہونیکا یقین ہے تو صرف دلِ بے مدعا مانگ اس کے سوا کسی اور چیز کے لئے دعا نہ مانگ۔ دلِ بے مدعا حاصل ہو جائے تو پھر کسی چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہیگی۔

۲۔ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

"اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بہ ظاہر یہ درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے۔ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب انکو شمار کرتا ہوں وہ داغ جو تونے دنیا میں دیئے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں۔ ان کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بہ سبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں" (از یادگارِ غالب)

ردیف (ل)

غزل نمبر (۱)

۱۔ ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ۔۔۔ بلبل کی کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کاروبار۔ حرکات یعنی خوشی سے چہکنا، تنکے چننا، آشیانہ بنانا، گل پر فدا ہونا وغیرہ

فرماتے ہیں کہ بلبل اس دھوکہ میں ہے کہ گل ہمیشہ اس کا ساتھ دیگا اور وفادار رہیگا۔ اسی فریب خوردگی کے عالم میں وہ خوشی منا رہا ہے اور کاروبار میں مصروف ہے۔ دوسری طرف گل اس کی ان حماقتوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی رفاقت چند روزہ ہے اس کے بعد وہ کہاں اور بلبل کہاں۔

۲۔ آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ۔۔۔ ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

برگِ گل اور حلقۂ دام میں گولائی وجہ شبہ ہے اس لئے گلاب کی پنکھڑیوں کو حلقہ ہائے دام سے تشبیہ دی گئی۔ ٹوٹے پڑے ہیں سے مطلب ہے کہ ہوا کے چلنے سے پنکھڑیاں پھول سے جدا ہو کر گر پڑی ہیں۔ ہوائے گل: گل کی محبت

فرماتے ہیں کہ نسیم گل کی محبت میں گرفتار اور غنچہ میں محبوس تھی۔ جب غنچہ کھل کر گل ہو گیا تو نسیم بھی آزاد ہو گئی۔ اب جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ برگِ گل جو حلقۂ دام بنے ہوئے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر چمن میں ہر طرف پڑے ہیں۔ قید و بند سے نسیم کی یہ آزادی ہوا خواہانِ چمن کو مبارک ہو اب وہ نسیم کے فرحت بخش جھونکوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ـــــ یا ـــــ یہ کہ نسیم گل کھلنے تک آزاد نہیں تھی بلکہ ہوائے گل کی وجہ غنچوں کو کھلانے میں مصروف تھی اب سب گل کھل گئے۔ اس کی مصروفیت ختم ہو گئی وہ آزاد ہے۔ حلقہ ہائے دام برگہائے گل کی شکل میں ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں۔

۳۔ جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ۔۔۔ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

موجِ رنگ۔ افراطِ طرب۔ اے وائے۔ افسوس ہے۔ لبِ خونیں نوا۔ برگِ گل۔ دھوکے میں مر گیا۔ دھوکے میں رہا۔

یعنی چمن میں جس کسی نے گلا بکے تختے کو پھولا ہوا دیکھا سمجھا کہ طرب ہی طرب ہے، عیش ہی عیش ہے۔ لیکن ان لوگوں نے ظاہری رنگ و بو سے دھوکہ کھایا۔ افسوس کہ حقیقت پر نظر نہیں کی ورنہ وہ دیکھتے کہ گل اپنے لب خونین نوا سے نالہ کر رہا ہے کہ عیش و شادمانی کچھ بھی نہیں صرف رنج ہی رنج ہے۔ مطلب ہے کہ انسان جن چیزوں کو سامانِ نشاط سمجھتا ہے وہ درحقیقت اس کیلئے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ دنیا میں عیش کا خیال دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

۴۔ خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

سیہ مست = رند کی صفت ہے یعنی ایسا رند جس نے خوب شراب پی لی ہو، یہاں شرابِ عشق مراد ہے خوش حال = خوش نصیبی ۔ حریف = ہم پیشہ، رقیب، دوست وغیرہ۔ چونکہ ہم پیشہ لوگوں میں رقابت ہوتی ہے اس لئے رقیب یا دشمن کے معنی لئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم پیشہ اشخاص میں بعض وقت خلوص اور رفاقت بھی ہوتی ہے اس لئے دوست کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ یہاں بمعنی رفیق ہے۔ سایۂ گل میں شاعر نے دو رعایتیں ملحوظ رکھی ہیں ایک تو سیہ مست کی مناسبت سے سایہ کی سیاہی دوسرے سایہ ہمیشہ درخت کے پاؤں پری پڑا رہتا ہے فرماتے ہیں کہ اس عاشق کی خوش نصیبی کی کوئی انتہا نہیں جو محبت سے مست ہو کر ہر وقت اپنا سر معشوق کے قدموں پر جھکائے ہوئے ہے۔ جس طرح گل کا سایہ ہمیشہ درختِ گل کے قدموں پر پڑا رہتا ہے۔ کاش ہمارے مقدر بھی ایسے ہو جائیں کہ ہم بھی ہمیشہ اپنے دوست کے قدموں پر پڑے رہیں۔

۵۔ ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

نفسِ عطر سائے گل = گل کی خوشبو، نکہتِ گل

مطلب ہے کہ موسمِ بہار گلوں کی خوشبو کو صرف معشوق کے لئے ایجاد کرتا ہے۔ یا گلوں سے جو عطر بنایا جاتا ہے وہ معشوق کیلئے تیار ہوتا ہے۔ اس خوشبو کو معشوق سے قربت حاصل ہوتی ہے اس لئے نکہتِ گل میری رقیب ہے۔

۶۔ شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

مینائے بے شراب = شراب کا خالی شیشہ + دلِ بے ہوائے گل = ایسا دل جس میں گل کی خواہش نہ ہو

بجھا ہوا دل + بادِ بہار = موسم بہار

فرماتے ہیں کہ موسم بہار کا تقاضا تو یہ ہے کہ سیر گل کیلئے چمن میں جائیں اور وہاں دور ساغر چلے۔ مگر افسوس کہ بہار کے اس تقاضے کو میں پورا نہیں کر سکتا اس لئے کہ دل میں سیر گل کی خواہش ہے اور نہ بوتل میں شراب۔ ہر دو خالی ہیں، پھر تقاضائے بہار کی تکمیل کیسے ہو اس لئے بادِ بہار سے شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے۔

حضرت غالب نے اس شعر میں اپنی پریشان خاطری اور تنگدستی کا اظہار کیا ہے یعنی حوادث کے باعث دل افسردہ ہو گیا ہے اور تنگدستی کا یہ حال ہے کہ شراب نہیں خریدی جاسکتی۔

۷۔ سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی   خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

سطوت = قہر، رعب، دبدبہ + جلوہ = نظارہ، دیدار، نور وغیرہ کثیر المعانی ہے + حسن غیور = حسن غیرت مند، ایسا حسن جو دوسرے حسن کو خاطر میں نہیں لاتا + خوں ہے = ہیچ ہے، بے رونق ہے + رنگ = اس لفظ کے بھی بے شمار معنی ہیں۔ یہاں اس کے معنی رونق اور کیف کے ہیں + ادائے گل = گل کا انداز معشوقانہ یعنی حسن

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے بے مثل جلوۂ حسن کی دھاک ایسی بیٹھی ہے کہ پھر کوئی دوسرا حسن نظر میں نہیں جچتا۔ اس کے مقابلہ میں حسنِ گل کی رونق بھی ہیچ ہے۔ یا گل کے اندازِ معشوقانہ کی تیرے جلوہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

۸۔ تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکہ کہ آج تک   بے اختیار دوڑے ہے گل درقفائے گل

گل درقفائے گل = گل کے پیچھے گل + بے اختیار دوڑے ہے = تیزی سے کھل رہے ہیں۔

فرماتے ہیں اے دوست ابتدائے آفرینش سے آج تک یکے بعد دیگرے اس کثرت سے جو گل کھل رہے ہیں اس کو دیکھکر عوام اس دھوکے میں ہیں یہ گلوں کا جلوہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اے حسن آفرین یہ تیرا ہی حسن اور تیرا ہی جلوہ ہے۔ اس حسن کو گلوں سے منسوب کرنا دھوکہ ہے

۹۔ غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو   جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

ہم آغوشی ۔ ملنا ۔ خیال ۔ تصور ۔ گل جیب قبائے گل ۔ زینت گل

فرماتے ہیں مجھکو ایسے حسین سے ملنے کی آرزو ہے جس کا تصور گل کی زینت اور حسن سے حسین تر ہے یعنی معشوق حقیقی سے ہم آغوشی کا آرزومند ہوں۔

ردیف (م)

غزل نمبر (۱)

۱۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

آزاد ۔ فقراء ۔ تارک الدنیا۔

فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہر وقت رجوع الی اللہ رہتے ہیں اور تعلقات دنیوی سے آزاد ہیں ان کو کسی بات کا رنج و غم نہیں ہوتا اور اگر بوجہہ تقاضائے بشریت ہو بھی تو بس تھوڑی دیر کے لئے اس کی وجہہ یہ ہے کہ انسانوں کا یہ مقدس گروہ دنیا کی ہر اچھی بری کا باعث ذات باری تعالیٰ کو صرف مانتا ہی نہیں بلکہ اس پر یقین کامل رکھتا ہے۔ پھر جو بھی خدا کی طرف سے ہو اس پر رنج و غم بے معنی ہے۔ مصرعہ ثانی میں شاعر نے آزادوں کے غم کی مدت کی مزید تشریح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے ماتم خانہ کی شمع برق ہے جس سے ماتم خانہ روشن کیا جاتا ہے۔ بس جتنی دیر برق کی روشنی رہ سکتی ہے ہمارا ماتم بھی اتنی ہی دیر رہتا ہے اس کے بعد ختم۔ خلاصہ یہ کہ آزاد ہر قسم کے رنج و غم سے آزاد ہونے میں اسی لئے ان کو آزاد کہا جاتا ہے۔

۲۔ محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم

برہم کرنا ۔ الٹ پلٹ کرنا ۔ خیال ۔ وہم ۔ گنجفہ باز خیال ۔ خیال کو گنجفہ باز فرض کیا ہے ۔ نیرنگ ۔ یہ لفظ کثیر المعانی ہے ایک معنی اس کے تصویر کے خاکہ کے ہیں یہاں اس سے مراد تصاویر کا البم ۔ نیرنگ یک بت خانہ ۔ ایسا البم جس میں ایک بت خانہ بھر بتوں کی تصاویر ہوں۔

یہ شعر تصوف کا ہے ۔ وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو پیش کیا ہے یعنی وجود صرف ایک ہی ہے اور باقی سب ہمارا اور آپ کا وہم

فرماتے ہیں کہ جس طرح گنجفہ باز کے ہاتھ میں متعدد اور مختلف رنگ کے پتے ہوتے ہیں اور ہر پتے پر ایک تصویر ہوتی ہے۔ ان تصاویر کے مختلف نام بھی ہوتے ہیں کسی کا بادشاہ کسی کا رانی کسی کا غلام وغیرہ اور ظاہر ہے کہ یہ نام سب فرضی اور باطل ہیں۔ گنجفہ باز ان ہی فرضی اور باطل تصاویر سے الٹ پلٹ کر کے کھیلتا ہے۔ یہی حال ہمارے وہم کا ہے۔ موجودات کی جو شکلیں اور مختلیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہم سمجھتا ہے کہ یہ ان کا اپنا وجود ہے اور ہم نے ان کے جو نام مقرر کئے ہیں وہ ان کے اصلی نام ہیں حالانکہ گنجفہ کی تصاویر کی طرح یہ نام بھی فرضی اور باطل ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح خدائے واحد کے سوا جتنے بھی خدا یا بت ہوں باطل ہیں۔ اسی طرح وجود واحد کے سوا دوسرے وجود بھی باطل و فرضی ہیں۔ اور یہ مختلف شکلیں جو ہمارے سامنے ہیں گویا وہ باطل بتوں کی تصاویر ہیں جن سے ہمارا وہم کھیلتا ہے۔ لہذا وہم یا قصور فہم کے باعث ہم ان بتوں کی تصاویر کے البم کی ورق گردانی بنے ہوئے ہیں۔

۴۔ باوجود یک جہان ہنگامہ پیدائی نہیں　　　ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہان ہنگامہ = بہت زیادہ ہنگامہ یا ہنگامۂ جہاں ۔ پیدائی = ظہور، نمود

فرماتے ہیں کہ پروانوں کا چراغ پر ہجوم تو ظاہر ہے۔ لیکن اس ہنگامہ کی علت اور وجہ ظاہر نہیں۔ اور ظاہر ہو بھی کیسے وہ نظر آنے والی چیز نہیں۔ وہ تو دلِ پروانہ کا عشق ہے جو اس کو اس ہنگامہ آرائی پر مجبور کرتا ہے بھٹیک یہی حال اس دنیا کے ہنگاموں یعنی ہجوم و فراوانیٔ موجودات کا ہے۔ یہ سب چیزیں تو نظر آتی ہیں لیکن ان کے وجود میں آنے کی علت، انکی تخلیق کا باعث نظر نہیں آتا جس طرح پروانوں کے ہجوم کا باعث عشق ہے اسی طرح ہماری تخلیق کا موجب بھی عشق و حُب ہے۔ کنز مخفی کا ظہور چاہ و حب ہی کا نتیجہ ہے۔ چراغانِ دلِ پروانہ سے مراد عشق ہی ہے۔

۵۔ ہم ضعف ہی سے ہے نے قناعت ہی یہ ترکِ جستجو　　　ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ضعف = کمزوری، مراد اس سے مجبوری۔ قناعت = خدائے تعالیٰ جو بھی دے اسی کو کافی سمجھنا۔ اس سے زیادہ کی حرص نہ کرنا۔ ترکِ جستجو = ترکِ سعی۔ وبال = بار۔ تکیہ گاہ ہمت مردانہ = ہمت مردانہ کا بھروسہ

فرماتے ہیں کہ ترک سعی یا ترک جستجو کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو مجبوری اور کم ہمتی بعض لوگ پستیٔ طبع اور تن آسانی کی وجہ جستجو نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات اور ہمت مردانہ پر بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور طفیلی بنے ہوئے ذلت سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

دوسری وجہ ترک جستجو کی قناعت ہے۔ انسانوں کی ایک مختصر لیکن نہایت مقدس جماعت ایسی ہے جو نہایت بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی عالی ہمتی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دنیا جیسی حقیر چیز کے لئے اپنی صلاحیت، کوشش اور توانائی صرف کی جائے وہ ایک عظیم الشان مقصد کو سامنے رکھتے اور اسی کے حصول میں منہمک و معروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی ضروریات بہت محدود ہوتی ہیں اس لئے جو بھی خدا دے اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی خواہش نہیں کرتے۔ یہی قناعت ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہمارا تعلق پہلی جماعت سے ہے جو دوں ہمتی کی وجہ ترک جستجو کرتی ہے اس لئے ہمارا وجود ہمت مردانہ کیلئے وبال اور موجب ننگ و عار ہے۔

۵۔ دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

دائم الحبس = جو حبس دوام میں ہو + زندان خانہ = قید خانہ

فرماتے ہیں ہماری کوئی آرزو بر نہیں آئی۔ جملہ کی جملہ آرزوئیں دل میں مقید ہیں۔ یہ قید سال دو سال کا نہیں بلکہ ان آرزوؤں کو حبس دوام کی سزا ملی ہے۔ نہ ابتک کوئی آرزو نکلی اور نہ ہماری زندگی تک کوئی آرزو نکل سکتی ہے۔ یہ قیدی خاموش بھی نہیں۔ دل کا خون کرکے سینے کو خون سے بھر دیا ہے اس لئے ہم اپنے سینۂ پرخوں کو زندان خانہ سمجھتے ہیں۔

غزل نمبر (۲۱)

۱۔ بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

بہ نالہ = آہ و زاری سے + حاصلِ دل بستگی = دل بستگی کا نتیجہ + متاع = مال و دولت + خانۂ زنجیر = زنجیر کے حلقے

فرماتے ہیں کہ زنجیر اپنے حلقوں سے تعلقات اور دل بستگی رکھتی ہے اس لئے اس کو بجز صدا

و نالہ کوئی چیز حاصل نہیں۔ اگر تو بھی تعلقات دنیوی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو اس دل بستگی سے تجھکو متاع نالہ و آہ ہی حاصل ہوگی۔ دوسری کوئی متاع فراہم نہیں کی جا سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اگر خدا کو بھول کر ہمہ تن دنیا و اہل دنیا سے وابستہ ہو جائے تو بجز رنج اور افسوس اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے ضروریات ناگزیر کی حد تک تو دنیا سے تعلق رکھے اور باقی وقت رجوع الی اللہ رہے

غزل نمبر (۳۱)

۱۔ مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

" پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبہ کا آدمی تھا۔ لیکن وطن میں مرنا جہاں اکثر مانند واقف حال ہو۔ مگر خبیدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے۔ جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔" (یادگار غالب)

۲۔ وہ حلقہ ہائے زلف کمین میں ہیں اے خدا — رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

حلقہ زلف = شکنِ زلف۔ کمین = گھات۔ وارستگی = آزادی۔

مایوسی کے عالم میں دعا کی جا رہی ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ گرفتاری یقینی ہے اس لئے کہ حلقہ ہائے زلف دیکھ کر دل بے قابو ہو چکا ہے۔ اگر دل پر قابو ہوتا تو پھر دعا غیر ضروری تھی۔

فرماتے ہیں کہ زلف معشوق کی ہر شکن دام کا ایک حلقہ بنی ہوئی میری گھات میں ہے (ادھر دل بھی گرفتار ہونے بے چین ہے) گرفتاری کیلئے کچھ زیادہ دیر نہیں۔ مگر ہم کو اب تک آزادی کا دعویٰ ہے۔ اور یہ دعوئ آزادی اے خدا صرف تیری مدد سے قایم رہ سکتا ہے۔

ردیف ن

غزل نمبر (۱)

۱۔ لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے — غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وام = قرض ۔ بختِ خفتہ = سویا ہوا نصیب ، بد قسمتی ۔ خوابِ خوش = گہری نیند ، آرام کی نیند ۔

فرماتے ہیں کہ میرے قسمت ابتدا سے سو رہے ہیں اور قیامت تک سوتے رہیں گے اس لئے بخت کے پاس نیند کی کچھ کمی نہیں ۔ خوابِ خوش کا بڑا ذخیرہ اس کے پاس ہے ۔ دوسری طرف ہماری قسمتوں میں صرف جاگنا ہی جاگنا ہے ۔ جاگتے جاگتے جی بیزار ہو گیا ۔ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے آرام سے سو جاؤں اس لئے خیال کرتا ہوں کہ اپنے بختِ خفتہ سے تھوڑی سی نیند بطور قرض حاصل کروں مگر ساتھ ہی یہ خوف ہوتا ہے کہ یہ قرض ادا کہاں سے کروں گا اسلئے کہ مجھے نیند نصیب ہی نہیں

غزل نمبر (۲)

۱۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

یہ پوری غزل جوانی کی رعنائیوں کی یاد میں لکھی گئی ہے ۔

فرماتے ہیں کہ اب ضعیف ہو گئے جوانی کے دن گزر گئے ۔ فراق کی تکلیف اور وصال کا لطف جوانی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ۔

۲۔ فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

فرماتے ہیں کہ عشق و محبت کے کاروبار کی فرصت کس کو ہے ۔ ہم تو زمانۂ پیری کی آفتوں میں الجھے ہوئے ہیں ۔ حسینوں کو دیکھنے کا شوق بھی باقی نہیں رہا ۔ جوانی کے ساتھ شوق و ذوق دونوں رخصت ہو گئے ۔

۳۔ دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں

شورِ سودا = خیال کی دھوم ، دھام ۔ خط و خال = حسن

فرماتے ہیں کہ دل تو بجھے کرعرصہ ہوا۔ خواہشیں بھی دل کے ساتھ ختم ہوگئیں البتہ دماغ میں کچھ حسن کا دھیان تھا۔ جہاں حسن کو دیکھ پاتے لطف اندوز ہوتے۔ مگر اب وہ دماغ بھی باقی نہیں رہا اور خیال خط و خال بھی جاتا رہا۔

۴۔ تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

رعنائی : شوخی، چوچلا + شخص مراد معشوق شوخ۔ غالباً اس ڈومنی کی طرف اشارہ ہے جس سے آپ کو محبت تھی اور اس کے مرنے پر ایک درد انگیز غزل بطور نوحہ لکھی ہے جو ردیف (ے) میں موجود ہے۔

فرماتے ہیں ہمارے خیال میں شوخی اور کلام میں چوچلا معشوق کے تصور سے تھا۔ معشوق کا تصور ہی خیالات رنگین اور جذبات محبت کا محرک تھا۔ اب معشوق ہے اور نہ اس کا تصور پھر خیالات میں وہ شوخی و چوچلا کیسے پیدا ہو۔

۵۔ ایسا آسان نہیں لہو رونا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

فرماتے ہیں رونے کے لئے طاقت اور لہو کی ضرورت ہے۔ نہ دل میں طاقت ہے نہ جگر میں خون پھر کس طرح رویا جائے۔ رونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

۶۔ ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

قمار خانۂ عشق : عاشقی کے اڈے + مال سے مراد روپیہ بھی ہو سکتا ہے اور توانائی بھی۔

مطلب یہ ہے کہ قمار خانۂ عشق میں جانیکے لئے مال اور توانائی دونوں کی ضرورت ہے یہی دو چیزیں ہیں جو وہاں ہاری جاتی ہیں۔ اب نہ گرہ میں مال ہے نہ جوانی۔ پھر وہاں کیسے جائیں

۷۔ فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں

سر کھپانا : کوشش کرنا، سر مارنا + وبال : مصیبت

فرماتے ہیں میں ایک آزاد آدمی ہوں تخیلات و شاعری کی دنیا میں رہنے والا فکر معاش اور انتظام خانہ سے مجھکو لگاؤ نہیں۔ میرے لئے یہ وبال جان ہے۔ لیکن گردش زمانہ نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب فکر دنیا میں سر کھپا رہا ہوں اس کے بغیر چارہ نہیں۔

۸۔ مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مضمحل : ناتوان، کمزور۔ قویٰ : قوت کی جمع۔ عناصر : جمع عنصر، چار بنیادی مادے خاک و آب و باد و آتش جس سے دنیا بنی ہے۔ اس شعر میں عناصر سے مراد چار اخلاط خون، بلغم، سودا، صفرا ہیں جس سے جسم انسانی مرکب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ضعیفی کی وجہ قوتیں مضمحل ہو گئی ہیں۔ تندرستی اور اخلاط کا اعتدال جاتا رہا۔ اعتدال اخلاط پر ہی تندرستی و توانائی منحصر ہے۔

غزل نمبر (۳)

۱۔ کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں　　ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

غیر : رقیب۔ ہوتی آئی ہے : پہلے سے یہ رسم چلی آرہی ہے۔

فرماتے ہیں کہ دوست ہم پر مہربان ہے تو دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے حق میں ظلم ہو رہا ہے کسی پر مہربانی کرنا نیکی کی دلیل ہے نیک آدمی کو برا کہنا بری بات ہے۔ مگر کیا کہیں دنیا کی ریت الٹی ہے۔ اگلے وقتوں سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

۲۔ آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے　　کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اس شعر میں دیکھیے کیا کہتے ہیں ذو معنین ہے۔ ایک تو یہ کہ آج ہم اپنی پریشانی ان سے بیان کرنے جا رہے ہیں مگر معشوق کے رعب حسن سے کچھ نہ کہہ سکیں گے یا جو سوچ کر جا رہے ہیں وہ بھول جائیں گے اور کچھ کا کچھ کہہ دینگے۔ دوسرے یہ کہ ہم معشوق سے جو کچھ عرض کریں گے معلوم نہیں اس کے جواب میں وہ کیا کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں کہتے ہیں کا فاعل "ہم" دوسری صورت میں "وہ" ہوگا

۳۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو　　جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے لوگ : پرانے فقیر، سادہ دل۔ اندوہ ربا : غم غلط کرنے والا۔

فرماتے ہیں جو لوگ مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں سادہ لوح ہیں جو سنتے آئے وہی کہتا ہے اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ مے و نغمہ تو جذبات کو بھڑکانے اور آتش عشق کو تیز کرنے والے ہیں۔ ان سے غم عشق اور زیادہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اندوہ ربا کہتے ہیں بہ لحاظ عمر ہم سے بڑے ہیں

اس لئے احتراماً انہیں کچھ نہ کہو۔

۴۔ دل میں آجاتے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کونسے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

غش : بیہوشی + نالۂ رسا : اثر کرنے والی آہ

فرماتے ہیں کہ دوست کی یاد میں آہ و زاری کرتے کرتے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور جونہی ہوش آیا دوست ہمارے دل میں آجاتا ہے۔ اس سے زیادہ آہ میں اور کیا تاثیر ہو سکتی ہے۔ اور دوسرا کونسا نالہ ہے جس کو رسا کہا جائے۔

۵۔ ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

سرحد ادراک سے پرے ہے : سمجھ سے باہر ہے + مسجود : جس کو سجدہ کیا جائے + قبلہ نما : مراد مرغ قبلہ نما : وہ نا ہے کا مرغ جس کا سر ہمیشہ قبلہ کے رخ رکھا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں سجدہ مسجود کو کیا جاتا ہے اور سجدہ کیلئے کسی ایک سمت کی ضرورت ہے اور وہ سمت قبلہ مقرر ہو چکی ہے۔ عوام قبلہ یعنی خانۂ کعبہ کو ہی مقصود بالذات سمجھکر اس طرف سجدہ کرتے ہیں مگر اہلِ نظر یہ سمجھتے ہیں کہ مسجود سمت و جہت سے پاک ہے اور اس کا وجود فہم و ادراک سے بالاتر اس لئے قبلہ ان کے لئے مقصود بالذات نہیں اسکو صرف راہ نما سمجھتے ہیں ان کے اس طرف سجدہ کرنے کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ وہ لامکان یعنی مسجود جہاں بھی ہو سجدہ اس تک پہنچ جائے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ "قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہراً مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا"

۶۔ پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیاہ کہتے ہیں

افگار : زخمی + مہر گیاہ : ایک بوٹی جس کی جڑ انسان نما ہوتی ہے۔ اس بوٹی کی تاثیر ہے کہ اگر آدمی پاس رکھے تو لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست میرے زخمی پاؤں کو دیکھکر جب سے تجھے ترس آگیا ہے اس وقت سے ہم خارِ رہ کو موجبِ آزار نہیں بلکہ موجبِ راحت سمجھتے ہیں۔ یہ کانٹے نہیں بلکہ مہر گیاہ کی بوٹی ہیں۔

۷۔ اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہمکو جو ہوا کہتے ہیں

فرماتے ہیں کہ ہمارے دل میں عشق کی ایک چنگاری ہے اس سے ہماری تشفی نہیں ہو سکتی ہم کو زیادہ آگ چاہیئے اسلئے ہم اس چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکانا اور آگ کے شعلے پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن کم فہم اور کم ہمت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہوا کے ذریعہ اس ایک چنگاری کی حرارت بھی دور کرنا چاہتے ہیں مطلب صرف اس قدر ہے کہ آہ اس لیے بھرتے ہیں کہ آتش عشق تیز ہو۔

۸۔ دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

نخوت، غرور، رنگ لانا، برائی کرنا، نام خدا کہنا، سبحان اللہ، ماشاءاللہ یا چشم بددور کہنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق پہلے سے مغرور اور پھر اس کی ہر بات پر ہمارا نامِ خدا کہنا۔ گویا کریلا پہلے ہی کڑوا اور پھر نیم چڑھا معلوم نہیں اس شوخ کی نخوت کیا برے نتایج پیدا کرے اور کتنا غضب ڈھائے۔

۹۔ وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

وحشت۔ غلام علی خاں وحشت مومن کے شاگرد تھے لیکن غالب سے عقیدت رکھتے تھے اور بے حد مانتے تھے۔ گویا ان کے شاگرد معنوی تھے۔

شیفتہ۔ نواب غلام مصطفےٰ خاں رئیس جہانگیر آباد المتخلص شیفتہ یہ بھی غالب کے معتقد تھے۔ مومن کے شاگرد۔ مومن کے انتقال کے بعد اپنا کلام مرزا کو ہی بتلایا کرتے تھے۔

مرثیہ۔ نوحہ، ایسی نظم جس میں کسی کی وفات کا حال اور رنج و غم بیان ہو۔ آشفتہ نوا، پریشان بیان اب کوئی بات محتاج تشریح نہیں ہے۔

غزل نمبر ۴

۱۔ آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں ہے گریبان ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

فرماتے ہیں کہ پھول جب تک گلشن میں درخت پر رہتا ہے وہ بارونق اور باعزت ہوتا ہے۔ ٹوٹ کر گلشن سے جدا ہونیکے بعد خراب اور برباد ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی قدر نہیں رہتی ننگ گلشن ہو جاتا ہے مگر گریبان عاشق کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر گریبان چاک ہو کر دامن تک نہ آجائے تو ننگِ پیراہن ہے اور جو چاک ہو کر دامن تک پہنچ گیا۔ اس گریبان کی قدر و منزلت کا کیا کہنا۔

۲۔ ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا، خون رنگ ہو کر اڑ گیا۔ عاشقوں کا رنگ اڑا ہوا ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ گریہ مزید خون کا مطالبہ کر رہا ہے اور آپ اس کو مخاطب کرکے اپنی مجبوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جسم میں جس قدر خون تھا یا تو بوجہ گریہ دامن میں آرہا یا رنگ بن کر اڑ گیا اب باقی ضعف ہی ضعف ہے۔ پھر تیرے لئے خون کہاں سے لاوں۔ (مصرعۂ ثانی کی داد نہیں دی جا سکتی)

۳۔ ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب — ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

یعنی آفتاب کی شعاعیں سوراخوں کے ذریعہ جب حجرے میں داخل ہوتی ہیں تو ان شعاعوں کے راستہ کے جملہ ذرے متحرک اور روشن نظر آتے ہیں۔ یہ تو عام گھروں کا واقعہ ہے لیکن یہی واقعہ اگر معشوق کے گھر سے متعلق ہو جائے تو پھر یہ ذرے، ذرے نہیں بلکہ نگاہ آفتاب کے اجزائے پریشان ہیں جو شوقِ دید میں جمع ہو ہو کر دوست کے گھر میں رقص کناں داخل ہو رہے ہیں۔

۴۔ کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے — پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

اندھیر ہے، غضب ہے + پنبہ ، روئی۔

فرماتے ہیں کہ زندان غم کی تاریکی بیان سے باہر ہے۔ تاریکی کیا ہے ایک غضب ہے۔ اگر تھوڑی سی روئی زندان غم کے کسی روزن میں رکھ دی جائے تو نور صبح دکھائی دیتی ہے اس سے باآسانی تاریکی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ رونق ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اس شعر کے ہر دو مصرعہ اپنی جگہ مستقل ہیں۔ مصرعہ اولی میں جو خیال پیش کیا گیا ہے۔ بالکل وہی خیال مصرعہ ثانی میں دوسرے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مصرعۂ اولی میں فعل مثبت ہے اور مصرعۂ ثانی میں منفی۔ التزام یہ رکھا گیا ہے کہ مصرعہ اولی میں جتنے لفظ ہیں۔ ہر لفظ کا مرادف المفہوم مصرعہ ثانی میں جمع کیا گیا ہے

رونق ، شمع۔ ہستی ، انجمن + عشق خانہ ویران ساز ، برق خرمن۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا یا عالم امکان کی چہل پہل اور رنگا رنگی نتیجہ ہے عشق کا اگر عشق نہ ہوتا تو

پھر دنیا کی رونق ہی نہ ہوتی۔

مولانا حالی مرحوم نے لکھا ہے یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی، خواہ اور کسی چیز کی پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اسکی مثال اس انجمن کی ہے جس میں روشنی نہیں (یادگار غالب)

۶۔ زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

چارہ جوئی = علاج، درد کم کرنے کی تدبیر + لذت = درد

فرماتے ہیں کہ میں تو زخم اس لئے سلوا رہا ہوں کہ زخم میں سوئی کے چبھنے سے نیا درد پیدا ہو۔ اور وہ دون ہمت رقیب یہ سمجھ رہا ہے کہ درد کم کرنے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

۷۔ بس کہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے — جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

گرد = خاک، ریت۔ بہار = پھول کھلنے کا موسم۔ بہار ناز = ناز و ادا کے پھول کھلانے والا یعنی معشوق

مطلب یہ ہے کہ ہم کو معشوق نے اس وقت مارا ہے جب کہ اس کا حسن بہار پر تھا اور ناز و ادا کے پھول کھل رہے تھے۔ مرتے وقت یہی تصور تھا اور مرنے کے بعد مدفن میں بھی یہی خیال ساتھ لے گئے اس لئے بجز جلوۂ گل ہماری قبر میں کچھ بھی نہیں ہے۔

۸۔ قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا — خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

ہیولیٰ = مادہ کی ابتدائی حالت۔ ناسور = ایسا زخم جو ہمیشہ رستا رہے۔ فارغ = خالی۔

شعرا نے دل اور آنکھ کو ناسور باندھا ہے۔

فرماتے ہیں کہ پرانے ناسور یعنی دل اور آنکھوں کا درد بھی پرانا ہو گیا۔ اب ان میں وہ لذت باقی نہیں رہی۔ اس لئے جسم کا ہر ہر قطرۂ خون ذوق درد سے تڑپ رہا ہے اور نئی لذت اور نئے ناسور کا مواد فراہم کر رہا ہے۔ یہی مواد اب ایک نئے ناسور کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

۹۔ لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری — موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

موج مے = مے، نخوت = غرور۔ قلزم آشامی = بلا نوشی، کثرت مے نوشی۔ رگ گردن = تکبر، غرور۔

رگِ جان، گریباں اس سے مراد شراب کی لکیر جو مینا کی گردن میں اوپر تک چڑھ آتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ ساقی کو اس بات پر بڑا گھمنڈ تھا کہ اس کے پاس شراب کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ہزاروں شیشے اور خُم بھرے رکھے ہیں لیکن جب ہم پینے پر آئے تو مے خانہ کے سارے شیشے خالی کر دیئے آج کسی شیشے میں شراب نہیں۔ ساقی کی نخوت بھی کافور ہو گئی۔

۱۰۔ ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود　　قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

فشار، قبر کا مردے کو بھینچنا۔ بول چال میں ہر چیز کے دباؤ کو فشار کہتے ہیں۔ نمود، یہ لفظ کثیر المعانی ہے اس شعر میں اس کے معنی ظہور "علامت"

مطلب یہ ہے کہ کمزوری اور ناتوانی کی متعدد علامات کے منجملہ ایک علامت قد کا جھکنا بھی ہے جیسے جیسے انسان ضعیف ہوتا ہے قد جھکتا جاتا ہے۔ گویا قد کا جھکنا ناتوانی کی نمود ہے۔

مگر شاعر فشار کے لغوی معنوں کو پیش نظر رکھ کر کہتا ہے کہ جس طرح مردے کو قبر چاروں طرف سے بھینچ دیتی ہے اور وہ قبر میں دراز لیٹا رہتا ہے۔ اسی طرح فشارِ ضعف نے مجھے بھی بے حس حرکت لٹا دیا ہے۔ لیٹے رہنے کی حالت میں قد کا جھکنا ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ہاں کھڑے ہوں یا بیٹھیں تو قد کا جھکاؤ نظر آئے۔ ضعف کا فشار بیٹھنے یا کھڑے رہنے نہیں دیتا تو پھر غلط کیا ہے کہ تن کے جھکنے کی گنجایش یا صورت باقی نہیں۔ جب ناتوانی کی نمایش قد کے جھکنے پر منحصر ہے تو پھر ہماری ناتوانی کی نمود یا ظہور کیسے ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ کثرتِ ناتوانی و ضعف سے ہماری حالت مردے کی سی ہو گئی ہے۔ پھر بھی لوگ ہم کو توانا سمجھتے ہیں۔

۱۱۔ تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

شان، قدر، عزت، غربت، مسافری۔ مشتِ خس، مٹھی بھر گھاس۔ گلخن، بھاڑ

فرماتے ہیں کہ میری حیثیت ایک مٹھی بھر گھاس کی ہے کہ جہاں رہا ذلیل و بے قدر۔ گھاس کے تنکے گھر میں پڑے رہیں تو جھاڑ کر باہر پھینک دئے جاتے ہیں اور باہر پڑے رہیں تو روندے جا کر مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ہاں مشتِ خس کی اگر عزت ہے تو بھٹی میں ہے۔ تنکے بھٹی میں پہنچ کر روشن ہو جاتے

ہیں اور ماحول کو بھی روشن کر دیتے ہیں۔ میرا حال بھی یہی ہے نہ وطن میں عزت اور نہ غربت میں قدر ہاں اگر فضلِ الٰہی ہو جائے اور آتشِ عشق سے منور ہو جاؤں تو پھر ہر جگہ قدر ہے۔

مولانا حالیؔ مرحوم نے یوں شرح فرمائی ہے:۔

"اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں" (از یادگار غالب)

غزل نمبر (۵)

۱۔ عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا　　گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

عہدے سے باہر آنا۔ عہدہ بر آ ہونا، حق ادا کرنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کے ناز و انداز کی مدح کا حق کون ادا کر سکتا ہے۔ ہر ادا کی مدح کا حق جان پیاری ہے اگر ایک ادا ہو تو اس پر سے جان قربان کر کے حق مدح ادا کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ہزاروں ادائیں ہوں وہاں مدح ناز کے عہدے سے باہر آنا محال ہے۔

۲۔ حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل　　ہر تارِ زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

حلقے، زلف کے شکن + نگہ سرمہ سا، سرمگیں تارِ نظر

زلف کے حلقوں کو آنکھ اور تارِ زلف کو تارِ نظر سے تشبیہ دی ہے۔ چونکہ تارِ زلف سیاہ ہوتا ہے اس لئے سرمہ سا کہا۔

مطلب ہے کہ معشوق کی زلف کے حلقے چشم ہائے کشادہ کی طرح میرے دل کو تاک رہے ہیں اور ان حلقوں کے تار تارِ نظر کا کام کر رہے ہیں۔

۳۔ میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　　تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

نوا، آواز۔ نوائے جگر خراش، آہِ دل سوز، نالۂ روح فرسا۔

مطلب ہے کہ میں ادھر ہزاروں جگر خراش نالے اور آہ و زاری کر رہا ہوں مگر اے دوست

ان نالوں کا تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو سنی اَن سنی کر کے چپ سادھے بیٹھا ہے۔ کیا کہا جائے۔ مجبوری ہے۔

۵ ۔ ظالم مرے گمان سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں

منفعل نہ چاہ ۔ شرمندہ و نادم مت کر ۔ خدا نکردہ ۔ خدا نخواستہ ۔ ہے ہے ۔ ہائے ہائے کا مخفف ہے۔

افسوس یا تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

یعنی میرا گمان تجھ کو بے وفا سمجھتا ہے اور میں باوفا کہتا ہوں گویا دونوں میں اختلافِ خیال ہے۔ اگر تیرے مظالم سے مجبور ہو کر خدا نخواستہ میری زبان سے بے وفا نکل جائے، تو گمان کی جیت اور میری ہار ہوگی اور گمان کے مقابلے میں مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا مظالم ترک فرمائے اور مجھے بے وفا کہنے کی ندامت سے بچا لیجئے۔

غزل نمبر (۶)

۱ ۔ مہربان ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

انسان کی خودداری کا یہ تقاضہ ہے کہ اگر کوئی بے التفاتی سے پیش آئے یا بد خوئی کا مظاہرہ کرے، تو دوبارہ اس کے پاس جانا گوارا نہیں کرتا لیکن یہ کلیہ عاشقوں پر صادق نہیں آتا ہر وقت معشوق کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہیں جھڑکیاں کھا کر نکل آتے ہیں۔ پھر بھی معشوق کی خدمت میں حاضری کا شوق ستاتا رہتا ہے۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ اب تو آپ بحالتِ غضب خفا ہو کر دور کر رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ فرمائیے کہ اس عتاب اور اس برتاؤ سے ہم شکستہ خاطر ہوئے ہیں۔ آپ کی خفگی جب دور ہو جائے یاد کر لیجئے۔ سر سے چلتے آئیں گے۔

۲ ۔ ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

اغیار ۔ غیر کی جمع ۔۔۔۔ فرماتے ہیں کہ مخالفین کی بری بھلی اور طعن و تشنیع کا گلہ کیا۔ اٹھاتے آئے ہیں اور بحالتِ ضعف بھی اٹھائیں گے بات سر تو نہیں جو بوجہ کمزوری نہ اٹھائی جا سکے حوصلے کی بلندی اور ظرف کی وسعت کا اندازہ کمزوری کی حالت میں ہی کیا جاتا ہے۔ کمزوری کی وجہ قوتِ برداشت بھی جاتی رہتی ہے اور انسان معمولی سی بات سے برافروختہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے

بحالت ضعف کسی کی بُری بھلی برداشت کرنا اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا، انتہائی جوانمردی ہے۔

۳۔ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے تیرے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

"جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہو پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اسکو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اسلئے کھا نہیں سکتا" (یادگارِ غالب)

غزل نمبر

۱۔ ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایکدن

کھل جانا: بے تکلف ہونا + عذرِ مستی: نشہ کا بہانہ۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست بوقتِ مے کشی ہم سے کسی دن بے تکلف ہو جاؤ۔ شراب نوشی کا لطف تو اسی میں ہے کہ سب یار گھلے ملے رہیں۔ یہ کھنچے کھنچے رہنا مناسب نہیں۔ اگر آپ ہماری بات نہ مانیں اور بے تکلف نہ ہو جائیں تو پھر ہم آپ کو چھیڑیں گے اور بحالتِ مستی جو بھی نازیبا حرکت ہم سے سرزد ہو وہ لایق بازپرس نہ ہوگی۔ مستی کا معقول عذر ہے۔

۲۔ غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکان نہ ہو اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن

غرۂ: عربی لفظ ہے جس کے معنی فریفتگی ہیں۔ اوج: ترقی یا بلندی + بنا: اسباب، عالم امکان: دنیا

فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے اسباب ترقی و بلندی پر فریفتہ مت ہو۔ یہ مال و دولت، امارت و حکومت، جاہ و حشم چند روزہ ہے اس کے بعد زوال ہے۔

۳۔ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

رنگ لانا: بُرے نتایج پیدا کرنا۔ فاقہ مستی: بحالت تنگدستی حرے اڑانا۔

فرماتے ہیں کہ تنگدستی و مفلسی میں روپیہ کہاں کہ نقد خرید کر شراب پیتے اس لئے ادھار شراب پیا کرتے تھے لیکن اس فاقہ مستی کے عواقب و نتایج سے بے خبر نہیں تھے۔ یہ جانتے تھے کہ مفلسی میں رنگ رلیوں کا نتیجہ بُرا ہوگا۔

جناب بے خود دہلوی نے مرآۃ الغالب میں لکھا ہے کہ :۔

" مرزا صاحب کے اس شعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا صاحب پر کسی دوکاندار نے قیمتِ شراب کی بابت نالش دائر کر دی تھی۔ مقدمہ مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ جواب دعویٰ میں مرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہکر پڑھ دیا۔ مفتی صاحب نے مدعی کو روپیہ اپنے پاس سے دیدیا اور مرزا صاحب کو عدالت سے رخصت کر دیا (ماخوذ از مرآۃ الغالب)

۴۔ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے ۔۔۔ بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایکدن

نغمہ ، ساز کے اعتبار سے نغمہ لایا ہے۔ مراد نالہائے غم ہے۔ ساز ہستی ، جسم انسانی + بے صدا ہو جائیگا ، بے آواز ہو جائیگا۔ فنا ہو جائے گا۔

فرماتے ہیں کہ انسان جبتک زندہ ہے نغمہ ہائے مسرت و نالہائے غم اس سے نکلتے ہیں۔ مرنیکے بعد پھر کوئی آواز نہیں نکلے گی۔ موت اس کو ہمیشہ خاموش کر دیگی اس لئے نالہائے غم ہی کیوں نہوں زندگی کی علامت ہیں پس اس کو بھی غنیمت جانئے۔

۵۔ دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ۔۔۔ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

شیوہ ، طرز ، روش ۔ پیش دستی ، پہل کرنا ، ہاتھ ڈالنا

کہتا ہے کہ ہمارے معشوق کی یہ روش نہیں کہ بلاوجہ کسی سے ہاتھا پائی اور دھول دھپہ کرے یہ ہمارا ہی قصور تھا کہ ایکدن ہم نے ہی پہل کی جس کے نتیجہ میں دھپے کھائے۔

غزل نمبر (۸)

۱۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۔۔۔ اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

گمان ، شبہ ۔ چھیڑ ، چھیڑ خانی ، ٹھٹا ، دل لگی ۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کو ہماری وفاداری کا کامل یقین ہے۔ پھر جو یہ جفا کی جاتی ہے وہ صرف ایک چھیڑ خانی اور دل لگی ہے۔ ہماری وفاداری کا امتحان مقصود نہیں۔

۲۔ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا ۔۔۔ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

پرسش، تحقیق، پوچھ گچھ، یہاں مراد مزاج پرسی، مزاج پرسی کے مختلف طریقے ہیں۔ زبان سے، خط و کتابت کے ذریعہ، کسی آدمی کی وساطت سے مگر سب سے زیادہ پرخلوص پرسش آنکھوں آنکھوں میں یا ہاتھ اور سر کے اشاروں سے کی جاتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ دوست نہایت محبت اور خلوص سے آنکھوں آنکھوں میں پرسش کر رہا ہے اس کے دلی لگاؤ اور لطف خاص کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسروں کی بھی مزاج پرسی ہوتی ہے مگر زبان سے۔ ہم کس طرح اس خصوصی لطف و کرم اور نوازش مخفی کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔

یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور الطاف کا ہم کیا شکر ادا کر سکتے ہیں جو ہماری خبر گیری تو فرماتے رہتے ہیں مگر نامعلوم اور غیر محسوس طریقے سے۔ استادی حضرت مولانا وحید الدین سلیم مرحوم سابق پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ ایک روز حسب معمول دیوان غالب کے مطالب سمجھا رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے تو تفہیم مطلب کے بعد فرمانے لگے "ایک سفر میں ریل کے جس ڈبے میں میں بیٹھا تھا ایک اور صاحب بھی خوش وضع و خوش لباس کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ خدا جانے کیا معاملہ تھا اور ان کے قلب پر کیا واردات گذر رہی تھی کہ زار و قطار روتے جاتے تھے اور دریچہ سے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ شعر پڑھتے تھے۔"

۴۳۔ ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز نامہربان نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ستم: ناز و غمزہ ــــــ مطلب یہ ہے کہ ہم کو معشوق کا ستم عزیز ہے اور چونکہ اس کے جور و جفا سہنے والا ہم سا کوئی نہیں اسلئے معشوق ہم کو پسند کرتا ہے۔ اس کی یہ پسندیدگی ہمارے حق میں مہربانی نہیں تو اور کیا ہے اسلئے اس کو نامہربان نہیں کہا جا سکتا۔

۴۴۔ بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

دہن: تنگی دہن خوبصورتی کی علامت ہے۔ اس لئے شعراء دہن کو تنگ کرتے کرتے اس کو جوہر فرد یا معدوم ہی بنا دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ہم تو بوسۂ دہن طلب کر رہے ہیں مگر آپ کو یہ عذر ہے کہ دہن کہاں جس کا

بوسہ دیا جائے خیر آپ ہی کی بات صحیح گالیاں تو دیجئے۔ اگر دہن نہیں ہے زبان تو ہے۔ پھر گالیاں ہی سہی۔ آپ کی گالیاں بھی موجب انبساط و تسکین خاطر ہیں۔

۵۔ ہر چند جانگدازیٔ قہر و عتاب ہے	ہر چند پشت گرمیٔ تاب و توان نہیں

۶۔ جان مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے	لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

جانگدازی: تکلیف۔ قہر و عتاب: خفگی مراد ظلم و ستم۔ پشت گرمی: تائید، سہارا، حمایت

مطرب: گانے والا۔ ترانہ: نغمہ، گیت۔ ہل من مزید۔ قیامت کے روز

جب گنہگار دوزخ میں داخل کئے جائیں گے۔ دوزخ پکارے گی۔ ہل من مزید۔ کیا کچھ اور ہے۔

یعنی ابھی میرا پیٹ نہیں بھرا اور کچھ زیادہ چاہیئے۔

پردہ سنج: نغمہ سنج، گانے والا۔ زمزمہ: نغمہ، ترانہ، گیت۔ الاماں: امان، پناہ، رحم

ہر دو شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ قہر و غضب اور ظلم و ستم سے جان نکلی جاری ہے اور تاب و توان کا سہارا و حمایت بھی حاصل نہیں، جو اس قہر و غضب کو برداشت کر سکے اس حالت ناتوانی میں بھی جان مزید قہر و عتاب کی خواہاں ہے اور لب کبھی امان اور رحم کی درخواست نہیں۔

۷۔ خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم	دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

۸۔ ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو	ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

آذر: آگ۔ نفس: سانس، آہ

فرماتے ہیں کہ اگر دل درد عشق سے دو نیم نہیں ہوا ہے اور آنکھوں سے خون نہیں بہتا ہے تو پھر ایسا دل کیا کام کا۔ خنجر سے سینہ چیر کر ایسے دل میں چھری چبھو دینا چاہیئے تاکہ درد پیدا ہو۔ پھر اسی خیال کو دوسرے لفظوں میں بیان فرماتے ہیں کہ اگر آتش عشق سے دل آتشکدہ نہیں بنا ہے اور آہ دل شعلہ بار نہیں تو ایسا دل سینہ کے لئے اور ایسی نفس دل کیلئے باعث ننگ و عار ہے۔

ان ہر دو اشعار کا حاصل یہ ہے کہ "بغیر عشق کے زندگی ہیچ ہے۔"

۹۔ نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب	سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مطلب یہ ہے کہ بحالتِ جنون گھر بار چھوڑ کر انسان بیابان میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ادھر گھر خراب و برباد ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی میں فائدہ ہے۔ گھر کی سو گز زمین کے بدلے صدہا میل وسیع بیابان مل گیا۔ نقصان کیا ہوا۔

۱۰۔ کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

سرنوشت: قسمت۔ جبین: پیشانی۔ بت: معشوق

یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کو سجدہ کرتے کرتے پیشانی پر گھٹے پڑ گئے ہیں۔ ستم ظریف تجاہل عارفانہ سے پوچھ رہا ہے۔ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ قسمت کا لکھا پیشانی سے نمایاں ہے پھر پوچھ کر کیوں دل جلاتے ہو۔ ہماری قسمت میں آپ کو سجدے کرنا لکھا ہے۔

۱۱۔ پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

داد پاتا ہوں: انصاف پاتا ہوں تحسین و تعریف حاصل کرتا ہوں۔ روح القدس و روح الامین حضرت جبرئیل علیہ السلام کے لقب ہیں۔ ہم زبان، ہمکلام، متفق الرائے۔

کہتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ میرے کلام کو کچھ کچھ سمجھ سکتے ہیں اس لئے پوری طرح میری رائے اور میرے کلام سے اتفاق نہیں کرتے لہذا داد بھی کچھ دیتے ہیں۔ اگر پوری طرح سمجھے ہوتے تو میری ہم زبانی فرماتے۔ اور دل کھول کر داد دیتے جب روح القدس ہی میرے کلام کی کماحقہٗ قدر نہ فرما سکیں تو پھر دوسرے کس قطار و شمار میں۔ اگر بیچارے نہ سمجھ سکیں اور داد نہ دیں تو ان پر گلہ کاہے کا۔

مولانا حالی نے اس شعر سے متعلق لکھا ہے:۔ یہاں ہم زبان کے لفظ میں ایہام ہے ظاہر معنے تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہوسکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں۔ (یادگارِ غالب)

۱۲۔ جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

بہا: قیمت۔ ابھی: یعنی غالب جب تک جاندار ہے۔ نیم جان: بے دم، بے جان، کمزور۔ ادھ موا
فرماتے ہیں کہ بوسہ کی قیمت جان ہی ہے۔ اس قیمت کو وہ خوب جانتا ہے اور یہ بھی جانتا

ہے کہ ہم یہ قیمت ادا کرسکتے ہیں۔ اس لئے بوسہ کی قیمت نہیں بتلاتا۔ اب وہ ظالم ہمارے نیم جان ہونے کا منتظر ہے۔ جب ہم ادائی قیمت کے قابل نہ رہیں تب کہے گا کہ جان دو اور بوسہ لو۔

غزل نمبر (۹)

۱۔ مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مانع دشت نوردی = صحرا گردی سے روکنے والی + چکر = گردش

فرماتے ہیں کہ میرے جنون اور بیابان گردی کا کوئی علاج کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یاروں نے پاؤں میں زنجیر ڈالی تا کہ دشت نوردی چھوٹ جائے۔ لیکن یہ زنجیر پاؤں کی چکر بن گئی اور صحرا گردی میں اضافہ ہوگیا۔

۲۔ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

شوق = عشق + دشت = مقام حیرت۔ جادہ = نشان راہ۔ نگہ دیدۂ تصویر = تصویر کی آنکھ کی نظر یا بینائی یعنے وہ چیز جو بوجہ تحیر مفقود اور گم ہے = معدوم۔

فرماتے ہیں کہ عشق اب ہم کو اس منزل میں دوڑا رہا ہے جس کا راستہ اس طرح معدوم ہے جس طرح چشم تصویر کی بینائی۔ مطلب ہے کہ عشق کے وسیلے سے مقام حیرت میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہم کو اپنی خبر بھی نہیں ہوتی پھر دوسری کیا چیز نظر آئے گی۔ اس منزل کا کوئی راستہ ہے اور نہ نظر وہاں کچھ کام کرسکتی ہے۔

۳۔ حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

مطلب ہے کہ وفا کے راستہ کی لیک تلوار کی دھار کے سوا کوئی دوسری نہیں۔ اور یہ اس قدر قریب ترین راستہ ہے کہ قدم رکھتے ہی طے ہوجاتا ہے یعنی تلوار کی دھار دم بھر میں قصہ تمام کردیتی ہے اور ہماری یہ آرزو کہ آزار کی لذت اٹھاتے ہوئے ایک عرصہ تک تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر مریں، باقی رہ جاتی ہے۔

۴۔ رنج نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

زبونی = ذلت + زبونی کشِ تاثیر = تاثیر کے احسان کی ذلت اٹھانے والا۔

فرماتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ کی نامرادی اور ناامیدی کی تکلیف گوارا ہے۔ اگر نالہ میں اثر نہ پیدا ہو اور کام نہ نکلے کوئی حرج نہیں ہیں اس بات سے خوش ہوں کہ میرا نالہ تاثیر کا ممنون احسان نہیں ہوا احسان سے بچنے کی خوشی ہمیشہ کی مایوسی کو گوارا کر دیتی ہے۔

۵۔ سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے — لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

سر کھجانا = پٹنے کی خواہش ہونا + باندازۂ تقریر نہیں = بیان سے باہر ہے

فرماتے ہیں کہ جہاں ایک زخم سر اچھا ہو گیا پھر دوسرے کی خواہش ہوتی ہے۔ بچوں سے پٹنے اور پتھر کے زخم اٹھانے میں جو لذت ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ زخم کے اندمال کے بعد جو خراش سی محسوس ہوتی ہے اسی کو سر کھجانا کہا ہے۔

۶۔ جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

کرم = معشوق کی مہربانی + رخصت = اجازت + تقصیر = قصور کوتاہی۔

فرماتے ہیں کہ جب معشوق ازراہ مہربانی گستاخی و بےباکی کی اجازت دیتا ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھانا عاشق کی سب سے بڑی کوتاہی ہے۔

۷۔ غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ جو میر تقی میرؔ کی استادی کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے یعنی اس کو سخن شناسی اور عقل و دانش کا کوئی حصہ نہیں ملا۔ بقول ناسخؔ میرا یہ عقیدہ ہے۔

لطف یہ ہے کہ میر کی استادی کا اقرار ناسخؔ کی زبان سے کیا جا رہا ہے۔

غزل نمبر (۱۰)

۱۔ مت مردمکِ چشم میں سمجھو یہ نگاہیں — ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمکِ چشم = آنکھ کی پتلی۔ سویدائے دل = دل کے سیاہ دھبے۔

مطلب ہے کہ حسرت کا تعلق صرف دل سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی ہے۔ حسرت کے ساتھ

آہوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ دل کی حسرت تو نالہ و آہ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن آنکھوں کی حسرت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ آنکھ کی آہیں اس کی نگاہیں یا تار نظر ہیں۔ پس آنکھ کو بھی ایک دل ہی سمجھو۔ آنکھ کی پتلی کو سویدائے دل اور نگاہوں کو آہیں۔

غزل نمبر (۱۱)

۱۔ برشکال دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے ۔۔۔ کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چمن

برشکال: برسات۔ چمن: خانہ باغ۔

اس شعر میں گریۂ عاشق اور موسم برسات کے اثرات کا تقابل ہے۔ برسات کے موسم میں دیوار چمن کسی ایک جگہ سے گر پڑتی یا تڑخ جاتی ہے۔ لیکن گریۂ عاشق کا یہ اثر ہے کہ گل کی طرح دیوار چمن سو جگہ سے کھل گئی ہے۔ یعنی گریۂ عاشق کے مقابلے میں بارش کی کوئی حقیقت نہیں۔

۲۔ الفت گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی ۔۔۔ سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

وارستگی: آزادی۔ سرو چونکہ بغیر پھول اور پھل کے ہوتا ہے اس لئے آزاد سمجھا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ الفت گل میں نہ صرف بلبل بلکہ سبھی سب گرفتار ہیں کوئی اس سے آزاد نہیں سرو جو آزادی کا دعویٰ کرتا ہے غلط ہے اگر الفت گل سے آزاد ہوتا تو گرفتار چمن نہ ہوتا۔ اس کا پابند چمن رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھی گل کا عاشق اور گرفتار الفت ہے۔

"مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد اور وارستہ مزاج ہو دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا" (از یادگار غالب)

غزل نمبر (۱۲)

۱۔ عشق تاثیر سے نومید نہیں ۔۔۔ جاں سپاری شجر بید نہیں

جاں سپاری: جان کسی کے حوالے کرنا، جان دینا۔ شجر بید: بے ثمر: بے نتیجہ۔ بید کے درخت ستر ہ قسم کے ہوتے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو برگ و بار نہیں ہوتا۔

یعنی عشق میں جان دینی پڑتی ہے۔ جان دینی شجر بید کی طرح بے نتیجہ اور بے ثمر تو نہیں۔

جان سپاری کا ثمر وصال محبوب ہے۔ جو حل کر رہے گا۔ لہٰذا عشق تا ثیر سے مایوس و محروم نہیں ہوسکتا۔

۲۔ سلطنت دست بدست آئی ہے　　　جام مے خاتم جمشید نہیں

دست بدست: ہاتھ میں ہاتھ دینا یعنی مرشد سے بیعت کرنی۔ خاتم۔ انگشتری سلطنت، فقیری دولت عرفان۔ جام مے: شراب معرفت، فقیری

فرماتے ہیں کہ حقیقی بادشاہت، علایق و افکار دنیوی سے آزادی کا نام ہے جو بغیر عشق کے حاصل نہیں ہوتی اور یہ بادشاہت صرف فقرائے اہل دل کا حصہ ہے۔ رموز معرفت و رازہائے عشق ایک فقیر سے دوسرے فقیر کو سینہ بہ سینہ بیعت کے ذریعہ ملتے آئے ہیں۔ ہر شخص عشق اور مرشد کامل کے وسیلہ سے سلطنت فقر کا مالک ہوسکتا ہے۔ یہ بادشاہت دنیاوی بادشاہت نہیں کہ نگیں پر جس کا نام ہو وہی تنہا بادشاہ اور دوسرے سب محروم اس کے برعکس جام مئے عرفان کو جملہ میخوار مالک ہوسکتے ہیں۔

۳۔ ہے تجلی تری سامانِ وجود　　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

تجلی: پردہ ہٹنا، نور، روشنی۔ سامان وجود: باعثِ کون و مکان، موجب ہستی۔ پرتو۔ نور، روشنی، فروغ۔ فرماتے ہیں کہ یہ عالم کون و مکان، دنیا اور اس کی موجودات تیری ہی تجلی اور تیرے ہی نور کا نام ہے۔ اگر تیرا نوران پر پرتو فگن نہ ہو تو یہ سب عدم ہی عدم ہیں۔ جس طرح ذروں کا وجود خورشید کی شعاعوں سے ثابت ہوتا ہے اگر خورشید نہیں تو ذرے بھی معدوم ہیں۔

۴۔ رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید: پتا، سراغ، راز۔

فرماتے ہیں کہ ہماری معشوق سے محبت ایک راز پوشیدہ ہے جس کا عوام کو علم نہیں۔ اگر ہم مر جائیں تو یہ راز فاش ہو جائے گا اور سب کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں کی محبت میں جان دی اس سے معشوق کی رسوائی کی ایک صورت پیدا ہو گی۔ ہمارے نہ مرنے میں یہی راز ہے۔ ورنہ جان دینی کوئی بڑی بات نہیں۔

"بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو۔ خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے"

(از یادگار غالب)

۵۔ گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

گردش: انقلاب۔ رنگ طرب: عیش کی حالت

اس شعر میں انسانی فطرت کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو سامان نشاط و طرب میسر ہی نہ ہو۔ تمام عمر اسی محرومی میں گزر جاتی ہے اور کبھی اس کا رنج و احساس اس کو نہیں ہوتا۔ دیکھو مزدور اور حبز معاش لوگ کس ہنسی خوشی سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس خوش حال، مال دار اور امراء ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کہ جو اسباب عیش ان کو حاصل ہیں کہیں گردش زمانہ سے جاتے نہ رہیں

۶۔ کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

فرماتے ہیں کہ یہ ایک عام کہاوت ہے کہ "زندگانی بامید قایم" اگر یہ سچ ہے تو ہوا کرے اوروں کے لئے امید باعث زندگی ہو سکتی ہے ہمارے لئے نہیں۔ اس لئے کہ ہم کو جینے ہی کی امید نہیں پھر دوسری امیدوں سے کیا سروکار۔

"یہ شعر سہل ممتنع ہے اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے" (از یادگار غالب)

۷۔ میکشی کو نہ سمجھ بے حاصل بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

بے حاصل: بے ثمر۔ عرق بید: عرق بید مشک، درخت بید کی ایک قسم بید مشک ہے۔ جس کے پھولوں کا عرق دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مفرح ہے مگر اس شعر میں "بے حاصل" کی رعایت سے اس کا مفہوم ہے کیفیت ہے۔

فرماتے ہیں کہ مے کشی بڑے کام کی چیز ہے اس کو بے حاصل مت سمجھ۔ شراب سے کیفیت بے خودی طاری ہوتی ہے جو دنیا جہاں کی فکروں سے آزاد کر دیتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بادہ عرق بید نہیں جس میں سرور اور کیف نہ ہو۔

تصوف کے رنگ کا شعر ہے۔ مے کشی سے شراب نوشی نہیں بلکہ عشق مراد ہے۔

غزل نمبر ۱۳

۱۔ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ‏ ‏ ‏ خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

خیابان ۔ کیاری مراد باغ ۔ ارم ۔ جنت ۔ خیابان خیاباں ارم ۔ صدہا گلستانِ ارم

فرماتے ہیں کہ دوست کے نقشِ قدم ہماری آنکھوں کے لئے وہی سامان نشاط فراہم کرتے ہیں جو باغہائے جنت فراہم کرتے ہیں۔ دوست کے ہر نقش قدم میں ہم کو ایک گلستان کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یا جس مقام پر معشوق قدم رنجہ فرماتا ہے وہ مقام ہمارے حق میں باغ جنت ہوجاتا ہے۔

۲۔ دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے ‏ ‏ ‏ سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

دل آشفتہ ۔ عاشق ۔ خال ۔ تل ۔ کنج دہن ۔ گوشۂ دہن ۔ سویدا ۔ خال، نقطۂ سیاہی اندک ۔ عدم ۔ دہن معشوق ۔ سیر ۔ تماشا ۔ لطف ۔

کہتا ہے کہ معشوق کے گوشۂ دہن کا تل اس قدر دل فریب ہے کہ عشاق اس کو دیکھ کر حیران و بے خود ہو جاتے ہیں۔ گویا عشاق کے لئے خال سویدا اور دہن عدم ہے۔ اس طرح وہ سویدا میں عدم کا تماشا دیکھتے ہیں۔

۳۔ ترے سروِ قامت سے یک قدِ آدم ‏ ‏ ‏ قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

مطلب ہے کہ اے دوست تیرا سرو قامت قیامت کے فتنہ کا ایک ٹکڑا ہے۔ قیامت کے فتنہ سے تیرے قامت کے ناپ کا ایک قد آدم ٹکڑا کاٹ کر تیرا سروِ قامت بنایا گیا ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ آپکے وجود سے پہلے فتنۂ قیامت جس قدر دراز تھا اب اسکی درازی میں ٹھیک آپ کے قامت کے ناپ سے ایک قد آدم کمی ہوگئی ہے۔ "اصل میں آپ کا سرو قامت اور قیامت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔" اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہیں اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ ایک قد آدم کم ہوگیا ہے۔" (یادگار غالب)

۴۔ تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ‏ ‏ ‏ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

محو آئینہ داری ۔ جو اپنے جمال اور بناؤ سنگھار میں محو رہے ۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو اپنے بناؤ سنگار میں ایسا مشغول ہے کہ تیری نگاہ بس آئینہ پر جمی ہوئی ہے۔ دوسری طرف دیکھتا ہی نہیں۔ ذرا آنکھ اٹھا کر ہمارا تماشا بھی دیکھ کہ کس تمنا کے ساتھ ہم تجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا محوِ حیرت ہو کر ارمان بھری نظروں سے تجھکو دیکھنا بھی ایک تماشہ ہے۔

۵۔ سراغ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ۔۔۔ کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

سراغ، نشان، پتہ۔ تفِ نالہ، نالہ کا سوز و گداز۔ شب رو، رات کے وقت چلنے والا۔ مسافر

داغِ دل، عشق، سوزِ دل۔

یعنی میرے نالہ ہائے نیم شبی شرر بار ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اس بات کی حیرت ہے کہ اس کے نالوں میں اتنی حرارت و سوز و گداز کہاں سے آ گیا۔ تو فرماتے ہیں کہ اس کا کھوج میرے داغ دل یعنی عشق سے چلا لو۔ جس طرح شب رو کے نقش قدم سے اس کا پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا تھا

۶۔ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ ۔۔۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ ہم نے فقیروں کا بھیس اس لئے نہیں بدلا ہے کہ بھیک مانگ کر کچھ منفعت حاصل کریں بلکہ ہم اہل کرم کا امتحان لینا چاہتے ہیں کہ واقعی وہ اہل کرم ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر ہیں تو ان کا کرم کس پایہ کا ہے۔

غزل نمبر ۱۴

۱۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۔۔۔ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

نار، آگ۔ التہاب، شعلہ کا بھڑکنا۔

فرماتے ہیں کہ یار کی صفت بھی غصہ سے بھڑک اٹھنے کی ہے اور آگ بھی بھڑک اٹھتی ہے اس لئے یار اور آگ دونوں میں التہاب مشترک ہے۔ جب یار کے بھڑکنے سے لذت و راحت حاصل ہوتی ہے تو اس کی ہم صفت نار کے جلانے سے بھی لذت و راحت حاصل ہوگی اس لئے اگر عذاب دوزخ میں مجھے راحت نہ ملے تو منکر و خطا ہو جاؤنگا۔

۲۔ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں ۔۔۔ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خراب = ویران، نکما، برا۔ کہتا ہے کہ اس ویران اور نکمی دنیا میں کتنی مدت سے ہوں اس کا حساب لگانا مشکل ہے۔ اگر ایک شب ہجر کی درازی ایک ہزار برس ہی شمار کریں تو ہزاروں شب ہجر کے لاکھوں برس ہو جائیں گے۔ یہ تو صرف راتوں کا حساب ہے۔ اس میں دنوں کو بھی جوڑا جائے تو مدت کا حساب نہیں بتایا جا سکتا۔

۳۔ آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

فرماتے ہیں کہ معشوق بڑا ظالم ہے۔ ہمارے پاس نہ آ کر علحدہ تڑپاتا ہے اور اگر بھولے سے خواب میں آ گیا تو آنیکا وعدہ کر کے تمام عمر کی نیند اچاٹ دی۔ ہر حالت میں ستانا منظور ہے۔

۴۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

"جو لکھیں گے" اس سے دو خیال اخذ ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے خط کا کوئی جواب نہیں دیں گے۔ یا یہ کہ میں نے جو درخواست کی ہے وہ منظور نہ ہوگی۔ اس لئے ایک دوسرا خط قاصد کے واپس آنے سے پہلے لکھ رکھوں تاکہ قاصد کو مکرر دوڑانے میں تاخیر نہ ہو۔

"دوسرے مصرعہ میں بطور طنز کے کہا کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے۔ یعنی وہ کچھ نہیں لکھیں گے اس لئے قاصد کے آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں" (از یادگار غالب)

۵۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فرماتے ہیں بزم معشوق میں ہم ہمیشہ محروم ہی رہتے۔ کسی وقت ساغر ہم تک نہیں پہنچا۔ آج خلاف معمول پیالہ ہمکو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ ساقی نے رقیبوں کی سازش سے کچھ ملا تو نہیں دیا۔

مولانا حالی نے یادگار غالب میں اس شعر کی یوں تحسین فرمائی ہے۔ "اس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں۔ محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔"

حضرت غالب نے بھی اپنے ایک مکتوب میں جو منشی ہرگوپال تفتہ کا موسومہ ہے اس شعر

کو بطور مثال کے پیش کیا ہے" غالب کہتا ہے سہ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام + ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں" یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں" یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھیگا وہ جانیگا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑتا جاتا ہوں مگر سہ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ یہ فرق البتہ وجدانی ہے بیانی نہیں۔" (ماخوذ از اردوئے معلیٰ)

۶۔ جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے ۔۔۔ کیوں بدگمان ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

منکر وفا: جو محبت و وفا کو نہ مانے + فریب: جھوٹی محبت کا دھوکا۔

فرماتے ہیں کہ مجھ جیسے سچے عاشق کی دہاں کچھ پیش نہیں جاتی تو دشمن کی محبت کا دھوکہ وہ کیونکر کھائے۔ دشمن کے تعلق سے معشوق سے بدگمانی عبث ہے اس لئے کہ وہ تو بوالہوس ہے۔

۷۔ میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے ۔۔۔ ڈالا ہے تمکو وہم نے کس پیچ و تاب میں

مطلب یہ ہے کہ آپکے بہت سے چاہنے والے ہیں۔ اس لئے مجھکو وصل میں بھی رقیب کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ میرے اضطراب کی وجہ تو ظاہر ہے۔ لیکن آپکے پیچ و تاب کھانے کی وجہ غیر ظاہر ہے۔ مجھکو بجز آپکے اور کسی سے محبت نہیں پھر کیوں وہم کرتے ہیں کہ میرے اضطراب کی کوئی اور وجہ ہے۔

۸۔ میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے ۔۔۔ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

یعنی میرے یہ نصیب کہاں تھے کہ مجھے حظ وصل حاصل ہوتا۔ غیب سے اللہ نے اسباب بنا دئے اس غیر متوقع خوش بختی پر میں آپے سے باہر ہوگیا اور جان نذر کرنی بھول گیا۔

۹۔ ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ۔۔۔ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

طرف نقاب، گوشۂ نقاب + یعنی معشوق کے نقاب کے ایک گوشہ میں جھری پڑی ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ معشوق کی تیوری چڑھی ہوئی اور ماتھے پر شکن پڑے ہوئے ہیں۔ ماتھے کے شکن ہی نقاب کی جھری کے باعث ہیں۔

۱۰۔ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔۔۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

نگاہ چرانا = آنکھ بچانا + لگاوٹ = تعلق، پیار

"یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اسکے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرع بہم پہنچ گئے جن میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب و دلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے مگر اس کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے مرزا کا کلام سنکر اکثر الجھتے تھے اور ان کی طرز کو نام رکھتے تھے اس روز اس شعر کو سنکر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کہا گیا کہ مرزا غالب کا چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا۔ اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔" (از یادگار غالب)

۱۱۔ وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے؟ جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

۱۲۔ وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے؟ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

سحر = جادو + مدعا طلبی = مقصد براری + سفینہ = کشتی + سراب = ریگستان میں آفتاب کی تمازت سے لہریں اٹھتی ہیں جو دور سے جھیل یا تالاب سی دکھائی دیتی ہیں۔

مطلب ہے کہ ہمارا ایسا جادو اثر نالہ جو آفتاب کے دل کو بھی دو نیم کر دے معشوق کو رتی برابر متاثر نہیں کرتا جس جادو سے سراب میں کشتی چلائی جا سکتی ہے حیرت ہے کہ اس کا کوئی اثر معشوق پر نہیں ہوتا اور نہ ہماری مقصد برآری ہوتی ہے۔

ہر دو شعر کے پہلے مصرعہ نالہ و سحر کی شدت تاثیر و حیرت کے اظہار کیلئے استفہامیہ رکھے گئے ہیں ذرا لہجہ بدل دیں تو لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے دونوں مصرعوں میں سارا زور لفظ "وہ" میں ہے۔

۱۳۔ غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

یعنی شراب تو چھوڑ دی ہے مگر روز ابر و شب ماہتاب میں دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ مجبوراً پینی ہی پڑتی ہے۔ (ظاہر ہے کہ چاندنی راتوں اور بارش کی پھواروں میں ہی شراب نوشی کا لطف ہے)

غزل نمبر ۱۵

۱۔ کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

کل = فردائے قیامت + خست = بخل + سوئے ظن = بدگمانی + ساقی کوثر = جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں کہ اے ساقی فردائے قیامت کے خوف سے شراب پلانے میں کوتاہی مت کر اور یہ خیال نہ کر کہ آج جو یہاں شراب پئیں گے کل شراب طہور سے محروم ہو جائیں گے۔ ساقی کوثر تو رحمت مجسم ہیں اس سراپا رحمت کے پاس یہ تخصیص کہاں کہ صرف زاہد و پارسا ہی شاد کام ہوں اور گنہگار تشنہ لب رہیں۔ وہاں تو رحمت عام ہے۔ اس قسم کا خیال حضور اکرم کی جناب میں گستاخی اور سوء ظن ہے

۲۔ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

کل = یوم تخلیق آدمؑ + فرشتہ = ابلیس + اس شعر میں حضرت آدم کی تخلیق اور عزازیل کے سجدہ نہ کرنے کے

واقعہ کی جانب اشارہ ہے۔

یعنی جناب باری تعالیٰ سے شکوہ فرماتے ہیں کہ آپ نے آدم اور اولادِ آدم کو خلافت سرفراز فرمائی فرشتے نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو ہمیشہ کیلئے مردود اور راندۂ درگاہ ہوگیا کل تک تو یہ اعزاز تھا۔ اور آج وہی آدمؑ کہ اس کی ذلت کی کوئی حد نہیں۔ آنا انقلاب عظیم کیوں ہے۔

۴۔ جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

دم۔ وقت۔ سماع۔ قوالی۔ چنگ ایک قسم کا باجا۔ رباب۔ سارنگی کی ایک قسم۔

فرماتے ہیں کہ اگر چنگ و رباب میں صدائے محبوب ہے تو پھر اس کو جان نواز اور روح پرور ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس سماع کے وقت دل بیقرار ہوجاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکلی جارہی ہے۔ یا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت حضرت آدم کا پتلا مٹی سے فرشتوں نے بنایا۔ تو روح کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا مگر روح راضی نہ ہوئی۔ تب اسکو راگ سنایا گیا راگ سن کر وہ آدم کے جسم میں داخل ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ جب راگ سنکر روح جسم میں داخل ہوئی تھی تو پھر اسی آواز سے کیوں نکلنے لگتی ہے۔

۵۔ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رخش۔ گھوڑا۔ رو میں ہے۔ تیزی سے رواں ہے۔

فرماتے ہیں کہ رخشِ عمر بڑی تیزی سے رواں ہے معلوم نہیں کہاں رکے۔ اس لئے کہ اس کا رکنا اور دوڑنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ نہ ہاتھ میں باگ ہے نہ رکاب میں پاؤں اس گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تو ہیں لیکن بے کس و مجبور محض۔ مطلب یہ ہے کہ عمر تیزی سے گزر رہی ہے معلوم نہیں موت کب آئے۔ موت اور حیات پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے اس شعر کی تحسین اس طرح فرمائی ہے:۔

" سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہوسکتا۔ اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کردینا ہے "
(از یادگارِ غالب)

۵۔ اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بعد ہے　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

پیچ و تاب = پریشانی، افکار دین و دنیا + وہمِ غیر = غیر حق ہونے کا خیالِ باطل

فرماتے ہیں کہ جب تک میں اپنے وجود کو ایک علٰحدہ وجود سمجھنے کی غلطی کرتا رہوں۔ اسی قدر اپنی حقیقت سے دوری ہوگی اور پیچ و تاب میں رہوں گا۔ اور جہاں اس غیریت کا وہم جاتا رہا اور صرف وجود حق کا خیال رہا۔ اپنی حقیقت کو پالیا۔

"غیر سے مراد یہاں ماسوا اللہ مراد ہے جو صوفیا کے نزدیک بالکل معدوم ہے اس لئے کہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں۔ اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے" (ابیادگار غالب)

۶۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود = حاضر و موجود + شاہد = مشاہدہ کرنے والا + مشہود = جس کا مشاہدہ کیا جائے + مشاہدہ = دیکھنا

+ وحدۃ الوجود اور وحدۃ شہود میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وجودی غیر حق کی نفی کرتے ہیں۔ اور شہودی کائنات کے وجود کا اثبات کرتے ہیں مگر اس تصریح کے ساتھ کہ کائنات کا وجود ظلی ہے۔ یعنی یہ کائنات یا حادث قدیم کا سایہ یا پرتو ہے۔ چونکہ یہ ظلی وجود جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں تجلیات سے متجلی ہوتا ہے اس لئے ان میں بھی حق کا مشاہدہ ہوتا ہے

شاعر جو وجودی مسلک کا حامی ہے اعتراض کرتا ہے کہ جب شہود یعنی شاہد و مشہود اصل میں ایک ہی ہیں تو پھر مشاہدہ بے معنی ہے۔ ہاں ناظر و منظور میں غیریت ہو تو مشاہدہ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے

۷۔ ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مشتمل = شامل ہونے والا، محیط ہونے والا + نمود = ظہور + صور = اشکال + کیا دھرا ہے = ہیچ ہے + کوئی حقیقت نہیں ہے + فرماتے ہیں کہ بحر میں جو مختلف صورتیں قطرہ، موج اور حباب کی نظر آتی ہیں ان سب میں بحر کا وجود ہی شامل ہے۔ موج، قطرہ، حباب بحر سے علٰحدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ یہی حال اس کائنات کا ہے جس کا وجود ایک ہی ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ناچیز ہونے کو ایک

عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا ہے، منتہائے بلاغت ہے" (ازیادگارِ غالب)

۸۔ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

ناز = فارسی میں اس کے معنی روئیدگی اور نوخیزی کے ہیں۔ روئیدگی میں نمائش ہے۔ یعنی کسی چیز کا حجاب سے باہر آنا + ادا = طرز، انداز + حجاب میں ہیں = شرم کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں شرم نمائش یا خود نمائی کا ایک انداز ہے خواہ دوسروں سے کی جائے یا اپنے آپ سے۔ شرم کا تقاضا نمایش ہے۔ مثلاً کسی سے شرما کر منہ پر نقاب لی جائے تو اس فعل میں انداز معشوقی کی نمود ہے۔ یہی حال شاہد حقیقی کا ہے۔ وہ تو محجوب ہے اور یہ کائنات اسی حجاب کی نمود۔ گویا دوست کا حجاب ہی کائنات کی بے حجابی اور نمود ہے۔

۹۔ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یعنی تخلیق کا سلسلہ جبتک قایم ہے آرائش جمال بھی جاری ہے۔ ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ گری ہے۔ یہ سب کچھ پردہ میں رہکر ہو رہا ہے یکے بعد دیگرے جو مخلوق خلق کی جارہی ہے۔ یہ اللہ کے علم میں ہے۔ اسی علم و ارادہ کا آئینہ سے استعارہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

" سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد رتبۂ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اسکو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل ہنیں ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال ہنیں ہوسکتی " (ازیادگارِ غالب)

۱۱۔ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

ندیم = ساتھی، دوست + بوتراب = حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بندگی سے مراد حب علی ہے۔ احکام وہدایات کی بجاآوری محض محبت سے ہوتی ہے۔
فرماتے ہیں دوست ہی دوست کی خوبو ہوتی ہے۔ چونکہ جناب بوترابؓ ولی اللہ یعنے
اللہ کے دوست تھے اس لئے ان کے احکام وہدایات کی تعمیل اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل
سے جدا نہیں اسلئے کہ فرامین علیؓ کتاب وسنت پر ہی مبنی ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ علی کی محبت اور
آپ کے احکام کا اتباع مشغول حق رکھتا ہے۔

غزل نمبر ۱۶

۱۔ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

رونا پیٹنا = ماتم کرنا + نوحہ گر = بوریا۔

فرماتے ہیں کہ دل اور جگر کا خون ہو چکا ان کا ماتم کرنا ضروری ہے۔ میں تنہا دونوں کا ماتم
کس طرح کروں۔ میں کسی ایک کا ماتم کر سکتا ہوں۔ البتہ کچھ فتوح ہو جائے تو کسی بوریئے کو دوسرے
کے ماتم کے لئے کرایہ پر بلوالوں۔

۲۔ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

نہ چھوڑا = اجازت نہیں دی + کدھر جاؤں = کیا تدبیر کروں بحالت تحیر بولتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ تیرا نام لیکر اگر پتہ دریافت کردں تو دوسرے لوگ بھی تیرے گھر سے
واقف ہوں گے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ تجھکو دیکھکر تجھ پر عاشق ہو جائیں۔ اسی خوف سے
تیرے گھر کا نام نہیں لیتا۔ بحالت حیرانی ہر ایک سے پوچھ رہا ہوں کہ کدھر کو جاؤں یعنی کیا تدبیر کروں۔
——یا—— یہ کہ دوست کے گھر جا رہے ہیں راستہ میں لوگ دریافت کر رہے ہیں کہ کہاں جاتے
ہو۔ رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دوست کے گھر کا ذکر کریں۔ بحالت حیرانی ہر پوچھنے
والے سے خود ہی دریافت کر رہے ہیں کہ میں کدھر کو جاؤں۔

۳۔ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اے کاش = حرف تمنا ہے + رقیب کے در پر جانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معشوق

کی آمد و رفت رقیب کے ہاں ہے اس لئے شوق دید میں وہاں جانا پڑتا تھا ـــــ یا ـــــ یہ کہ معشوق کے گھر کا راستہ رقیب کے گھر سے ہو کر گزرتا ہے اس لئے اس کے دروازہ پر سے جانا پڑتا تھا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس راستہ کو میں جانتا ہی نہیں۔ نہ اس طرف جاتا اور نہ رقیب کا در دیکھکر رشک وحسد سے جلتا۔

۴۔ ہو کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے ـــــ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

دہن کا چھوٹا ہونا اور کمر تپلی ہونا خوبصورتی کی علامات ہیں اس لئے شاعروں نے مبالغہ کرتے کرتے دہن کو جوہر فرد اور کمر کو بال سے باریک کر کے آخر میں دونوں کو معدوم ہی کر دیا۔ کمر کستا یا کس کے باندھنا۔ کسی کام کا مصمم ارادہ کرنا یہاں قتل کا ارادہ مراد ہے۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست آپ ہم کو قتل کرنے کے لئے کمر کس کر جو باندھ رہے ہیں۔ میں اس سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے کمر ہی نہیں۔ پھر کسے گیا اور قتل کیسے کریں؟

۵۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ـــــ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بے ننگ و نام = بے عزت و بے حرمت، "وہ شخص ہیں جس کا کوئی مقام نہ ہو۔

فرماتے ہیں کہ ہماری خستہ حالی کو دیکھکر رقیب تو پہلے ہی سے بے ننگ و نام کہا کرتے تھے لیکن اب تو معشوق بھی ہم کو بے عزت کہنے لگا ہے۔ حالانکہ راہ وفا میں گھر بار، دولت و ثروت لٹا کر بے نوا ہو جانا عین عزت ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ معشوق ہماری مفلسی و خستہ حالی کو پسند نہیں کریگا۔ تو ہم گھر بار لٹاتے اور نہ مفلس و قلاش ہوتے۔ شان و شوکت سے رہتے کہ وہ خوش ہو۔

۶۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ـــــ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

تیز رو = تیز روی اس بات کا گمان پیدا کرتی ہے کہ چلنے والا منزل سے واقف ہے۔

" طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھکر نظر آتا ہے

تو اس کا تعاقب کرتا ہے وہلم جرًا اور وجہہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا۔" (از یادگار غالب)

۷۔ خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

فرماتے ہیں کہ میں اس بت کو چاہتا ہوں اور کم فہموں نے میری چاہت کو پرستش سمجھ لیا شاعر نے اپنی انتہائی محبت وچاہت کا ثبوت پیش کیا ہے کہ لوگوں کو پرستش کا شبہ ہوتا ہے۔

۸۔ پھر بےخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

فرماتے ہیں کہ میرا ٹھکانہ کوئے یار ہے۔ مگر بےخودی ایسی غالب آگئی ہے کہ اپنے ٹھکانے کا راستہ بھول گیا۔ اگر راستہ یاد رہتا تو اپنی خبر لینے کوئے یار جاتا۔ پھر کا لفظ بتلا رہا ہے کہ بےخودی کا دورہ کوئی نیا نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی بےخودی کے دورے پڑتے رہے ہیں۔

۹۔ اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

فرماتے ہیں کہ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے متاعِ ہنر کو قابلِ قدر سمجھا۔ اور یہ خیال کر رہا ہوں کہ اہلِ دہر بھی میری طرح متاعِ ہنر کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ وہ میری طرح دیوانے نہیں کہ متاعِ سخن کی قدر کریں۔ قابلِ قدر مال ہے، دولت ہے، امارت ہے ان سب کو چھوڑ کر سخن و ہنر کی قدر کون کرے؟ شعر میں طنز ہے۔

۱۰۔ غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز — دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

سمند۔ گھوڑا + سوارِ سمندِ ناز۔ فخر کے گھوڑے پر سوار یعنی صاحبِ فخر و مباہات، صاحبِ شان و شوکت اقبال و جاہ کے ایسے مرتبہ پر فائز جس پر فخر کیا جا سکے + عالی گہر = عالی خاندان + علی بہادر = حضرت غالبؔ کے دوستوں اور قدردانوں میں سے ایک رئیس کا نام۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کا معصومہ ایک خط عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ دونوں کتابوں میں موجود ہے۔ اس خط میں ضمناً نواب علی بہادر کا ذکر اس طرح آیا ہے:۔ میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا . . . . وہ ہوا تھا میرے باندا ہو نذیل لکھنؤ آنے کا سبب۔ میں نے سب سامان سفر کر لیا۔ ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دیدیا . . . .

قصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے یہاں کی سواری میں باندے جاکر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بہ سبیل ڈاک دلی چلا آؤں گا ......"

دعائیہ شعر ہے مطلب ہے کہ خدا کرے کہ میں نواب علی بہادر کو جو میرا ممدوح ہے جاہ و حشم کی اس بلندی پر دیکھوں جس پر فخر و ناز کیا جا سکے۔

(ایک محترم شارح نے علی بہادر عالی گہر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات مراد لی ہے جو درست نہیں)

غزل نمبر ۱۷

۱۔ ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

منظور نہیں = پسند نہیں + بات بگڑنا = مطلب براری نہ ہونا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کو مجھ سے اور میرے نام سے اس درجہ نفرت ہے کہ میرا ذکر نیکی سے تو کجا اگر کوئی برائی سے بھی کرے تو سننا نہیں چاہتا۔ گویا میرا نام لینا اس کی محفل میں ایک جرم ہے۔ ایسی صورت میں رقیب میری شکایت کر بیٹھے تو بری طرح منہ کی کھائیگا۔ اسکی مقصد براری نہ ہوگی۔

۲۔ وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شوق = شوقِ شہادت ـــــ یعنی معشوق نے ہمارے قتل کرنے کی ایک آسان صورت نکالی ہے سیرِ گلستاں کا وعدہ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ اس مژدہ کے سنتے ہی ہم خوشی سے مر جائیں۔ یہ بات اس کے ذہن میں مقدر ہے جس کا اظہار اس نے نہیں کیا۔ اب تو ہمارے شوقِ شہادت کی قسمت جاگ اٹھی

۳۔ شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاہد = معشوق + ہستیٔ مطلق = وجودِ مطلق + منظور نہیں = جو نظر نہیں آتا۔

شاعری میں یہ تو مسلم ہے کہ معشوق کے کمر نہیں ہوتی۔ فرماتے ہیں کہ عالمِ امکان شاہدِ حقیقی کی کمر ہے۔ اس لئے ہم کو صرف شاہد ہی شاہد نظر آتا ہے اس کی کمر (عالم) ہم کو نظر نہیں آتی۔ یعنی شاہدِ حقیقی کے سوا اس عالم میں اور کچھ نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ وحدۃ الوجود کے قائل نہیں۔ خالق

و مخلوق کو علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ عین عالم ہے۔ خلاصہ یہ کہ "عالم" کو اور لوگ تو "عالم" ہی سمجھتے ہیں مگر ہم ہستی مطلق۔

۴ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تنک ظرفی = کم حوصلگی۔ تقلید = پیروی۔

فرماتے ہیں کہ ہماری حقیقت بھی وہی ہے جو منصور کی تھی۔ لیکن منصور اوچھا اور کم حوصلہ تھا بات نہیں پچ سکی چلا اٹھا۔ اور ہم ہیں کہ اس راز کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہے۔ ہم منصور کی تنک ظرفی کی تقلید کیوں کریں۔ مصرعہ ثانی میں منصور کے بعد "منظور" محذوف ہے۔

۵ حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

ذوق خرابی = شوق بربادی۔ پر عربدہ = جنگجو۔ گوں = لایق۔ تن رنجور = جسم بیمار۔ کم زور و ناتواں جسم

مطلب ہے کہ عشق طاقتور اور جنگجو پہلوان ہے۔ اس سے مقابلہ کرنے میں ہم کو بڑا لطف آتا ہے اس لئے اب تک اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن دوسری طرف شوق بربادی کا چسکا بھی تھا۔ اس شوق نے ہم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اب وہ طاقت و توان ہمارے بیمار جسم میں باقی نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب ہم عشق عربدہ جو کے مقابلے کے قابل نہیں رہے۔ اس کے مقابلہ کی حسرت باقی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اب عاشقی کے قابل نہیں رہے۔

۶ میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

رعونت = غرور، نخوت ـــــ فرماتے ہیں کہ معشوق کے مسلسل انکار محبت سے تنگ آ کر اور مایوس ہو کر ہم نے کہا کہ خیر اس دنیا میں نہ سہی آخرت میں تو ہم تم کو ضرور لیں گے۔ اس پر وہ شوخ نہایت لاپروائی و نخوت سے کہتا ہے کہ ہم حور کی طرح ذلیل نہیں جو جنت میں تمہارے ہاتھ آئیں وہاں تو حوریں دی جائیں گی جن کی ہمارے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں۔

۷ ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

لطف = مہربانی۔ دریغ آنا = افسوس ہونا، دل نہ چاہنا۔ کسی رنگ سے = کسی طرح سے۔ معذور = مجبور

تغافل۔ ظلم اور ظلم = تغافل۔

فرماتے ہیں کہ اگر التفات اور مہربانی کرنا نہیں چاہتا تو تغافل ہی سہی۔ تو کسی حالت میں تغافل کرنے سے مجبور نہیں۔ اس شعر میں ظلم تغافل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ عشاق کے لئے یہ بھی ظلم ہی ہے۔

۸۔ صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ　　　وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

صاف دردی کش پیمانۂ جم = جمشید جس پیمانہ سے ناپ کر شراب پیا کرتا تھا۔ اس پیمانہ بھر شراب صاف آسانی سے، پوری کی پوری بغیر ایک قطرہ چھوڑے پینے والے۔ لفظ صاف دردی کش کی صفت واقع ہوا ہے دُرد = شراب کی تلچھٹ مراد شراب۔ دردی کش = بادہ کش۔ پیمانۂ جم = جام جم۔ جام جم سے متعلق جہاں بہت سے افسانے مشہور ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اس جام میں اتنی زیادہ شراب سماتی تھی کہ بجز جمشید کوئی دوسرا اس جام بھر شراب نہیں پی سکتا تھا۔ افشردہ انگور = انگور سے نچوڑی ہوئی، مراد بنائی ہوئی۔

فرماتے ہیں کہ شراب نوشی میں ہم جمشید سے کسی طرح کم نہیں۔ بالفاظ دیگر شراب نوشی میں ہم جم کے قائم مقام ہیں۔ پھر ہم کو شراب بھی وہی ملنی چاہیئے جو جم پیا کرتا تھا یعنی انگوری شراب اگر انگور کی شراب کے سوا کوئی دوسری شراب ملے تو جانشین جمشید کے لئے قابل افسوس ہے۔ جمشید کے نام کو بٹا لگے گا۔

۹۔ ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ　　　میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ظہور = ظاہر ہونا۔ ظہوری میں یائے نسبتی ہے۔ ایک مشہور شاعر و ادیب کا تخلص جس کی ایک کتاب سہ نثر ظہوری بہت مشہور ہے۔ خفائی = ظہوری کی ضد یعنی گم نام و پوشیدہ۔ حجت = دلیل۔

فرماتے ہیں کہ ظہوری اپنے تخلص کی مناسبت سے بہت مشہور ہے۔ اس کے برعکس میں گمنام ہوں کوئی مجھے جانتا نہیں۔ اس اعتبار سے مجھے ظہوری کے مقابلہ میں خفائی کہنا مناسب ہے خفائی ہونے کی دلیل بھی واضح ہے۔

غزل نمبر ۱۸

۱۔ نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

فرماتے ہیں کہ اے ظالم ہماری آہ و زاری کا منشاء تقاضائے جفا ہے۔ کہ تو زیادہ سے زیادہ ظلم توڑے تو تو فطرۃً ستم پیشہ ہے کسی کو آہ و زاری کرتے اور تڑپتے دیکھ کر تجھ کو مزہ آتا ہے اور تڑپنا تیرے لئے اور زیادہ مظالم کی تحریک کا سبب ہوتا ہے۔ ہم تیری اس فطرت سے واقف ہو کر نالہ کر رہے ہیں تاکہ تو ظلم پر ظلم ڈھاتا رہے۔ اس کے برعکس اگر ہم صاف صاف یہ کہدیں کہ تو ستم کئے جا ہمیں لذت حاصل ہو رہی ہے تو فوراً ظلم سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ اس لئے طلب جفا کا ایک نیا ڈھنگ ہم نے نکال لیا ہے۔ پس ہمارا نالہ حسنِ طلب ہے نہ کہ شکوۂ بیداد۔

۲۔ عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

عشرت گہ خسرو = قصر شیریں۔

اس شعر میں فرہاد کے قصر شیریں میں کام کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

فرماتے ہیں کہ کہاں عشق اور کہاں رقیب کے گھر کی مزدوری۔ یہ تو عشق نہ ہوا بے حیائی ہوئی۔ اس لئے فرہاد کی اس نیک نامی کو کہ وہ ایک سچا اور باوفا عاشق تھا ہم تسلیم نہیں کرتے۔

۳۔ کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

وسعت معلوم = وسعت میں بہت کم ہے۔

فرماتے ہیں کہ دشت بھی ویران ہے اور ہمارا گھر بھی ویران ہے۔ ویرانی میں تو دونوں برابر ہیں۔ بہ لحاظ وسعت بیابان کے مقابلے میں گھر کی کیا حقیقت۔ کدھر.. اگز کا ٹکڑا اور کہاں ہزاروں میل کا بیابان۔ اس لئے بحالت جنون وحشت خرامی کا جو عیش بیابان میں حاصل ہو سکتا ہے وہ گھر میں کیسے نصیب ہو اور گھر کیوں یاد آئے۔

۴۔ اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

اہل بینش = اہل بصیرت، عقلمند۔ حوادث = جمع حادثہ، آفات۔ لطمہ = تھپیڑا۔ سیلی = طمانچہ، گردنی

مطلب ہے کہ آفات و حوادث کی کثرت انسان کی بصیرت اور عقل کو کامل کرتی ہے جن

لوگوں پر مصائب نہیں پڑتے اور وہ آسودگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی عقل اور رائے قابل بھروسہ نہیں اس لئے طوفان حوادث انسان کے لئے دانائی و حکمت حاصل کرنے کا مکتب ہے۔ اور اس طوفان کی ہر موج یعنی ہر حادثہ استاد کے ایک ایک طمانچہ کی مماثل ہے۔ جس سے علم و دانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۵۔ وائے محرومیٔ تسلیم و بداحال وفا   جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

وائے = افسوس۔ تسلیم = رضا۔ بدا = لفظ بد پر ا لگا کر بدا بنالیا ہے معنی یہ کہ برا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم معشوق کے ظلم و ستم پر راضی ہیں اور وفاداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ حرف شکایت زبان پر لائیں یا آہ و زاری کریں۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری تسلیم و رضا اور وفاداری کی عزت کرنیکی بجائے ظالم ان اعلیٰ صفات کو بے قدر و ذلیل کر رہا ہے۔ ہماری خموشی کا سبب تسلیم و رضا کی بجائے ناتوانی و ضعف سمجھ رہا ہے۔

۶۔ رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے   گر چراغان سر راہ گزر باد نہیں

تمکین = غرور، گھمنڈ، شان و شوکت۔

فرماتے ہیں کہ گل و لالہ کی تمکنت و گھمنڈ باقی نہیں بلکہ پریشان حالی ان پر چھائی ہوئی ہے یعنے بادخزاں کا خوف ان کو پراگندہ خاطر کر رہا ہے۔ گل و لالہ اسی بادخزاں کے راستے کے چراغ ہیں۔ جوں ہی خزاں کی ہوا چلنے لگی اور یہ سب چراغ گل ہو گئے۔

اس شعر میں رنگ، گل و لالہ، پریشان، چراغان، لفظی رعایتیں اور تشبیہات موجود ہیں۔ پھولوں کے کھلنے کو ان کی پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ بادخزاں کے خوف سے گل پریشان ہیں جوں ہی بادخزاں آئے جملہ برگہائے گل جھڑ کر بہار ختم ہو جائے گی۔

۷۔ سبد گل کے تلے بند کرے ہی گلچیں   مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سبد گل = پھولوں کی ٹوکری + فرماتے ہیں کہ گل چین بلبلوں کو پکڑ کر پھولوں کی ٹوکری

میں بند کر رہا ہے۔ جس سے پھولوں کا اتصال بلبلوں کو نصیب ہے۔ یہ بھی ایک گرفتاری ہے
لیکن اس میں معشوق کی قربت بھی میسر ہے۔ اس لئے یہ گرفتاری آزادی سے بہتر ہے۔ اگر
صیاد گرفتار کرے تو گلزار سے دور کسی قفس میں بند کر دے گا۔ گل و گلزار چھوٹ جائیں گے
اس لئے تمام مرغہائے چمن کو خوشخبری دی جارہی ہے کہ آئین اور گلچین کے ہاتھوں گرفتار
ہو کر سبد گل میں بند ہو جائیں۔ صیاد کے پکڑ کر لے جانے کا بھی خوف باقی نہ رہا۔ آج صیاد گلزار
میں نہیں ہے۔

۸۔ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اسکو دم ایجاد نہیں

تراوش کرنا = ٹپکنا، مترشح ہونا، ظاہر ہونا۔ جائے دہن = دہن کے بدلے۔ دم ایجاد = بوقت تخلیق

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے معشوق کو بوقت پیدائش دہن کے بجائے "نہیں" دی ہے
اس لئے ہمارے ہر سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ اس کا نفی میں جواب دینا اس کے دہن
کے اثبات کی دلیل ہے۔ گویا نفی سے اثبات ظاہر ہو رہا ہے۔ لفظ "اثبات" مذکر و مونث
دونوں طرح سے بولا جاتا ہے۔ اس لئے بعض نسخوں میں اظہار کو مذکر باندھا گیا ہے۔ یعنے
"اثبات تراوش" کرتا ہے۔

نفی، اثبات، گویا، دہن کی لفظی رعایتیں حسن شعر میں اضافہ کا باعث ہیں۔

۹۔ کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

جلوہ گری = رونق۔ تجلی، نمایش۔

فرماتے ہیں کہ تیرا کوچہ اور جنت، رونق اور خوبصورتی میں برابر ہیں۔ جنت کی بہار بھی
ایسی ہی ہے جیسے تیرے کوچہ کی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں عشاق کا ہجوم ہے اور وہاں
نہیں۔ یہ آباد ہے اور وہ غیر آباد۔

۱۰۔ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ — تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں؟

غربت = مسافری۔ بے مہری = بے وفائی، عداوت

کس منہ سے شکایت کرتے ہو۔ کیا شکایت کرتے ہوئے حجاب نہیں ہوتا۔ شکایت کا کوئی حق نہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے غالب تم جو مسافری کی تکالیف کی شکایت کر رہے ہو۔ تم کو اس کا کیا حق ہے۔ کیا وطن میں آرام سے تھے؟ یاران وطن کی دل آزاری اور عداوت بھول گئے؟ کیا وطن میں اس سے زیادہ تکلیف نہ پہنچا کی؟ اس لیے غربت کی مصیبت کا گلہ بے جا ہے۔

غزل نمبر ۱۹

۱۔ دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

"اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافتِ نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان لے کر خاموش ہو رہا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لیے خاموشی اختیار کی۔"　　(از یادگار غالب)

مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کے طالب تھے دونوں جہاں ہمارے کس کام کے جو خوش ہوتے۔

۲۔ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ہر مقام: مقامات سلوک ناسوت، ملکوت، جبروت وغیرہ۔

فرماتے ہیں کہ لوگ تیرے پتے میں نکلتے ہیں خوب جستجو و تلاش کرتے ہیں تو مجبوراً تھک کر کوئی پہلی منزل میں ہی رہ جاتا ہے۔ کوئی دوسری منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کوئی تیسری منزل میں رک جاتا ہے غرض تجھ تک رسائی بہت مشکل ہے۔

۳۔ کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم؟　　ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں؟

ہوا خواہ: بہی خواہ، دوست، ہمدرد۔

فرماتے ہیں کہ اہل بزم شمع کے دوست اور ہمدرد ضرور ہیں۔ لیکن شمع کا غم ایسا نہیں کہ اہل بزم باوجود غمخوار و دوست ہونیکے اس کا علاج و مداوا کر سکیں۔ وہ مرض جانگداز ہے جان لے کر ہی رہے گا۔ اور کسی کی دوستی کچھ کام نہ آئے گی۔ بس یہی حال انسانوں کا ہے دوست احباب، عزیز اقارب سب موجود ہوتے ہیں مگر کسی کی تکلیف دور کرنے کا ان کو مقدور نہیں۔

سب اسی کے ید قدرت میں ہے جس نے غم دیا ہے۔

غزل نمبر ۲۰

۱۔ ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر — عشق کا اس کو گمان ہم بے زبانوں پر نہیں

مطلب یہ ہے کہ رقیب نے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور جھوٹ سچ سے معشوق کو اپنی محبت کا یقین دلا دیا ہے حالانکہ اس کی چرب زبانی دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ اس کے برخلاف ہمارا عشق صادق ہے لیکن رقیب کی سی لفاظی ہم کو نہیں آتی خاموشی کے ساتھ محبت کئے جا رہے ہیں۔ ہماری خاموشی کا اثر یہ ہے کہ معشوق ہم کو عاشق نہیں سمجھتا۔

غزل نمبر ۲۱

۱۔ قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا — تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں

قیامت ہے، غضب ہے، فریاد ہے۔

فرماتے ہیں کہ اس ستم ظریف کی شرارت اور دل آزاری تو دیکھئے کہ جب ہم نے معشوق کے عاشقوں پر مہربانی کے واقعات سنائے اور لیلیٰ کے دشتِ قیس میں آنے کا واقعہ بیان کیا تو اس حقیقت کو جانتے بوجھتے کہ لیلیٰ سچ مچ مجنوں کے پاس گئی تھی، تجاہل عارفانہ سے پیش آ رہا ہے اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیا زمانے میں ایسا بھی ہوتا ہے؟ معشوق کا اس طرح پوچھنا قیامت ہے۔

۲۔ دلِ نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ — نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

مطلب یہ ہے کہ الفت کی آزمائش میں جان ہی دینی پڑتی ہے۔ اگر معشوق ہماری الفت کی آزمائش کرے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم جان دیکر آزمایش میں پورے اتریں گے۔ جان دینی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے اس کے دل نازک پر رحم آتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ محبوبہ کو مرتا ہوا دیکھکر اس کا دل متاثر ہو اور اس کو ملول و متاسف کر دے۔ اس لئے اس کافر کو سرگرم آزمائش نہ کرنا ہی مناسب ہے۔

غزل نمبر ۲۲

۱۔ دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

دل لگانا۔ عاشق ہونا۔ بے کسی ۔ مجبوری، لاچاری، تنہائی۔

فرماتے ہیں کہ اب وہ بھی کسی پر عاشق ہو گئے ہیں اور اپنے معشوق کی یاد و تصور میں تنہا بیٹھنے لگے ہیں۔ ان کے عشق میں بے کسی اور تنہائی کی جو کیفیت ہم پر طاری تھی اب وہ خود اسی تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اب ان کو معلوم ہو رہا ہے کہ دل لگانا کیسی بری بلا ہے۔ گویا ہماری بے کسی کی داد ہم کو مل رہی ہے۔

۲۔ ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

مطلب یہ ہے کہ جملہ کائنات مجموعی طور پر اور اس کے اجزاء انفرادی حیثیت سے زوال پذیر اور فانی ہیں چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً انسان، حیوان، نباتات وغیرہ کا زوال پذیر ہونا اور فنا ہونا تو روزانہ مشاہدہ کیا جاتا ہے اس لئے کہ ان کی عمریں چھوٹی ہیں۔ اور جن اجزائے کائنات کو خالق نے طویل عمریں بخشی ہیں۔ ان کی زوال پذیری کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وہ بھی اس عام کلیہ سے کہ "فنائیت سب کے لئے عام ہے" نہیں بچ سکتے۔ پس ہم بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آفتاب بھی جو نظام شمسی کا سب سے بڑا جز ہے کسی نہ کسی روز فنا ہو گا۔ ہوا کے راستہ کا چراغ ہے جو گل ہو کر رہے گا۔

"یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں چراغ رہگزار باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔" (از یادگار غالب)

غزل نمبر ۲۲

۱۔ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں کہ بحالت فراق ہم جو بار بار دیوار و در کی طرف دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم معشوق کے پیام کے منتظر ہیں۔ کبھی صبا کی راہ تکتے ہیں کہ دیوار پھاند کر دوست کی خبر ہم تک

لائے گی۔ کبھی نامہ بر کا انتظار کرتے ہیں کہ دروازہ کھٹکھٹائے گا اور دوست کا کوئی نامہ پہونچائیگا

۲۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں کہ معشوق کا خلاف توقع ہمارے گھر آنا محض خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اور ہمارے گھر آئیں۔ کبھی خوشی سے معشوق کو دیکھتے ہیں اور کبھی حیرت سے اپنے گھر کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس گھر میں آئے۔

"اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرعہ میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں ایسا شخص وارد ہوا۔" (از یادگار غالب)

۳۔ نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مطلب ہے کہ زخم نہایت کاری اور گہرا ہے جس سے کمال شمشیر زنی ظاہر ہو رہا ہے اگر لوگ ایسے زخم کو دیکھیں تو اس کے دست و بازو کو نظر لگ جائے گی۔

اصل منشاء شاعر کا یہ ہے کہ ایسا کاری زخم بھی ہم ہنسی خوشی برداشت کر رہے ہیں۔ اس حالت میں بھی صرف معشوق ہی کی فکر ہے۔ کیا بے پناہ وفاداری ہے!

مولانا حالی فرماتے ہیں "عشق حقیقی ہو یا مجازی اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔" (از یادگار غالب)

۴۔ ترے جواہر طرف کلاہ کو کیا دیکھیں — ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

طرف کلاہ۔ گوشۂ دستار۔ اوج۔ بلندی۔ طالع۔ قسمت

مطلب ہے کہ جواہرات دستار اور ان کی آب و تاب کی قدر و قیمت ہمارے لئے باعث کشش و التفات نہیں ہے۔ پھر ہم جو بار بار ان کی طرف دیکھ رہے ہیں اس کا موجب ہماری حیرت ہے کہ اللہ اکبر یہ جواہرات کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ان کی قسمت کی بلندی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یا تو تحت الثریٰ میں پڑے ہوئے تھے۔ زیب دستار ہو کر ان کے طالع فوق السما سے بھی بلند ہو گئے، یا یہ

کہ جواہرات کی دوست سے قربت پر ہم کو رشک ہو رہا ہے اسلئے جھلکبار بار انکو دیکھ رہے ہیں

غزل نمبر ۲۴

۱۔ نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں — شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

روزِ جزا: قیامت کا دن۔ روز و شب کا تقابل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں قیامت کا منکر نہیں ہوں میں مانتا ہوں کہ قیامت کا روز صد ہا سال کے برابر اور بڑا ہی جانکاہ ہوگا لیکن طولانی، رنج وغم اور انتظار کی تکلیف میں شبِ فراق بھی قیامت سے کم نہیں ہے۔ اس کا بھی منکر نہیں ہوں۔

۲۔ کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے — بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی کا لطف یا تو چاندنی رات میں ہے یا ابر و ترشح کے وقت دن میں۔ فرماتے ہیں کہ اگر دن میں ابر و باد نہیں جانے دو شراب نہ پئیں تو عذر معقول ہے، مگر کوئی بتلا دے کہ چاندنی رات میں شراب نوشی میں کیا برائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی قباحت نہیں ضرور پینی چاہئے۔

۳۔ جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں — جو جاؤں واں سے کہیں میں تو خیر باد نہیں

مرحبا: کلمۂ تحسین ہے۔ اظہار پسندیدگی اور خوشی کے موقع پر کہتے ہیں یہاں مراد خوش آمدید ہے۔

خیر باد: خدا حافظ، کسی کے رخصت ہوتے وقت، کہا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ معشوق انتہائی لاپرواہ، مغرور اور بدخو ہے۔ ابتدائی اخلاق سے بھی عاری ورنہ دنیا کا دستور ہے کہ اگر کوئی آئے تو اس کو خوش آمدید کہتے ہیں اور کوئی جائے تو رخصت کے وقت خدا حافظ کہا جاتا ہے مگر وہ ہماری آمد پر نہ خوش آمدید کہتا ہے اور نہ رخصت کیوقت خدا حافظ

۴۔ کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

پہلے تو یاد نہیں کرتے اور اگر کسی وقت بھولے سے یاد بھی فرماویں تو اس شان سے کہ آج فتنہ و فساد نہیں ہے گویا میرا نام اس نے فتنہ و فساد رکھا ہے۔ اس کی رائے میں بزم کا فتنہ و فساد میرے ہی سبب ہوتا ہے۔

۵ علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

فرماتے ہیں کہ دوسری جگہ بھیک صرف خاص دنوں میں ملتی ہے۔ مگر کوچۂ مے خانہ کے فقیر کو عید کے علاوہ دوسرے دنوں میں یا روزانہ شراب مل ہی جاتی ہے مے خانے کو آنے جانے والے مے خوار کو کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے ہیں اور وہ نامراد نہیں رہتا۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ طالب کو رموز معرفت کسی طرح مل ہی جاتے ہیں وہ نامراد نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ طلب صادق ہو۔

۶۔ جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام — دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

بہم: ملے ہوئے۔ کہتا ہے کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں خوشی بھی ہے اور غم بھی یعنی خوشی کیساتھ غم اور غم کیساتھ خوشی ملی ہوئی ہے۔ اگر اس دنیا میں ایسا ہے تو ہوا کرے ہم کو اس سے کیا غرض ہم کو تو صرف غم ہی غم ملا ہے۔ ہمارا دل کسی وقت خوش نہیں۔

۷۔ تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ — یہ کیا کہ تم کہو۔ اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

مطلب یہ ہے کہ جھوٹے وعدوں سے دھوکہ دینا معشوق کی سرشت ہے۔ اور پھر صدہا مرتبہ اس کا تجربہ بھی ہوا ہے۔ جب کبھی ہم نے اس کو اس کا وعدہ یاد دلایا تو صاف مکر گیا۔ اس کی فطرت سے واقف ہوتے ہوئے اور کئی ناکام تجربوں کے بعد پھر اس سے اس کے وعدہ کا ذکر کرنا بے فائدہ ہے پھر بھی وہ یہی کہدیگا کہ مجھے یاد نہیں۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔

غزل نمبر ۲۵

۱۔ تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

توسن: گھوڑا۔ باندھنا: نظیر دینا، تشبیہ دینا، لکھنا، تحریر کرنا، یہ لفظ کثیر المعانی ہے۔ ہوا باندھنا یہ محاورہ بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں شان و شوکت دکھانا یا شہرت دینا کہ دھاک باندھنا

فرماتے ہیں کہ ہم تیرے گھوڑے کو صبا سے تشبیہ دیکر اپنے مضمون کی شان و شوکت دکھاتے ہیں یا اپنے مضمون کی دھاک باندھتے ہیں۔

۲۔ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کس نے اثر دیکھا ہے؟ = یعنی آہ میں اثر ہوتا ہی نہیں

مطلب یہ ہے کہ آہ میں اثر تو ہوتا نہیں۔ اس کا ہمیں کامل یقین ہے۔ پھر یہ ہم جو آہ بھرتے ہیں اس کی غرض یہ ہے کہ معشوق کو ہماری محبت کا اعتبار ہو جائے جھوٹ موٹ اعتبار رجمانا چاہتے ہیں

۳۔ تیری فرصت کے مقابل اے عمر — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

اس شعر میں عمر اور برق کا تقابل ہے۔ عمر کے ثبات اور قرار کی مدت کے مقابلے میں برق کے قرار کی مدت زیادہ ہے۔ عمر برق سے زیادہ تیزی سے گذر جاتی ہے اور برق عمر کے سامنے پا بہ حنا ہے یعنی پاؤں کو مہندی لگائے ہوئے ہے۔ اس لئے نسبتاً سُست رفتار ہے۔

۴۔ قیدِ ہستی سے رہائی معلوم — اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی = غمِ ہستی۔ رہائی معلوم = رہائی محال ہے۔ بے سر و پا = حیران و پریشان جس کی ابتدا و انتہا معلوم

فرماتے ہیں کہ اشک رنج و غم کی علامت ہے اس لئے جب تک اشک جاری رہیں غمِ زندگی سے نجات ملنی مشکل ہے۔ ہاں اشکوں کا سلسلہ رُکے تو قیدِ ہستی سے چھٹکارا ملے لیکن اشک بے سر و پا ہے اسکے تھمنے اور ختم ہونے کی توقع نہیں اس لئے قیدِ ہستی سے بھی رہائی کی توقع نہیں۔ اسی خیال کو اور کئی جگہ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — مرنے سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۵۔ نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

رنگ = بہار۔ واشدِ گل = پھولوں کا کھلنا۔ مست = مخمور۔ بند = ڈوری۔ قبا = اچکن سینہ کُشادہ جامہ

بہار کے نشہ سے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ گویا اپنے قبا کے بندوں کو گلوں نے بحالتِ مخموری کھول دیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مست و مخمور لوگ قبا کے بند نہیں باندھتے۔

۶۔ غلطیہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں کہ شاعر بعض وقت نالے کو رسا یعنے با اثر لکھتے ہیں اس قسم کی تحریر یا مضمون غلط ہے۔ نالہ کبھی رسا نہیں ہوتا۔

۷۔ اہل تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

اہل تدبیر۔ دانا، عقلمند۔ واماندگی۔ عاجزی، لاچاری، مجبوری

اس شعر میں عقل و تدبیر کی بے بسی اور تکلیف اور عشق و جنون کی فراغت و آرام کا تقابل ہے

فرماتے ہیں کہ اہل دانش علاج کے طور پر آبلوں پر حنا باندھ کر اور بھی زیادہ مجبور و لاچار ہو جاتے ہیں اس کے برعکس عشاق بحالت جنون بیابانوں اور خارزاروں میں دوڑتے ہیں۔ کانٹوں سے آبلے بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور لذت بھی حاصل ہوتی ہے۔

۸۔ سادہ پرکار ہیں خوبان غالبؔ ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سادہ۔ کم سمجھ، سادہ لوح۔ پرکار۔ فریبی، چالاک۔ خوبان۔ حسینان۔

فرماتے ہیں کہ حسین دو متضاد صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ فطری تقاضے کے اعتبار سے پیمان وفا باندھ کر دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ سادگی اور کم عمری کا یہ نتیجہ ہے کہ "ہم سے" یعنی ہم جیسے تجربہ کاروں سے جوان کی ہر ادا اور ان کے رگ و ریشہ سے واقف ہیں پیمان وفا باندھتے آئے ہیں "ہم سے" استعجابًا اور زور دیکر پڑھا جائے تو مطلب صاف نکل آتا ہے۔

غزل نمبر ۲۶

۱۔ زمانہ سخت کم آزار ہے۔ بجان اسدؔ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

سخت کم آزار۔ بہت ہی کم آزار۔ بجان۔ قسم ہے جان کی اے اسدؔ

فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ جان کی قسم ہے کہ زمانہ بہت کم ایذائیں پہنچا رہا ہے ہم کو تو زیادہ مصائب پڑنے کی توقع تھی۔

غزل نمبر ۲۷

۱۔ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

دائم ۔ ہمیشہ ۔ خاک اور پتھر کی لفظی رعایت لطف سے خالی نہیں۔

فرماتے ہیں کہ میں تیرے سنگِ در کی طرح ہمیشہ تیرے در پر پڑا ہوا نہیں ہوں جہاں پتھر مجھ سے اچھا ہے تو پھر ایسی زندگی پر خاک پڑے ۔ جو پتھر سے بھی گئی گزری ہو۔

۲۔ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

گردش ۔ پریشانی ، آفت ، قسمت کی برگشتگی ۔ مدام ۔ ہمیشہ

فرماتے ہیں کہ پیالہ و ساغر بے جان اشیاء ہیں اگر وہ ہمیشہ گردش میں رہیں تو اس گردش سے ان کو کوئی تکلف نہیں۔ لیکن میں انسان ہوں کچھ عرصہ تک تو آفات برداشت کر لوں گا۔ مگر ساغر کی طرح ہمیشہ کی گردش ناقابل برداشت ہے مسلسل آفات سماوی و ارضی سے دل گھبرا جانا ضروری ہے

۳۔ یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حرفِ مکرر یا زائد حرف چونکہ سہواً لکھا جاتا ہے اس لئے تختی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

مٹانا ۔ نابود کرنا ، برباد کرنا ، محو کرنا ۔

فرماتے ہیں کہ اے خدا میں حرفِ مکرر کی طرح غیر ضروری اور زائد تو نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ پھر زمانہ حرفِ غلط کی طرح لوحِ جہاں سے کیوں مٹا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری تخلیق ایک بڑے مقصد کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے پھر زمانہ مجھے کیوں برباد کر رہا ہے۔ دوسرا لطیف خیال یہ ہے کہ دنیا میں میرا ثانی یا مجھ جیسا کوئی اور نہیں پھر زمانہ مجھ کو کیوں مٹا رہا ہے۔

۴۔ حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے　　آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

عقوبت ۔ ایذا ، تکلیف ، عذاب ۔

مسلمانوں کا عام اعتقاد ہے کہ جو خدائے واحد کا انکار کرے اور ایک سے زائد خدا مانے وہ منکر و مشرک ہے۔ سب سے بڑا گناہ ایک انسان کا اسلام میں شرک و انکار ہے اس لئے اس کی سزا بھی سب سے زیادہ ہے یعنی دائمی طور پر عذاب دوزخ میں رہے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ شرک و انکار سے بچیں مگر دوسرے کبیرہ و صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کریں ان کو ایک حد تک

عذاب ہوگا۔ اس کے بعد وہ معاف کئے جا کر جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں منکر خدا (کافر) نہیں ہوں اسکے باوصف دائمی عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرے ساتھ یہ ناانصافی کیوں ہے؟

۵۔ کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

عزیز۔ نایاب، قابل قدر، لائق عزت۔

چونکہ اس غزل کے مقطع میں بادشاہ کا وظیفہ خوار ہونا مذکور ہے۔ لہذا مقطع سے پہلے تینوں شعروں میں بھی بادشاہ کی طرف اشارہ ہے اور فخریہ کہے گئے ہیں۔ بعض شارحین نے ان اشعار میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب سمجھا ہے۔ یہ اس لئے درست نہیں کہ اس بارگاہ میں بجز عجز کے فخر کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر سہ اشعار انتہائی فخریہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اے شاہ ذی جاہ آپ کی نظروں میں مال و دولت زر و جواہر ذلیل و حقیر ہیں اس لئے ان کو عزیز نہیں رکھتے لیکن میں تو لعل و گہر کی طرح بے قدر نہیں ہوں پھر میری عزت کیوں نہیں کی جاتی۔ اس شعر میں بادشاہ کی سخاوت اور اپنے بے مثال کمال کو ایک خاص انداز سے ذکر کیا ہے۔

۶۔ رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

مطلب یہ ہے کہ مہر و ماہ کی شعاعیں تو آپکے قدموں تک پہنچ سکتی ہیں۔ کیا میرا مرتبہ مہر و ماہ سے کم ہے جو مجھے اپنی آنکھیں قدموں پر ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

۷۔ کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

آسمان ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔ آسمان کی یہ خمیدگی بادشاہ کی قدمبوسی کے لئے ہے۔ جب آسمان کو قدمبوسی کی اجازت ہے تو مجھ کو کیوں منع فرمایا جا رہا ہے میرا مرتبہ آسمان سے بھی بلند تر ہے۔

۸۔ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ایک زمانہ تک بادشاہ کے دربار سے آپ کو وظیفہ یا تنخواہ مقرر نہیں تھی۔ آخری زمانہ میں ماہانہ پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ کر کے خاندان تیموریہ کی تاریخ نویسی پر مامور کیا گیا تھا۔

فرماتے ہیں کہ اے غالب اب وظیفہ خوار ہو گئے ہو بادشاہ کو دعا دو۔ وہ زمانہ گذر گیا جب کہ

تم نوکر نہیں تھے ۔ اور کہتے تھے کہ میں نوکر نہیں ہوں ۔

غزل نمبر ۲۸

۱۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

فرماتے ہیں کہ جو بے شمار حسین خاک میں پوشیدہ ہیں ان میں سے کچھ لالہ و گل کا روپ بدل کر نمایاں ہو گئیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیسے کیسے خوبصورت زیر زمین ہیں ۔

۲۔ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بزم آرائی ۔ عیش و نشاط کی محفلیں گرم کرنی ۔ رنگا رنگ ۔ گوناگوں طرح طرح کی ۔ نقش و نگار طاق نسیان ہونا ۔ بھلا دی جانا ۔

فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ دل زندہ تھا اور گوناگوں بزم ہائے طرب گرم کی جاتی تھیں لیکن اب وہ محفلیں خواب و خیال ہو گئیں یا بھلائی جا چکی ہیں ۔ رنگا رنگ اور نقش و نگار میں لفظی رعایت رکھی گئی ہے ۔

۳۔ تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں — شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بنات النعش ۔ عقد ثریا ، پروین ، سات تاروں کا جھمکا ۔ عریاں ہو گئیں ۔ ظاہر ہو گئیں ، بے پردہ ہو گئیں

فرماتے ہیں کہ بنات النعش ساتوں کی ساتوں دن کے وقت پردے میں تھیں رات ہوتے ہی خدا جانے ان کے دل میں کیا بات آئی کہ یکایک سب بے پردہ ہو گئیں ۔

۴۔ قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر — لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب حضرت یوسف کی خبر گیری نہ کر سکے لیکن ان کے فراق میں روتے روتے ان کی آنکھیں اندھی اور بے نور مثل روزن دیوار زنداں ہو گئیں ۔

" یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار زندان قرار دیا ہے کس واسطے کہ جس طرح روزن زندان ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا ۔ اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگران رہتی تھیں (از یادگار غالب)

۵۔ سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے ۔۔۔ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ زنانِ مصر زلیخا کو ایک غلام پر عاشق ہونے کا طعن دینے لگی تھیں۔ زلیخا نے ان بیگمات کو قائل معقول کرنے کی یہ تدبیر کی کہ ان سب کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ہر ایک کو ایک چھری اور ایک ترنج دے کر یہ ہدایت کی کہ میں جب کہوں بیک وقت سب کی سب ترنج کو کاٹیں۔ اس وقت تک حضرت یوسف کو بازو کے کمرے میں چھپا رکھا تھا اور ان کو بھی یہ حکم دے رکھا تھا کہ بلانے پر فوراً مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوجانا۔ چنانچہ جناب زلیخا نے حضرت یوسف کو آواز دی جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے زنانِ مصر کو ترنج کاٹنے کا حکم دیا۔ سب عورتیں حسنِ یوسف سے ایسی مبہوت ہوگئیں کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا اور بجائے ترنج کاٹنے کے سبھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور اب ان کو محسوس ہوا کہ ان کا زلیخا کو الزام دینا ناواجبی تھا۔ یوسف کو دیکھنے کے بعد کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔ اس کامیاب انتقام سے زلیخا کو بڑی خوشی ہوئی۔

اب شعر کا یہ مطلب ہوا کہ سب عاشق تو رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں لیکن زلیخا اپنے رقیبوں یعنے زنانِ مصر سے اس لئے خوش ہے کہ انہوں نے دیدارِ یوسف میں محو ہوکر بجائے ترنج اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور اس کا مقصد و منشا پورا ہوا۔

۶۔ جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق ۔۔۔ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

جوئے خون اور شمع کی لو میں مشابہت ہے۔ شام کے وقت چراغ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ شامِ فراق میں خون بہانے دیجئے اس میں کوئی نقصان تو ہے نہیں خون فشاں آنکھوں کو میں دو روشن مشعلیں تصور کرلوں گا۔

۷۔ ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۔۔۔ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

پریزاد۔ حسین ۔ خلد۔ جنت + اگر یہی حسین جو ہم کو یہاں ستاتے ہیں اللہ میاں کی قدرت سے جنت میں حوریں ہوجائیں تو پھر خوب ہی انتقام لیا جائیگا۔

۸۔ نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اس شخص کی خوش قسمتی کا کیا کہنا جسکے بازو پر تیری زلفیں پریشان ہو جائیں وہ جس قدر فخر و غرور کرے سزاوار ہے۔ نیند کا آرام اور رات کا چین حقیقت میں اس کیلئے مختص ہے۔

۹۔ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

دبستان۔ مکتب + فرماتے ہیں کہ غزلخوانی میں میں بلبلوں کا استاد ہوں۔ میرے نالے سن کر بلبلیں اسی کی نقل آتارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جوں ہی میں نے چمن میں قدم رکھا یہ شاگرد جمع ہو گئے اور نغمہ سرائی کا مجھ سے درس لینے لگے۔

۱۰۔ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

مژگاں ہو گئیں۔ یعنے تار نظر مژگاں ہو کر رہ گئے ہیں۔ یا مژگاں سے آگے نہ بڑھے۔

مطلب یہ ہے کہ میری کم قسمتی ہے کہ وہ میری طرف نہیں دیکھتا نیچے نظر کئے ہوئے ہے میری طرف دیکھے تب نگاہیں دراز ہوں۔ باوجود نگاہ کی اس کوتاہی کے پھر بھی وہ انداز معشوقانہ دل کے پار ہوئے جا رہا ہے۔

"نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں" (از یادگار غالب)

۱۱۔ بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

بخیہ۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں (۱) پکی سیون یا دوہرا ٹانکا (۲) سرمایہ پونجی۔

شاعر نے اس شعر میں دوسرے ہی معنوں میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نے آہوں کو شدت سے ضبط کیا جو سینے میں مسلسل ابھر رہی تھیں۔ اس ضبط آہ کی وجہ وحشت اور جنون میں اضافہ ہو گیا اور میں نے اپنا گریبان چاک کر دیا۔ گویا چاک گریبان کا سرمایہ یا باعث یہی آہیں تھیں۔

۱۲۔ واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

"یعنی اب نئی دُعا تو کوئی ذہن میں باقی نہ رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا اس شعر میں جو اصل خوبی و لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونی ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ اس واسطے سبب حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جب کہ دعائیں نبٹ چکیں" (از یادگار غالب)

۱۳۔ جانفزا ہی بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

جانفزا = روح پرور، مسرت بخش + فرماتے ہیں کہ شراب روح پرور ہے۔ ہاتھ میں پیالہ آتے ہی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ گویا جان آگئی۔

۱۴۔ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم　　ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

موحد = صرف ایک وجود کو ماننے والا۔ کیش۔ طریقہ، مذہب۔ ترکِ رسوم۔ ظاہری عبادتوں کو ترک کرنا۔ ملت = مذہب، مخصوص عقائد و رسوم کی پابندی۔

" تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزاء ایمان بن جاتی ہیں (یادگار غالب)

۱۵۔ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

خوگر ہونا = عادی ہونا + مسلسل مشکلات و مصائب سے انسان تکالیف سہنے کا عادی ہو جاتا ہے گویا مشکل کا حل یہی ہے کہ مشکلیں زیادہ پڑیں۔

۱۶۔ یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

فرماتے ہیں کہ اگر غالبؔ اسی طرح روتا رہے یعنی گریہ کا طوفان برپا کرتا رہے تو اے دنیا والو دیکھ لینا سیلاب آجائیگا اور تمام بستیاں بہہ کر ویران ہوجائیں گی۔

غزل نمبر ۲۹

۱۔ دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں　　یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

مطلب یہ ہے کہ بت پرست کے لئے زنار کی ضرورت ہوتی ہے۔ عاشق بھی بت کی
پرستش کرتا ہے اس لئے اسکو بھی زنار چاہیئے مگر جنون و وحشت کی حالت میں گریبان
کے پرزے پرزے اڑ گئے اب جسم پر ایک تار بھی باقی نہ رہا زنار کہاں سے لائیں۔ اب
پرستش بغیر زنار کے کرنی پڑے گی۔

۲۔ دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے   دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

نیاز : نذر، تحفہ ـــ فرماتے ہیں کہ دیدار کی آرزو آرزو میں دل ختم ہو گیا۔ گویا
ہم نے اپنا دل تمنائے دید کی نذر کر دیا۔ اتنی آرزو اور ارمان کے بعد جب غور کیا تو محسوس ہوا
کہ معشوق کو دیکھنے کی تاب و طاقت ہی نہیں۔ لہذا حسرتِ دید میں دل کا نذر کرنا بیکار سا ہو گیا

۳۔ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے   دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

فرماتے ہیں کہ اگر تیرا ملنا ناممکنات سے ہے تو پھر بڑی آسانی ہے اس لئے کہ ناممکنات
کے حصول کی کوئی آرزو کرتا ہے نہ کوشش۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ تیرا ملنا محال بھی نہیں
اس لئے سعی اور سعی کے ساتھ مصائب و آفات کا سلسلہ جاری ہے۔

نوٹ :۔ ہم نے اس شعر کو حقیقت پر محمول کر کے یہ شرح لکھی تھی کہ خود استاد نے جو
تشریح فرمائی ہے نظر سے گزری جو ذیل میں درج کی جاتی ہے :۔

" اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی نہ
ہم مل سکینگے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں یعنے جس سے
تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا ہے۔ مگر رشک کو اپنے اوپر
آسان نہیں کر سکتے۔" (از مکتوب غالب موسومہ قاضی عبد الجمیل صاحب بریلوی)

" ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق
ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو دونوں صورتوں میں
مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس

ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جسطرح آسان نہیں۔ اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔"

(از یادگار غالب)

۴۔ بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

فرماتے ہیں کہ بغیر عشق کے زندگی بسر ہونی مشکل ہے۔ اس لئے کہ معشوق کے جور و جفا غمزہ و عشوہ کی لذتوں کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ اس کا چھٹنا محال ہے۔ دل چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ظلم اٹھاؤں۔ لیکن جس قدر خواہش آزار کی ہے تاب و تواں اس قدر نہیں کہ برداشت کر سکوں۔ یہ کشمکش اور دکھ سوا ہے۔

۵۔ شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

شوریدگی: جنون۔ وبالِ دوش: دوش کے لئے دوبھر

فرماتے ہیں کہ جنون کی وجہ سر وبالِ جان ہو گیا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ کسی دیوار سے سر ٹکرا کر پھوڑ دیں مگر مجبوری یہ ہے کہ شوریدگی بستی کی دشمن اس نے ہم کو صحرا میں پہنچا دیا ہے اور صحرا میں کوئی دیوار نہیں ہے کہ سر پھوڑ کر مر جائیں۔

۶۔ گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ہوس: ایک قسم کا جنون، دیوانگی، آرزو

فرماتے ہیں کہ ضعف کا یہ عالم ہے کہ دل میں دوست کی آرزو بھی نہیں دشمنوں کی عداوت کہاں سے سمائے۔ اپنی سینہ صافی کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں۔

۷۔ ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان — آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں؟

نوا: آواز، نالہ۔ زار: افراط، کثرت۔ نالہائے زار: کثرتِ گریہ ــــ خدا کو مان: اس بات پر اعتقاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ فریاد رس اور ظالموں کو سزا دینے والے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ خدا ترس لوگ جب پنجرے میں کسی پرندے کو تڑپتا اور نالہ کرتا دیکھتے

ہیں تو اس کے حال پر رحم کھا کر اس کو آزاد کر دیتے ہیں۔ میرے نالے ایک انسان اور عاشق کے نالے نہ سہی کیا مرغ گرفتار کی نوا کے مساوی بھی نہیں؟ کہ تجھکو میری گریہ وزاری پر رحم نہیں آتا اور ظلم سے باز نہیں رہتا۔ خدا سے ڈر کہ ایک روز ان مظالم کا جواب دینا پڑیگا۔

۸۔ دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

دل میں ہے = دل میں آرزو ہے یا ارادہ ہے۔ روکشی = مقابلہ

فرماتے ہیں کہ ایک کانٹے کی خلش کو برداشت کرنے کی تاب و طاقت باقی نہیں۔ اس ناتوانی کے باوصف دل میں قطار در قطار تیروں کا مقابلہ کرنیکی ہوس ہے۔ دل کی نادانی تو دیکھئے

۹۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سادگی = بھولاپن۔ نہ مر جائے = قربان ہو جائے، جان نثار نہ کر دے۔

فرماتے ہیں کہ دوست کے اس بھولے پن پر کون ہے جو اپنی جان قربان نہ کر دے کہ بغیر تلوار کے لڑتا ہے۔ اس سے زیادہ سادگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ لڑتے وقت ہاتھ میں تلوار نہ رکھے۔

۱۰۔ دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

خلوت = تنہائی۔ جلوت = سب کے سامنے ہونا، خلوت کی ضد۔

فرماتے ہیں کہ اسدؔ کو ہم نے خلوت و جلوت میں بارہا دیکھا اور اس کی طبیعت کا اندازہ لگایا صدہا تجربوں کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اگر دیوانہ نہیں تو ہوشیار بھی نہیں ہے یعنی عالم بیخودی وہ خود فراموشی میں رہتا ہے جو لوگ اس سے واقف نہیں اس کی اس خود فراموشی کو دیکھ کر دیوانہ سمجھتے ہیں۔

غزل نمبر ۳۲

۱۔ نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور میرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

بخیہ کے درخور = رفو کے لائق، ٹانکے دینے کے قابل۔

مطلب یہ ہے کہ زخم اتنے کشادہ اور اسقدر بوسیدہ ہو گئے ہیں کہ ٹانکے نہیں لگوائے

جا سکتے۔ سوئی اِن زخموں کو دیکھ کر مایوسی کے آنسو بہاتی ہے۔ اور یہی آنسوؤں کی لڑی چشم سوزن میں رشتہ بن جاتی ہے۔ یعنے سوئی ان زخموں کو سینے سے مایوس ہے۔ یا چشم سوزن میں جو رشتہ ہے خون کے قطروں کی وجہ تارِ اشک بن گیا ہے۔

۲۔ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی — کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

فرماتے ہیں کہ شوقِ تماشا میں ہم نے سیلاب گریہ آنکھوں سے بہایا تاکہ گھر ویران ہو جائے اور در و دیوار گر کر موانعات تماشا دور ہو جائیں سیلاب گریہ گھر کو تو ویران کر دیا مگر دیوار و در کو منہدم نہ کیا۔ اس کے برعکس دیواروں میں جو سوراخ یا جھروکے تھے کفِ سیلاب ان کو بھی بند کر دیا۔ گویا سیلاب گریہ کا نتیجہ الٹا نکلا۔ اب جھروکوں اور دیواروں کے روزن سے بھی باہر کے مناظر نہیں دیکھے جا سکتے۔

۳۔ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں — نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

فرماتے ہیں کہ میرے تن کے ہر قطرۂ خون میں مژگانِ یار نے معشوق کا نام کندہ کر دیا ہے گویا خون کا ہر ایک قطرہ یاقوت و لعل کا ایک دانہ ہے جس پر شاہد کا نام کھدا ہوا ہے اور یہ حلقہ نگین میرے ہی جسم میں امانتاً رکھے گئے ہیں اس طرح میں مژگانِ یار کی بیداد کاوش کا ودیعت خانہ بنا ہوا ہوں۔

۴۔ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ظلمت گستری = تاریکی۔ شبستان = لغوی معنی تو رات بسر کرنے کا مقام یہاں مراد محض گھر اس لئے کہ عاشق کا گھر بوجہ سیہ بختی ہمیشہ تیرہ و تار رہتا ہے۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ گھر کی تاریکی بیان نہیں کیجا سکتی۔ اگر دیواروں کے سوراخوں میں سفید سفید روئی رکھدی جائے تو گھر میں چاندنی سی معلوم ہونے لگے۔ اسی سے تاریکی کا اندازہ کر لیا جائے۔

۵۔ نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی — ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش = ملامت۔ مانع آنا = روکنا، منع کرنا۔ شورِ جنوں۔ جنون کا ولولہ۔

خندہ بہنبی میں سینہ سپید دانت، رفو کے ٹانکوں کی طرح نظر آتے ہیں اسلئے خندہ کو بخیہ سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ احباب کی ملامت، وطعن طعن کی وجہ و لولہ جنون میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے یعنی خندۂ ملامت سے پہلے جیب گریبان کے پاس اور دامن اپنی جگہ تھا جیب اور دامن میں کوئی ربط نہیں تھا لیکن خندۂ ملامت کا یہ اثر ہوا کہ جیب دامن سے آکر مل گیا اب جیب و دامن کی وہ بے ربطی باقی نہیں رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خندۂ احباب سے جنون میں شدت ہوگئی۔ گریبان کو اس حد تک چاک کیا کہ وہ دامن سے آکر جڑ گیا اور خندۂ دندان نمانے جیب کو دامن سے ملا کر بخیہ کر دیا۔

۶۔ ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے پر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

مہروش، خورشید رو یا خورشید جمال۔ جلوہ، ظاہر ہونا، نمودار ہونا۔ تمثال، تصویر، فوٹو، یہاں مراد عکس معشوق جو آئینہ میں منعکس ہو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جسطرح آفتاب کی شعاعوں میں ذرات رقص و حرکت کرتے ہیں اسی طرح جب ہمارا خورشید جمال معشوق آئینہ دیکھتا ہے تو اس کے نور جمال سے آئینہ کے جوہر بھی جگمگا اٹھتے اور ذروں کے مانند رقص کرنے لگتے ہیں۔

۷۔ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

نہ جانوں، میں اس سے واقف نہیں، میں تمیز نہیں کر سکتا۔

فرماتے ہیں کہ میں اس سے واقف نہیں یا تمیز نہیں کر سکتا کہ میں اچھا ہوں یا خراب۔ البتہ اس بات سے ضرور واقف ہوں کہ ماحول مخالف ہے یعنی میں اچھا ہوں تو ماحول خراب ملا ہے۔ اگر میں خراب ہوں تو ماحول اچھا ملا ہے۔

۸۔ ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھکو سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن میں

یعنی جنون عشق کی بدولت خلط سودا کا غلبہ ہے جس سے ہر قطرۂ خون سویدائے دل کی طرح سیاہ ہو گیا ہے گویا ہر قطرۂ خون ایک دل ہے۔ پس جوش جنون کی یہ کرم بخشی ہے کہ

اس نے ہزاروں دل دے دیے۔

۹۔ اسدؔ زندانیٔ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں   خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ حسینوں نے اپنی الفت و محبت کی تاثیر سے مجھ کو اپنا غلام و قیدی بنا لیا ہے۔ ان کا مہربانی اور نوازش سے گلے میں ہاتھ ڈالنا میرے لئے طوقِ غلامی ہے

غزل نمبر ۱۳۱

۱۔ مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں کہ دنیا کی کسی چیز میں ہم کو مزہ نہیں آتا۔ سب دنیوی لطف ہیچ ہے۔ البتہ کچھ مزہ آتا ہے تو خونِ جگر کھانے اور پینے میں۔ لیکن اس مزے سے بھی محروم ہیں۔ اس لئے کہ جگر میں خون ہی نہیں۔

۲۔ مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے   وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

گر = شاید ___ فرماتے ہیں کہ کوئے جاناں تک جانے کی طاقت بال و پر میں نہیں ہے شاید مرنے کے بعد ہماری خاک کو ہوا اڑا کر لے جائے تو لے جائے۔

۳۔ یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے   کہ غیر جلوۂ گل رہ گذر میں خاک نہیں

شمائل = جمع شمیلہ بمعنی خصلت، خصائل، شکل۔ بہشت شمائل = جس کی صورت بہشت سی حسین ہے یا جس کی صفات بہشت کی سی ہیں۔ خاک نہیں = کچھ بھی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق کی آمد آمد ہے۔ رہ رو سب کے سب اس کے جمال میں محو ہو گئے ہیں۔ بجز معشوق کے حسن کے اور کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ اس کے گلاب جیسے رخسار جلوۂ گل کا نظارہ پیش کرتے ہیں اس لئے سب کو جلوۂ گل ہی نظر آ رہا ہے۔

۴۔ بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا   اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

یعنی میری آہوں میں مطلق اثر نہیں ہے۔ اگر اثر ہوتا تو اس کو رحم آتا اور میری پریشانی دور ہو جاتی۔ یا کم از کم مجھی کو اپنے حالِ زار پر رحم آتا اور آہ و زاری کی تباہی سے اپنے آپ کو بچا لیتا۔

۵۔ خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

خراب ہیں = مست ہیں ـــــ فرماتے ہیں کہ میکشوں کی مستی کا باعث میخانہ یا مئے نہیں ہے بلکہ انکی مستی کا سبب تصورِ معشوق ہے۔ مئے خانہ اور مئے میں یہ اثر کہاں کہ وہ میخواروں کو بدمست اور خراب کر سکے۔ شراب سے تو معمولی سا نشہ و سرور رہتا ہے اور بس۔ بے خودی اور مستی تو صرف خیالِ یار سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ ہوا ہوں عشق کی غارتگری میں شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

شرمندہ = ممنون۔ احسانمند ـــــ فرماتے ہیں کہ عشق کی غارتگری کا میں احسانمند ہوں کہ اس نے کوئی چیز نہیں چھوڑی اور فکر و پریشانی سے بچا لیا۔ اگر کوئی چیز تباہی سے بچ جاتی تو اس کو تباہ و برباد کرنے کی علیحدہ فکر وسعی کرنی پڑتی چونکہ بجز حسرتِ تعمیر اور کوئی چیز گھر میں نہیں پھر کس طرح اس احسان کا بدلہ کیا جائے۔ ہاں تعمیر کی آرزو برآئے تو عشق کے احسان کا کچھ بدل ہو سکے۔ یعنی تیار شدہ گھر اس کی نذر کر دیا جائے گا کہ پھر برباد کرے۔

۷۔ ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

کھلا = تجربہ سے ثابت ہوا یا معلوم ہوا۔ عرض ہنر = اظہارِ کمال

فرماتے ہیں کہ ہم نے اس سے پہلے جو کچھ لکھا اس میں کمال کے جوہر دکھلائے مگر عوام تو عوام خواص بھی انکو سمجھنے سے قاصر رہے اور بجائے اس کے کہ ہمارے کلام کی قدر کی جاتی اور داد دیجاتی اعتراضات اور سب و شتم کا ایک دروازہ کھل گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اظہارِ کمال میں کوئی فائدہ نہیں اس لئے ہم نے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا اور اب اپنی دل بہلائی کے لئے شعر کہتے ہیں جن میں کوئی صنعتِ شاعرانہ نہیں ہوتی اور نہ دماغ سوزی و جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

غزل نمبر ۳۲

۱۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دل بھر آنا۔ رونے کو جی چاہنا ـــــ فرماتے ہیں کہ ہمارا دل بڑا احساس ہے۔ اینٹ

اور پتھر نہیں جو بے حس ہو۔ جب کوئی ہم کو ستائے تو دل میں درد اٹھنا ضروری ہے۔ درد کا تقاضا رونا۔ ستانا اور رونے سے روکنا دوہرا ظلم ہے۔ ہم اگر ستائے جائیں تو ایک نہیں ہزار بار روئیں گے۔

۲۔ دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں ۔۔۔ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

یعنی دیر و حرم اور در و آستان پر کسی نہ کسی کا قبضہ اور کوئی نہ کوئی رکھوالی کرنے والا ہوتا ہی اگر وہاں سے کوئی ہٹائے تو ایک بات ہے۔ مگر رہ گذر تو کسی کی ملک نہیں وہاں سے اٹھانے کا غیر کو کوئی حق نہیں۔ یہ غیر کی شرارت اور بدنفسی ہے کہ ہم کو رہ گذر سے بھی اٹھانا چاہتا ہی اس شعر میں رہ گذر سے مراد رہ گذرِ یار ہے۔

۳۔ جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز ۔۔۔ آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

جمالِ دل فروز۔ ذاتِ باری تعالیٰ۔ صورتِ مہرِ نیم روز = دوپہر کے سورج کی طرح جس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا مطلب ہے کہ جب ذات باری تعالیٰ کا جمال آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا تو پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

۴۔ دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ ۔۔۔ تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں؟

دشنہ = خنجر۔ جاں ستان = جان لیوا۔ ناوک = تیر۔ بے پناہ = جس سے کوئی نہ بچ سکے۔

غمزہ = آنکھوں یا ابرو سے اشارہ کرنا نیم نگاہی۔ ناز = حرکاتِ معشوقی، غمزہ، عشوہ۔

مطلب ہے کہ معشوق کا ناز و غمزہ جان ستان ہے۔ جو بھی روبرو ہوا گھائل ہو گیا۔ کوئی بچ ہی نہیں سکتا تو پھر معشوق کا عکس رخ بھی گھائل ہوگا۔ اس لئے اس کو بھی سامنے نہ آنا چاہیئے لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ بتلا رہا ہے کہ کسی کے سامنے نہ آنے کی وجہ جان کا اندیشہ نہیں بلکہ عاشق کا رشک ہے۔ رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اور تو اور معشوق کا عکس بھی اس کو دیکھے معشوق کے غمزہ و ناز سے گھائل ہونے کا حق صرف عاشق ہی کو ہے۔

۵۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اسی خیال کو دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے کسی نہ کسی قسم کا غم لگا ہوا ہے۔ حیات اور غم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس لئے مرنے سے پہلے غم سے نجات ممکن نہیں۔

۶۔ حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

فرماتے ہیں کہ معشوق حسین اور اس کا گمان بھی نیک۔ اس کو اس بات پر کامل اعتماد ہے کہ جو بھی اس کو دیکھیگا عاشق و فریفتہ ہو جائیگا۔ اس حسن ظن کی وجہ غیر کی لاج رہ گئی۔ اگر یہ اعتماد اور حسن ظن نہ ہوتا تو پھر غیر کی بھی آزمائش ہوتی۔ وہ تو پھر ابو اہوس امتحان میں کیسے پورا اترتا ذلیل و رسوا ہو جاتا۔

۷۔ واں وہ غرور عز و ناز۔ یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں؟

یعنے معشوق کو اپنے حسن کے باعث عزت و افتخار حاصل ہے۔ اسی عزت و فخر پر وہ مغرور ہے اس کا غرور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم کو اپنی محفل میں بلائے۔ ادھر ہم کو بھی اپنی وضع کا پاس و لحاظ ہے۔ رستہ میں اس سے ملتے شرم آتی ہے۔ غرض عجیب کشمکش ہے۔ ملاقات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۸۔ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت غالبؔ نے رقیب کو دھوکا دیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزبان اپنا

اس مرتبہ رقیب دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ مگر نیت بری ہے۔ رقیب کا منشا یہ ہے کہ معشوق کی خدا ناشناسی اور بے وفائی کا ذکر کر کے ان کی زبان سے بھی کچھ کہلوائے اور ساتھ ہی معشوق کے سامنے چغلی کھائے۔ یہ بھی ٹھہرے استاد۔ فوراً بھانپ گئے۔ گو خود بھی معشوق کو دل میں کافر و بے وفا سمجھتے ہیں مگر ناراض سے ہو کر فرمانے لگے کہ وہ بے دین اور بے وفا ہوا کرے۔ اگر آپ کو اپنا

دین و دل پیارا ہے تو اس کی گلی میں کیوں جاتے ہیں۔

۹۔ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں　　روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

رحلت فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اگر غالب مر گیا تو کیا نقصان ہوا دنیا کے کام حسبِ حال چل رہے ہیں۔ اس کے مرنے سے دنیا کے کام تو رکے نہیں پھر زار زار رونے اور ماتم کرنے کی کیا وجہ ہے؟

غزل نمبر ۴۳

۱۔ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں　　بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ۔ کلی، مراد دہن معشوق۔ پوچھنا۔ سوال کرنا۔ استفسار کرنا

فرماتے ہیں کہ میں بوسہ مانگ رہا ہوں معشوق دور سے بہ اشارۂ دہن پوچھ رہا ہے کہ کیا اس طرح بوسہ دیا جائے۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں پاس آکر سچ مچ بوسہ دیکر مجھے بتلا کہ منہ کا بوسہ اس طرح دیا جاتا ہے ــــ یا ــــ اگر پوچھتا ہوں کے معنی استفسار کرتا ہوں کے لئے جائیں تب یہ مطلب ہوگا کہ میں معشوق سے دریافت کر رہا ہوں کہ بوسہ دینے کا کیا طریقہ ہے اس کے جواب میں معشوقہ بغیر منہ کھولے صرف اشارۂ غنچۂ دہن سے بتا رہا ہے کہ بوسہ یوں دیا جاتا ہے۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ میرے استفسار کا یہ جواب نہیں ہوسکتا بلکہ پاس آکر منہ کا بوسہ دیکر بتائیے کہ اس طرح بوسہ دیا جاتا ہے۔

۲۔ پرسشِ طرزِ دل بری کیجئے کیا کہ بن کہے　　اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

پرسش۔ پوچھنا۔ طرز دل بری۔ دل لینے کا طریقہ۔ ادا۔ بیان

فرماتے ہیں کہ معشوق سے دل چھین لینے کا طریقہ کیا پوچھیں اس لئے کہ اس کی ہر حرکت و ہر اشارہ بیان کر رہا ہے کہ دل یوں لیا جاتا ہے۔

۳۔ رات کے وقت مے پئے، ساتھ رقیب کو لئے　　آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

اس شعر میں صنعتِ لف و نشر مرتب رکھی گئی ہے پہلے مصرعہ میں معشوق کی دو حالتوں کا ذکر ہے

ایک تو رات کے وقت مئے پئے مست آنا۔ دوسرے رقیب کو ساتھ لئے ہوئے آنا۔ مصرعِ ثانی میں پہلی حالت میں آنے کی آرزو کی گئی ہے اور دوسری حالت میں نہ آنے کی دعا کی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معشوق مئے پئے ہوئے رات کے وقت ہمارے پاس آئے۔ لیکن خدا ایسا نہ کرے کہ وہ رقیب کو بھی اپنے ساتھ لائے۔

۴۔ غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

یہ دیکھنا = اس طرح قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا۔ یوں = یہ مجال کہ ہم سے اسطرح استفسار کرتے ہو۔

فرماتے ہیں کہ میں نے معشوق سے از راہ سادگی یہ پوچھا کہ رات رقیب کے ساتھ کیسے گذری میرا یہ پوچھنا ہی تھا کہ وہ شوخ غصہ کی حالت میں سامنے آبیٹھا اور قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس دیکھنے سے اس کا منشا یہ تھا کہ "تمہاری جرأت اتنی بڑھ گئی کہ ہماری نقل و حرکت کی خبر رکھتے ہو اور پھر یوں استفسار بھی کرتے ہو"

۵۔ بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

فرماتے ہیں کہ معشوق کی خاموشی کا مقصد یہی ہے کہ اس کی طرح سب خاموش رہیں۔ پھر معشوق کی بزم میں دم مارنے کی گنجائش کہاں۔

۶۔ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

فرماتے ہیں کہ معشوق کے مذاق و ظرافت میں بھی ظلم ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ رقیب اس قابل نہیں کہ ایسی باوقار بزم میں آکر بیٹھے۔ اس سے بزم خالی ہونی چاہیئے۔ یہ سن کر اس شوخ کو شرارت سوجھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا کہ کیا اس طرح غیر کو اٹھا دیا جائے؟

۷۔ مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

مطلب ہے کہ مجھ کو دوست نے بحالت بیخودی دبے ہوشی دیکھ کر تعجب سے پوچھا کہ ہوش کس طرح اڑ جاتے ہیں۔ میں تو بحالت بے خودی پڑا ہوا تھا معشوق کے استفسار کا جواب کیسے دے سکتا میری اس حالت کو دیکھ ہوا کو رحم آگیا۔ اور چل کر میری طرف سے معشوق کے استفسار کا جواب

ادا کر دیا کہ میں جس طرح اڑ رہی ہوں۔ تمہارے عاشق کے ہوش و حواس بھی اسی طرح اڑ جاتے ہیں۔

۸۔ کب مجھ کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی　　آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

فرماتے ہیں کہ میں معشوق کی گلی میں رہنے کے آداب سے واقف نہیں تھا۔ نقش پا کی حیرت نے مجھے یہ آداب سکھائے کہ خاکسار خاموش، ساکت و حیرت زدہ رہنا چاہیئے۔

۹۔ گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال　　موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

خیال = منشا، ارادہ (موت)۔ شوق = خواہش (موج)۔ زوال = دور ہونا۔ ہاتھ پاؤں مارنا = جان فشانی کرنا، خون جگر کھانا، انتہائی سعی کرنا، جان توڑ کوشش کرنا۔

فرماتے ہیں کہ اگر تیرا منشا یہ ہے کہ محبوب حقیقی سے وصل حاصل ہو اور تمام نفسانی خواہشات اور دنیوی آرزوئیں دور ہو جاویں۔ ہاتھ پاؤں مار اور سخت ریاضت کر۔ اس لئے کہ جب ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بغیر کوشش و محنت میسّر نہیں آسکتی تو پھر یہ دین و دنیا کی سب سے بڑی دولت بغیر ہاتھ پاؤں مارے کیسے نصیب ہو۔ اسی کوشش کی ضرورت کو ایک مثال سے یوں واضح فرماتے ہیں کہ موج دریا میں واصل ہونے کے لئے دیکھو کیسی کوشش کرتی ہے صدہا طوفانوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہزاروں چٹانوں سے سر ٹکراتی ہے جب کہیں جاکر خود کو فنا کرتی اور بحر میں واصل ہو جاتی ہے۔ بس یہی حال سالک کا ہونا چاہیئے۔ انسان کی سب سے بڑی خواہش اپنے وجود کی بقا ہے اس شوق کو زائل کرتے ہوئے اپنے کو مٹانا آسان کام نہیں۔

۱۰۔ جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ریختہ = اردو شاعری۔ گفتۂ غالب = کلام غالب

ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ شعراء اردو میں شعر کہنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود حضرت غالب بھی ابتداء میں اسی خیال کے حامی تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مطلب یہ ہے کہ اب بھی اگر ایسے حضرات موجود ہیں جو اردو کو ذلیل اور فارسی سے کمتر سمجھتے ہیں ان کو ایک بار غالب کا اردو کلام سنا دو تو یہ غلط فہمی نہیں رہے گی۔

ردیف (واؤ)

غزل نمبر (۱)

اے اسدؔ ہو دل اگر افسردہ ہو گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

چشم تنگ ۔ حاسد کی آنکھ ۔ شعراء حاسد کی آنکھ کو تنگ باندھا کرتے ہیں ۔ کثرت نظارہ ۔ مشاہدات اور تجربہ کی زیادتی ۔ وا ہونا ۔ کھلنا ۔ یہاں مراد حاسد کی تنگ آنکھ کو کشادہ ہونا یعنی حسد کا باقی نہ رہنا۔

جناب حالی نے یادگار غالب میں اس شعر کی شرح اس طرح فرمائی ہے:۔

"یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے ۔ بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔ فی الواقعی جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا ۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد و رشک کیا جائے بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس سے لئے انصاف اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے ان کی ریس و پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے ۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے ۔ اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے" اس پر ہم اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ:۔

ممکن ہے کثرت نظارہ کی وجہ بلندی و پستی کی صدہا مثالیں اس کے مشاہدہ میں آئیں اور نظر میں اتنی وسعت پیدا ہو کہ وہ منشائے قدرت کو سمجھنے لگے اور اپنی حالت پر قانع ہو جائے ۔ قناعت دافع حرص و حسد ہے مانع سعی و تدبیر نہیں۔

۲۔ بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی — بھروں اک گوشۂ دامن۔ گر آبِ ہفت دریا ہو

ذوق: لذت، مزہ۔ معاصی: جمع معصیت بمعنی گناہ۔ ہفت دریا: ہفت دریائے معاصی۔ گناہ کو تردامنی بھی کہتے ہیں۔ ذوقِ معاصی اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ معاصی کا ارتکاب ہو۔

فرماتے ہیں کہ دل میں حسرتِ معاصی اس قدر زیادہ ہے کہ ہفت دریائے معاصی سے بھی کامل تردامنی نہیں ہوتی صرف دامن کا ایک گوشہ تر ہوگا لیکن اس قدر معاصی کے ارتکاب پر قدرت نہیں۔ بہت تھوڑے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ لذت بھی تھوڑی حاصل ہوتی ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ گناہوں کے صدہا دریا میری تردامنی کی وجہ خشک ہوجاتے تاکہ حسرتِ دل کی موافق مجھے مزہ اور حظ حاصل ہوتا۔

۳۔ اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجائے — کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

سرو قد: معشوق۔ کفِ ہر خاکِ گلشن: گلستان کی ہر مشتِ خاک یا وہ مٹی جس پر معشوق کے کفِ پا کے نشان پڑے ہوں۔ شکلِ قمری: مثلِ قمری۔ نالہ فرسا ہو: نالہ کرنے لگے۔ قمری ملی خاک رنگ۔ مقدار ایک مشتِ خاک ہے اور شعرا اس کو سرو کی عاشق باندھتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اگر معشوق سہی قامت سیر کناں باغ میں آجائے تو گلشن میں جہاں جہاں اس کا قدم پڑے نقشِ قدم کی مٹی قمری کی طرح نالہ کرنے لگ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اور تو اور مٹی بھی اسکی محبت کا دم بھرنے لگے۔

غزل نمبر ۲

۱۔ کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں — بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

کنشت: بت خانہ، مندر۔ اہلِ کنشت: بتکدے کے رہنے والے۔

یعنی اگر میں بت خانہ چھوڑ کر کعبہ میں جا رہا ہوں تو بے وفائی کا الزام مت دو اور یہ نہ سمجھو کہ میں نے اہلِ بت خانہ کی محبت اور حقِ دوستی بھلا دیا ہے۔ اس لئے کہ کعبہ ضرورتاً اور مجبوراً گیا ہوں۔ میرا دل تو بت اور بت خانہ میں اٹکا ہوا ہے۔

حضرت مومن نے ایک شعر کعبہ و بت خانہ سے متعلق فرمایا ہے۔ اگر دونوں شعر ساتھ ساتھ رکھدئے جائیں تو طعن اور طعن کا جواب لطف سے خالی نہیں فرماتے ہیں۔

اللہ رے گمری بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کیساتھ

۲۔ طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

طاعت : بندگی، عبادت۔ انگبین : شہد۔ لاگ۔ محبت، خواہش۔

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت اسی کا نام ہے جو محض اس کی محبت، اور اس کے فرامین کی بجاآوری کے لئے کی جائے۔ جہاں کوئی غرض شامل ہو گئی وہ عبادت، عبادت نہ رہی اس لئے اس غرض اور لالچ کو جلا دینا ہی مناسب ہے تاکہ عبادت خالص ہو جائے۔ پس جو لوگ بہشت کے تعیشات یعنی شراب، شہد حور وغیرہ کی غرض سے عبادت کرتے ہیں ان کو چاہیئے کہ ایسی بہشت کو دوزخ میں ڈالدیں تاکہ عبادت خالصاً للہ ہو جائے۔

۳۔ ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

سرنوشت : قسمت کا لکھا۔ رہ و رسم ثواب : نیک کام نیکی کا راستہ۔ منحرف ہونا : برگشتہ ہونا، منہ موڑنا

فرماتے ہیں کہ میں نیک کاموں سے جو منہ موڑتا ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے۔ کاتب تقدیر نے جس قلم سے میرے مقدر تحریر فرمائے اس کو ٹیڑھا قط لگا تھا۔ اس لئے میں بھی ٹیڑھا راستہ چل رہا ہوں۔ قلم سے برو کا قلم مراد ہے۔

۴۔ غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لہنا : فائدہ، تمتع۔ ملخ : ٹڈی

فرماتے ہیں کہ میری قسمت میں اپنی سعی و محنت سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ محنت کر کے کشت کرتا ہوں تو حاصل کشت ہاتھ نہیں آتا۔ یا تو کھیت کو ٹڈیاں کھا جاتی ہیں یا اگر ٹڈیوں سے بچ گیا اور کاٹ کر خرمن لگایا تو برق خرمن کو جلا دیتی ہے۔

غزل نمبر ۳

۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　　　کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ = آزاد ۔ شعر صاف ہے۔ فرماتے ہیں ہم کو اس بات پر اصرار نہیں کہ آپ ہم سے محبت ہی کریں۔ اگر محبت نہیں کرنا چاہتے عداوت ہی سہی۔ کسی نہ کسی طرح تعلق قائم رکھیے "ہمارے ساتھ" پر اگر زور دیکر پڑھا جائے تو یہ مطلب ہوگا۔ خواہ محبت ہو خواہ عداوت صرف ہمارے لئے مختص ہو۔ کسی اور کے ساتھ نہ ہو۔

۲۔ چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا　　　　ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

اختلاط = میل ملاپ، پیار + نقش محبت = نقش حب، معشوق کو قابو میں لانے کا تعویذ۔ رنگ۔ مشغلہ، شغل، حالت۔

فرماتے ہیں کہ ضعف کے باعث میل ملاپ، پیار و اخلاص یعنی عشق بازی کا مشغلہ جاتا رہا اب تو یہ حال ہے کہ محبت کا تعویذ بھی سینہ پر بار ہونے لگا ہے۔ یا یہ کہ اب تعویذ کی ضرورت نہیں اور غیر ضروری چیز بار خاطر ہوتی ہے۔

۳۔ ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　　　ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یعنی رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ رقیب کا نام معشوق کی زبان سے نکلے خواہ وہ برائی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　　　یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں کہ جب ہر درد کی دوا دنیا میں موجود ہے تو پھر درد عشق کی دوا بھی ہونی چاہیے کیوں نہ ہو؟ استفہام انکاری ہے جس کا مطلب ہے کہ دنیا میں ہر مرض کی دوا ہے مگر صرف غم عشق کی دوا نہیں ہے۔

۵۔ ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ　　　　اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

قاعدہ ہے کہ مفلس و محتاج کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ ہر مشکل کو وہ اپنی ہی سعی سے حل کر لیتا ہے اور ہر معاملہ میں اپنی آپ مدد کرتا ہے اس لئے وہ غیر کا احسان مند اور کسی سے

شرمندہ نہیں ہوتا۔ احسان ہے تو اس کا اپنا ہے اور احسان کی خجالت ہے تو بھی اپنی ہی ذات سے مطلب صرف اس قدر ہے کہ بیکس کا کوئی دوست نہیں کہ جس کا احسان اٹھایا جائے

۶۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں اگر ہمارے پاس لوگ نہ آئیں تو کیا مضائقہ ہماری تنہائی بجائے خود ایک انجمن ہے۔ اس لئے کہ تنہائی میں خیالات کا کافی سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ یہی صحبت اور تفریح ہمارے لئے کافی ہے۔ اس لئے ہم خلوت کو بھی انجمن سمجھتے ہیں۔

۷۔ ہنگامۂ زبونئ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ = افراط + زبونئ ہمت = پست ہمتی + انفعال = شرمندگی، خجالت + عبرت۔ دنیا کے واقعات سے عبرت حاصل کرنی، طبیعت کا غفلت سے آگاہی کی طرف رجوع کرنا۔

اس شعر کے ذریعہ سلوک کی سب سے بڑی شرط یعنی دنیا سے بے تعلقی کی تعلیم دیجا رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ پست ہمتی کی افراط خجالت وندامت کا موجب ہوتی ہے۔ پست ہمتی کیا چیز ہے۔ یہی کہ دنیا اور اہل دنیا سے تمتع حاصل کرنی جبتک انسان دنیا کے کاروبار میں منہمک رہے کسی نہ کسی شکل میں وہ اوروں کی مدد کا محتاج ہے۔ یہی زبونئ ہمت ہے۔ اسلئے دنیا سے تعلقات قایم رکھکر انفعال سے بچنے کی سعی لاحاصل ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ دنیا کو ہیچ پوچ سمجھکر اس سے اس درجہ بے تعلق ہو جائیں کہ کسی چیز کی خبر اور آگاہی نہ رہے جب اس حدتک کنارہ کشی اختیار کرے تو پھر عبرت اور حصولِ عبرت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا

۸۔ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

یہ شعر بھی تصوف وسلوک کے رنگ کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا سے آزادی یا ترک دنیا اس کا نام نہیں کہ لوگوں سے وحشت و بیزاری اور بیگانگی کا اظہار کیا جائے۔ یہ تو بد خلقی ہے۔ بداخلاقی جب عوام کیلئے جایز نہیں تو سالک کیلئے کیسے جایز ہو سکتی ہے پھر اس سے عجب وخود نمائی جیسی بری صفات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے سالک کو چاہیئے

کہ اپنے وجود سے وحشت کرے اور اپنے کو ہیچ سمجھے یعنی اپنی خودی کو مٹانے میں لگا ہے۔

۹۔ مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

یعنی جملہ انسانوں کی خواہش، طلب اور حوصلہ یکساں نہیں ہوتا جس چیز کے ملنے سے ایک آدمی بے حد خوش ہو جاتا ہے دوسرا اسی چیز کے ملنے سے بے حد غمگین ہوتا ہے۔ ایک معمولی آدمی کو تھوڑی سی دولت اور ادنیٰ سا اقتدار خوش کر سکتا ہے۔ مگر کسی معزول شدہ بادشاہ کیلئے سوائے بادشاہت بڑی سے بڑی دولت اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ موجب آزار ہوگا۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ بغیر معرفت الٰہی یا قرب حق جو عمر گزر رہی ہے اس کا غم نہیں مٹ سکتا۔ عبادت سے زیادہ سے زیادہ جنت ملیگی جو مطلوب نہیں اور جو چیز طلب و حوصلہ سے کم ہو وہ غم دور نہیں کر سکتی۔ ہم تو معزول شدہ شاہی پر بحال ہونا چاہتے ہیں۔

۱۰۔ اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مطلب ہے کہ ہم ایسے وفادار ہیں کہ وہ فتنہ خو (معشوق) ہمارے سر پر کیسی ہی قیامت توڑے اور کیسے ہی مظالم ڈھائے اس کا در چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ فتنہ خو، قیامت، اٹھنا لفظی رعایات حسنِ شعر میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ قیامت ہونے پر نہ اٹھنا لطف سے خالی نہیں

غزل نمبر ۴

۱۔ قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو — میرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

شیون = نالہ، آہ و زاری۔ نوا سنج = نغمہ سنج۔

فرماتے ہیں کہ اگر میرے رفقائے رنگین بیان میرے کلام کو ناپسند کرتے ہیں کوئی شکایت کا مقام نہیں۔ البتہ مجھکو برا سمجھنے اور مجھ سے بیزاری کی کوئی وجہ نہیں۔ میں خود گرفتار بلا ہوں لیکن دوسروں کی شاعری پر رشک و حسد نہیں کرتا پھر مجھ سے رقابت عبث ہے۔

غالباً اس شعر میں ان ہمعصروں کی طرف اشارہ ہے جو مرزا صاحب کے کلام کو نام رکھتے تھے۔ اور ان پر رشک و حسد کیا کرتے تھے۔

۲۔ نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے ۔ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

ہمدمی، دوستی، رفاقت + فرماتے ہیں اگر رقیب کی معشوق تک رسائی اور اس سے ہمدمی ممکن نہیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ہم کو اس بات کا خوف کب ہے۔ جو رنج ہم کو ہے وہ اس بات کا ہے کہ رقیب کے دل میں ہمارے دوست کی آرزو کیوں ہے۔ خدا نے اس کو یہ آرزو نہ دی ہوتی تو اچھا ہوتا

۳۔ نہ نکلا آنکھ سے تیرے اک آنسو اس جراحت پر ۔ کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

مژگانِ سوزن، سوئی کا ناکا + سینے میں، ذو معنین ہے۔ ایک تو سینہ کے اندر دوسرے سیتے وقت مطلب ہے کہ معشوق ایسا سنگدل ہے کہ میرے دل وجگر کے گہرے زخموں کو دیکھکر ذرا بھی متاثر نہیں ہوا حالانکہ بے جان سوئی بھی ان زخموں کو دیکھکر خون کے آنسو بہا رہی ہے یعنی زخم سیتے وقت رشتہ خون آلود ہو کر خون کے قطرے ٹپکا رہا ہے۔

۴۔ خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۔ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

کشاکش، کھینچا تانی + یعنی بحالتِ تنہائی جب وحشت میں زیادتی ہو جاتی ہے تو گریبان کو کھینچ کھینچ کر چاک کرتے ہیں۔ اور اگر معشوق پاس ہو تو اس کے دامن کو کھینچتے ہیں ایسے گستاخ ہاتھوں کو خدا شرمائے۔

۵۔ ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ۔ نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

شناور، تیرنے والا + جوئے خوں + خون کی ندی + توسن، گھوڑا۔

یعنی چونکہ ہم نے خون کی ندی کو بہتے ہوئے اور اس میں معشوق کے گھوڑے کو تیرتے نہیں دیکھا ہے اس لئے قتل گاہ کا دیکھنا آسان سمجھ رہے ہیں۔ جب قتل گاہ کا منظر دیکھ لینگے پتا پانی ہو جائیگا۔ قتل گاہ، جوئے خون، توسن کی شناوری یہ سب استعارات ہیں مطلب ہے ابھی ہم کو عشق کی سختیوں اور معشوق کی بے اعتنائیوں کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ جب تجربہ ہوگا تو محسوس کریں گے کہ عشق و محبت آسان کام نہیں ہے۔

۶۔ ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا ۔ کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

فرماتے ہیں کہ مجھ دیوانہ کے پاؤں کی زنجیر بننے کی شہرت معدنِ آہن تک پہنچی تو جوہر آہن متحرک ہو کر تڑپنے لگے۔ اسی شوق نے آہن کو کان سے نکال کر میرے قدموں تک پہنچا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ میری بے تابی اور تڑپ کی تاثیر نے کان میں لوہے کو بھی تڑپا دیا۔

۷۔ خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

فرماتے ہیں کہ میں بڑا بد قسمت آدمی ہوں میرے کھیت پر ابر فائدہ پہنچانے کیلئے نہیں آتا بلکہ اس کا بار بار آنا بتلا رہا ہے کہ ابھی سے برق خرمن کی تلاش میں ہے کہ جوں ہی فصل تیار ہو کر ڈھیر لگے اس کو جلا دے۔ شعر میں "میرے" کا لفظ یہ تخصیص پیدا کر رہا ہے کہ صرف میرے کھیت کے ساتھ یہ معاملہ ہے دوسرے تو ابر سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔

۸۔ وفاداری بشرط استواری عینِ ایماں ہے مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

"یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے" (از یادگار غالب)

۹۔ شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

خو ۔ عادت، فطرت ۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مری سرشت میں یہ بات ودیعت فرما دی تھی کہ تلوار کو دیکھتے ہی گردن جھکا دوں اس لئے کہ شہادت میرے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

۱۰۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

شعر صاف ہے۔ آرام سے بے خبر سونے کی شاعرانہ وجہ لٹنے کو قرار دی ہے جو بجائے خود ایک پر لطف خیال ہے۔ اس عام خیال سے ہٹ کر اگر اس شعر کو شاعر کی اپنی واردات فرض کر لیں تو مطلب حسب ذیل ہوگا۔

دن ۔ مراد زندگی کا روشن دور، خوشحالی۔

رات ۔ زندگی کا تاریک دور، بدبختی۔

یعنی جو زمانہ ہماری خوشحالی کا تھا اسی زمانہ میں بے سروسامان ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بدبختی کا تاریک دور جب شروع ہوا تو اس سے ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ اس سے پہلے ہی سے ہم اس کے عادی ہو چکے تھے۔ لہذا ہمارا لٹنا اور بے سروسامان ہونا ہمارے لئے موجب رحمت ہوا۔ اس لئے لوٹنے والے کیلئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

۱۱۔ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے ۔۔۔ جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

فرماتے ہیں کہ ہمارا کلام جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے۔ جب ہم جگر کاوی کے ساتھ بہتر سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں تو جواہرات کی تلاش میں معدن کو کھودنے کی کیا ضرورت ہے۔

۱۲۔ مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ ۔۔۔ فریدون و جم و کیخسرو و دارا و بہمن کو

سلیمان جاہ = سلیمان کے مرتبہ والا + یعنی ممدوح سلیمان مرتبت ہے۔ دوسرے بادشاہ جن کا ذکر مصرعۂ ثانی میں کیا گیا ہے وہ سلیمان منزلت نہیں تھے اس لئے ہمارے بادشاہ اور ایران کے ان شاہوں میں کوئی نسبت نہیں بادشاہ کو سلیمان مرتبت کہنے سے شاعر کا منشا یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو جاہ و حشم کی فراوانی کے علاوہ قربت حق اور جن و پری وغیرہ پر بھی اقتدار حاصل تھا یہ قدرت کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں تھی۔

غزل نمبر (۵)

۱۔ دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو ۔۔۔ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

سیمتن = حسین + پاؤں دھو دھو کر پینا = خوشامد کرنا، عزیز رکھنا + یعنی میں معشوق کے پاؤں دھو کر پینا چاہتا ہوں اور وہ شوخی و شرارت سے پاؤں دھونے نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم تو اس کو عزیز رکھتے اور اس کی خوشامد کرتے ہیں اور وہ ہم سے بیزاری و اظہار نفرت کرتا ہے۔

۲۔ دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ۔۔۔ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

سادگی = سادہ لوحی، بیوقوفی + پانو پڑنا = دکن میں اب بھی کسی کی بیوقوفی پر اظہار ترحم و افسوس

کیلئے یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بے تکلف دوست نادانی سے کسی معاملہ میں نقصان اٹھائے تو کہتے ہیں "تمہارے پاؤں پڑوں تم نے یہ کیا کیا" ؟ ہیہات ۔ افسوس + پیرزن ۔ وہ مکارہ جس نے فرہاد کو شیریں کی موت کی جھوٹی خبر سنائی جسکی وجہ فرہاد سر پر تیشہ مار کر ہلاک ہوگیا۔

فرماتے ہیں کہ افسوس ہے کوہکن نے ایک جھوٹی خبر پر اپنی جان دیدی۔ پیرزن کے مکروفریب کو نہ سمجھ سکا۔ اس بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے جس نے آکر کوہکن کو یہ خبر سنائی۔ فرہاد کی سادگی کا ذکر کرنے سے شاعر کا مقصد اپنی دانائی کا اظہار ہے۔

۳۔ بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

یعنی رہزن ہمارے تعاقب میں تھا اور ہم اس سے بچنے کے لئے بھاگتے تھے۔ آخر کار دوڑتے دوڑتے بے دم ہو کر ہم اسیر ہوگئے اور ادھر راہزن بھی تھک گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسیری تو مقدر ہو چکی تھی گرفتار ہوگئے اور جو بچنے کی سعی لاحاصل کی اس کی سزا میں راہزن کے پاؤں داب رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بھی آفات ہوں ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کریں ڈر کر نہ بھاگیں اس لئے کہ جو شدنی ہے وہ تو ٹلتی نہیں پھر اس کا خوف و ہراس اور اس سے بچنے کی بے فائدہ کوشش ایک علحدہ عذاب ہے۔

۴۔ مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

سوا۔ زیادہ ۔ فگار ۔ زخمی ۔ خستہ تن ۔ بیمار، نحیف

یعنی جسم کے زخموں کے علاج کی سعی کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ جسم کے زخم تو جوں کے توں رہے پاؤں جو اچھے تھے وہ جسم سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ مطلب بالکل وہی ہے جو اس سے پہلے شعر میں مذکور ہوا ہے۔

۵۔ اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ذوقِ دشت نوردی ۔ صحرا گردی کا شوق۔

فرماتے ہیں کہ جب تک زندہ رہے بحالت جنون صحرا میں گھومنے کا شوق تھا۔ خوب

گھومتے رہے۔ اب مر گئے تب بھی دشت نوردی کا شوق نہیں گیا اب بھی سرگرم سفر ہیں اسلئے کفن کے اندر پاؤں ہل رہے ہیں۔ جنازہ لے جاتے وقت کاندھے بدلنے اور زمین کے نشیب و فراز سے مردے کے پاؤں خود بخود ہلا کرتے ہیں اس کی توجیہہ آپ یوں فرماتے ہیں۔

۶۔ ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

جوشِ گل: کثرتِ گل ــــ فرماتے ہیں کہ موسم بہار میں پھولوں کی اس درجہ فراوانی ہے کہ مرغ چمن آسانی سے اڑ نہیں سکتا جگہ جگہ پھولوں میں پاؤں الجھ جاتے ہیں یعنی پھول کو دیکھکر بلبل اڑنا بھول جاتی ہے اور پھولوں میں محو ہو جاتی ہے۔

۷۔ شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

نازک بدن کا کیسا اچھا ثبوت فراہم کیا ہے کہ کسی کے خواب میں بھی جائیں تو پاؤں دُکھنے لگتے ہیں۔

۸۔ غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزہ نہو — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

خسروِ شیریں سخن: آخری شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفرؔ جو نہایت خوشگو شاعر اور استاد ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ذوقؔ کے بعد حضرت غالبؔ سے بھی اصلاح لیتے تھے۔

پاؤں دھو کر پینا: انتہائی عزت و احترام کرنا، بہت ہی عزیز رکھنا۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ مجھ کو بادشاہ سے بے حد عقیدت و محبت ہے جو خود ایک شیریں کلام شاعر ہے اس کے حضور میں پیش کرنے کے لئے نہایت جگر کاوی سے گرم و بامزہ شعر کہتا ہوں۔ گویا میرے کلام کی خوبی و شیرینی بادشاہ سے عقیدت و محبت کا نتیجہ ہے۔

غزل نمبر ۶

۱۔ واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

ہولِ دل: اختلاجِ قلب ــــ فرماتے ہیں کہ معشوق کو ہولِ دل کا عارضہ ہو تو مجھے ندامت و خجالت ہوتی ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ ہولِ دل میری آہوں کا نتیجہ ہے۔

میری محبت یہ کیسے گوارا کرے گی کہ میری وجہ معشوق کو تکلیف پہنچے۔

۲۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو تو دیکھ ‏ ‏ آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

ذوقِ ستم، ظلم کا شوق۔ نخچیر، جنگلی جانور جیسے ہرن وغیرہ، شکار کیا ہوا جانور یہاں مراد اس سے عشاق جو معشوق کی تیر نظر کا شکار ہوتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کی سنگدلی اور ستم گری کا شوق بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دیدۂ نخچیر سے آئینہ کا کام لیتا ہے۔ بجز دیدۂ نخچیر اپنی صورت کسی اور آئینہ میں نہیں دیکھتا۔ اس سے زیادہ سنگ دلی اور ذوقِ ستم ممکن نہیں۔

غزل نمبر ۷

۱۔ واں پہنچکر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو ‏ ‏ صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہمکو

صدرہ، سو سو طریقوں سے۔ آہنگ، ارادہ، آرزو۔ زمیں بوس ہونا، زمین چومنا، آستانہ بوسی کرنا۔ قدم، نقشِ پا۔

فرماتے ہیں کہ کوئے یار میں پہنچ کر مجھ کو بار بار غش آجاتا ہے اور قدم قدم پر میں بیٹھ جاتا ہوں اس کا منشا یہ ہے کہ میں معشوق کے نقشِ پا کی زمین کو بار بار چوموں۔ اگر غش نہ آتا تو زمین بوسی کی یہ آرزو نہ پوری ہوتی۔

۲۔ دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے ‏ ‏ کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

گرفتاریٔ ہم، ہم گرفتاری، دونوں کا مل کر گرفتار ہونا جیسے ہم نفسی، ہمدردی وغیرہ۔

فرماتے ہیں کہ میں دل کو گرفتار محبت رکھنا چاہتا ہوں اور دل مجھ کو پابند وفا کرنا چاہتا ہے۔ گویا دونوں کو اس بات کا شوق ہے کہ ایک دوسرے کو گرفتار رکھا دیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دامِ الفت میں دل و جسم دونوں گرفتار ہیں۔

۳۔ ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن ‏ ‏ تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہمکو

نقشِ پے مور، چیونٹیوں کی آمد و رفت سے جو ہلکی سی لیک زمین پر پڑتی ہے۔

طوق ۔ گلوبند، وہ بھاری حلقہ جو قیدیوں کے گلے میں ڈالا جاتا ہے، گنڈہ، تعویذ۔

طاقتِ رم ۔ فرار ہونے کی طاقت، بھاگنے کی قوت۔

فرماتے ہیں کہ ضعف کا یہ عالم ہے کہ اگر چیونٹی بھی گردن کے اطراف رینگے تو اس کا نقشِ پا گردن کا طوق بن جاتا ہے۔ اور ہلنے نہیں دیتا۔ اس ناتوانی کی حالت میں معشوق کا طوقِ غلامی یا طوقِ الفت اسکی گلی سے بھاگنے کی اجازت کیسے دیگا؟

۴۔ جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو　　یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہمکو

تغافل ۔ بے التفاتی، لاپرواہی۔ کچھ امید بھی ہو۔ یعنے مہربانی کی کچھ توقع ہو تاکہ ہم زندہ رہ سکیں۔

نگاہِ غلط انداز ۔ ایسی نظرِ بے التفاتی جس میں مہر و مروت کا نشان نہ ہو۔ سم ۔ زہر۔

یعنے معشوق کم سن ناتجربہ کار ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے تغافل کا عاشق پر کیا اثر ہوتا ہے اس لئے اس کو آگاہ کیا جارہا ہے فرماتے ہیں کہ سوچ سمجھ کر تغافل کیجئے۔ اگر آپ بلا سوچے سمجھے اس طرح بے التفاتی فرمادیں کہ ہم مایوس ہوجائیں تو اس کا نتیجہ ہماری موت ہے اس کے بعد آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ اس لئے لاپرواہی اور کم توجہی اس انداز سے ہو کہ آپ کی مہربانی و الطاف سے ہم بالکلیہ مایوس نہ ہوجائیں۔

۵۔ رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں　　نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

طرح ۔ یہ لفظ کثیر المعانی ہے۔ یہاں اس کے معنی انداز، طور، طریق کے ہیں۔ ہم طرحی ۔ ایک ہی انداز کا ہونا۔ بانگِ حزیں، غمگین آواز۔ تیغِ دو دم ۔ دو دھاری تلوار۔

فرماتے ہیں کہ مرغِ سحر کا نالہ میرے لئے دو گونہ عذاب ہے۔ ایک تو رشک کی تکلیف یعنی اس کے نالے میں وہی حزن و ملال اور وہی دل سوزی کا انداز ہے جو میرے نالوں میں ہے گویا میری طرح وہ بھی میرے معشوق پر عاشق ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے نالوں کی غمگینی کا اثر میرے دل میں درد پیدا کردیتا ہے۔

۶۔ سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا　　ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

مطلب یہ ہے کہ معشوق سے ہم نے اپنا سر اڑانے کی درخواست کی معشوق نے سر کاٹنے کا وعدہ کر لیا مگر اس انداز سے کہ ہم کو اس کے وعدہ کی سچائی پر شبہ ہوا۔ اس لئے ہم نے اپنا شک رفع اور وعدہ کو استوار کرنے کے لئے مکرر وعدہ لینا چاہا مگر اس مرتبہ بھی ظالم نے وہی شوخی اور شرارت برتی پھر وہی مشکوک و مشتبہ جواب "تیرے سر کی قسم ہے ہم کو" یعنے ہم نے جو وعدہ کیا ہے ضرور پورا کریں گے۔ یا ہم ہرگز سر نہیں اڑائیں گے۔ باندازِ تمسخر ہنستے ہوئے یہ جواب دیا جا رہا ہے۔ جس سے بآسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ظالم کی نیت وعدہ پورا کرنے کی نہیں ہے۔

"اس شعر میں تیرے سر کی قسم ہے ہم کو اس جملے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے" (یادگارِ غالب)

۷۔ دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں کہ دل کا خون ہم بلا وجہ نہیں کر رہے ہیں۔ خالی آنسو بہانے سے آنکھوں میں تری تو آ جاتی ہے۔ مگر رونق نہیں آتی۔ اس لئے آنکھوں کی بے رونقی دور کرنے خون کے آنسو بہانا ضروری ہے ناچار دل کا خون کر رہے ہیں۔

۸۔ تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

یعنی معشوق کی بدمزاجی کی بھی کوئی حد نہیں اور ہماری عاجزی اور ناتوانی کی بھی کوئی حد نہیں۔ ہماری خاموشی بھی ان کے لئے قابلِ برداشت نہیں اور ان کی معمولی سی بے توجہی و لاپروائی بھی ہمارے لئے جان ستان ہے۔

۹۔ لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

یعنی لکھنؤ آنے کی کوئی ظاہر وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ عموماً لوگ سیر و تفریح کے لئے سفر کرتے ہیں مگر ہم کو سیر و تماشے کا بھی شوق نہیں۔ پھر یہاں آنے کی اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ضرور ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی محبت کی کشش اور ان کی قدر شناسی

یہاں کھینچ لائی ہے۔ شعر میں اظہار تعجب سے شاعر کا منشاء اہل لکھنؤ کی محبت کی شدت بتانا ہے۔ یادگار غالب میں لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی کلکتہ کے سفر آمد و رفت میں چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھیرے تھے۔ اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۔ مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہمکو

مقطع: مقام اتمام و انتہا ـــــ فرماتے ہیں کہ شہر لکھنؤ ہمارے شوق سفر کا آخری مقام نہیں ہے۔ اب یہاں سے نجف اشرف کی زیارت اور طواف کعبۃ اللہ کا ارادہ ہے۔

۱۱۔ لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہمکو

کشش: کشیدن مصدر کا حاصل مصدر۔ اس لفظ کے مختلف معانی ہیں۔ قلم کی روانی سے حرفوں کی کشش جیسے بے تے ثے کی کشش۔ جذب و دل ربائی۔

فرماتے ہیں کہ کرم کی توقع ہم کو کہیں لئے جاتی ہے۔ راستہ کی لیک کرم کے کاف کی کشش معلوم ہوتی ہے۔ یعنے کرم کا جذب و دل ربائی ہم کو کلکتہ لئے جا رہی ہے کہ پوری پنشن پھر جاری ہو جائے۔ "مرزا صاحب کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لئے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی .... ان کو اس کے سوا کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچکر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابتہ استغاثہ پیش کریں (از یادگار غالب)

غزل نمبر ۸

۱۔ تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

فرماتے ہیں کہ اگر تم کو غیر سے ملاقات اور دوستی ہے تو یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے اس سے ہم کو سروکار نہیں البتہ ہم اپنے لئے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو بھی کبھی کبھار پوچھ لیا کیجئے اس میں کوئی ہرج تو نہیں۔

۲۔ بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

فرماتے ہیں کہ اے دوست تم کسی صورت سے قیامت کی بازپرس سے بچ نہیں سکتے۔ ہمارے

قتل کی ذمہ داری اگر آپ پر نہ بھی آئے۔ یہ مان لیں کہ صرف رقیب ہی ہمارے قتل کا ذمہ دار ہے تب بھی یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہوا ہے۔ مجرم کی حیثیت سے نہ سہی گواہ کی حیثیت سے تو روز حشر جواب دینا پڑے گا۔

۳۔ کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں　　مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

غالباً معشوق نے اثنائے گفتگو میں اپنے حسن و جمال پر فخر کیا ہو کہ خورشید و ماہ ہیں اس کا جواب طنز کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ مان لیا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہیں تو کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بے گناہوں کو قتل کرتے ہیں اور حق وفا ادا نہیں کرتے؟

۴۔ ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار　　مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

فرماتے ہیں کہ معشوق کے نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے میں اس رشک و حسد سے مر رہا ہوں کہ یہ ابھرا ہوا تار کسی محو جمال کا تار نگاہ تو نہیں ہے؟

۵۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

"اس شعر میں از راہ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا۔ اب مسجد میں ملجائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہ شوخی کے کی گئی ہے۔ یعنے یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے" (از یادگار غالب)

۶۔ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

یعنی ہم بہشت کی یہ تعریف سنتے ہیں کہ وہ ایک نہایت پر فضا باغ ہے۔ جس میں عمدہ سے عمدہ میوہ جات ہیں دودھ و شہد کی اس درجہ فراوانی ہے کہ ان کی نہریں بہتی ہیں، حوریں، قصور ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب بجا اور درست ہے۔ مگر ان میں سے کوئی نعمت ہمارے لائق

نہیں اور نہ ان میں سے کسی کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہماری صرف ایک ہی آرزو ہے اور وہ آپ کا دیدار ہے۔ اگر جنت میں دیدار میسر آسکتا ہے تو وہ جنت ہے ورنہ ہیچ ہے۔

۷۔ غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں   دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

فرماتے ہیں کہ اگر غالبؔ جیسا سخنور مر بھی جائے تو کوئی نقصان اور رنج کی بات نہیں البتہ اے پروردگار اس دنیا کو اور میرے بادشاہ کو قایم رکھیو۔ دنیا کے قیام کی دعا اس لئے کی جارہی ہے کہ اسی کے ساتھ تو بادشاہ کا وجود ہے۔ لیکن مقصود صرف بادشاہ کی سلامتی ہے۔

غزل نمبر ۹

۱۔ گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو   کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں کہ وہ دن گذر گئے جب ہم اس فکر و پریشانی میں رہتے تھے کہ معشوق سے تنہائی میں ملاقات اور گفتگو کا کیسے موقع ملے تاکہ ہم اپنا حال دل اور اپنی سرگزشت ان کو سنا سکیں اور سن کر وہ ہم پر مہربان ہو جائیں۔ اسی امید پر ہم زندہ بھی تھے۔ خدا خدا کرکے ایسا موقع ہاتھ آگیا اور ہم نے اپنا قصۂ غم ان کے گوش گذار کیا لیکن اس سنگدل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا جس توقع پر ہم زندہ تھے وہ بھی جاتی رہی پھر کہئے کہ اب ہمارا حشر کیا ہوگا کس طرح زندہ رہیں پہلی فکر جاتی رہی اب یہ دوسری اس سے بھی سخت پریشانی لاحق ہے۔

۲۔ ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال   کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

استاد نے اس شعر کے ذریعہ وصال کی دو قسمیں فرمائی ہیں۔ ایک ذہنی دوسرے جسمانی۔ ذہنی وصال تو یہی ہے کہ ہر وقت تصور محبوب ذہن میں ہو۔ چنانچہ پہروں وصال کی تدبیریں سوچنے میں یہ تصور قائم رہتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ "ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال" دوسرے مصرعہ میں سوچ و فکر کی صراحت ہے۔ یعنے وصال نہ ہو تو کیا کریں اور وصال ہو تو کیونکر ہو۔ بس یہی تصور وصال ہے۔ حقیقی وصال تو نصیب نہیں ہوتا۔

۳۔ ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے   حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

کشمکش، کشیدگی، کھنچاؤ، گومگو، شش و پنج، تذبذب۔

فرماتے ہیں کہ اوھر ادب دست درازی و دامنگیری کا مانع ہے ہم کھنچے ہوئے بیٹھے ہیں اُدھر حیا ان کو کچھ کہنے سے روک رہی ہے وہ حالت تذبذب میں خاموش ہیں جب دونوں طرف یہ کیفیت ہو تو کام کس طرح بنے؟

۴۔ تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

صنم پرست = عاشق۔ بت = معشوق۔ گزارا کیوں کر ہو = زندگی کیسے بسر ہو، کیسے زندہ رہیں۔

معشوق کی بدخوئی اور بے وفائی سے تنگ آکر اسی سے پوچھ رہے ہیں کہ اگر سب معشوق آپ کی طرح بے وفا اور نامہربان ہوں تو عاشقوں کی زندگی کیسے ہو؟ مطلب یہ ہے کہ آپ کی بے وفائی کی وجہ ہمارا جینا مشکل ہو گیا ہے۔

۵۔ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اب تک حضرت غالب اپنے رشک کے مضامین باندھتے ہیں اس شعر میں معشوق کے رشک و رقابت کو بیان فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں کہ آپ آئینہ میں اپنے ہی عکس کو دیکھ کر اس کے حسن و جمال پر رشک و حسد کرتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ ایک دو اور آپ جیسے حسین شہر میں ہوں تو معلوم نہیں کیا قیامت ٹوٹے۔ اور آپ ان سے کس قدر الجھیں۔

۶۔ جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں کہ میری سیاہ بختی کی کوئی حد نہیں اگر مجھ سا روز سیاہ کسی کو نصیب ہو تو اس دن کی سیاہی کے مقابلہ میں رات کی تاریکی شرما جائے اور وہ شخص رات کی تاریکی کو دن کی روشنی سمجھے۔ "اس دن کی سیاہی کیسی ہو گی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے (از یادگار غالب)

۷۔ ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

بات پوچھنا = خبر لینا، کسی کی طرف التفات کرنا، عزت سے پیش آنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق سے ہم کو مہربانی کی امید اور معشوق کو ہماری وفاداری و محبت کی قدر صرف ایک بات پر منحصر ہے وہ یہ کہ معشوق ہماری طرف التفات کرے اس کے التفات و خبر گیری کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم کو اس کی ذات سے توقع وابستہ ہوگی اور وہ بھی ہمارے حالات سے واقف ہو کر ہماری وفا شعاری اور جان سپاری کی قدر کرے گا۔ جب توجہ ہی نہ فرمائی جائے تو یہ دونوں باتیں پھر کس طرح حاصل ہوں۔

۸۔ غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان تسلّی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

دیدار جو : دیدار طلب ـــــ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ اگر دوست کا کوئی خط آجائے تو دل کو تسکین و تشفی ہوگی چنانچہ خط آیا اور دل کو تسلی ہوئی مگر دیدۂ دیدار طلب نے ضد اور ہٹ شروع کر دی کہ مجھ کو بغیر دوست کے دیدار کے کسی اور چیز سے تسلی نہ ہوگی دل و دیدہ کی اس کشمکش میں تسکین کیوں کر ہو سکتی ہے۔ حاصل کلام عاشق کو کسی طرح چین نہیں اور نہ اوسکے قسمتوں میں تسلی و تسکین ہے۔

۹۔ بتاؤ اس کی مژہ دیکھ کر کہ مجھ کو قرار — یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

نیش : ڈنک یہاں مراد نشتر۔ رگِ جان میں فرو ہونا : رگِ جان میں اتر جانا

ناصح کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ مژۂ یار ایک نشتر ہے جو نظر پڑی اور رگِ جان میں اتر گیا پھر آپ ہی مژۂ یار دیکھ کر فرمائیے اس نیش کے رگ جان میں اتر جانے کے بعد قرار کیسے ہو سکتا ہے؟

۱۰۔ مجھے جنون نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور — فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں کہ میری بے چینی جنون و دیوانگی کا نتیجہ نہیں ہے کہ بلا وجہ بھی بے قرار ہوں اس بے چینی و بے قراری کا موجب بقول حضور فراقِ یار ہے۔ فراق کی صورت میں تسکین ممکن نہیں

غزل نمبر ۱۰

۱۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نوا سنجِ فغاں ہونا : آہ و زاری کرنا ـــــ فرماتے ہیں کہ دل دے چکنے کے بعد فریاد اور

آہ وزاری اور معشوق سے شکوہ وشکایت شانِ عاشق کے خلاف ہے۔ عاشق کو خاموشی کے ساتھ عشق کی آگ میں جلنا چاہیئے جب دل ہی نہ رہے تو پھر زبان کیوں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے۔ عشق کی صعوبتوں کو خاموشی سے برداشت کرتا اور رازِ عشق چھپائے رکھتا ہے۔ ورنہ وہ عاشق نہیں بوالہوس ہے۔

۲۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

خو ۔ عادت ۔ خصلت ۔ وضع ۔ طرز ، روش ۔ سبک سر ۔ ذلیل ۔ سرگراں ۔ ناراض ، خفا ۔

فرماتے ہیں کہ وہ اپنی سرگرانی اور بے التفاتی کی عادت نہیں چھوڑتے ہمیشہ چین بہ جبین اور ناراض سے رہتے ہیں۔ اگر کچھ وجہ ہوتی تو پوچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بلا سبب کی خفگی کا سبب پوچھنا اپنے آپ کو حقیر و ذلیل کرنا ہے۔ اس لئے ایسے بدخو سے وجہ دریافت کر کے کیوں ذلیل ہوں۔

سبک سر و سرگراں دو متقابل کے لفظوں کو اس برجستگی ، موزونیت اور آسانی سے جمع کرنا صرف حضرتِ غالبؔ ہی کا حصہ ہے۔

۳۔ کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

فرماتے ہیں کہ غم عشق کو ہم نے چھپائے رکھا کسی پر اس کا اظہار نہیں کیا۔ جو بھی آزار اس سلسلہ میں پہنچا کئے خاموشی سے برداشت کرتے رہے لیکن ایک واقف کار دوست ہماری اس تکلیف و پریشانی کو دیکھ کر ازراہ محبت و ہمدردی بے چین و بے قرار ہوگیا۔ تاب نہ لاسکا اور چلا اٹھا اس طرح جس راز کو ہم نے بڑے اہتمام سے پوشیدہ رکھا تھا اس کا افشا ہوگیا خلق خدا کے منہ کو کون بند کرے اب ہر شخص کہے گا کہ کتنا کم حوصلہ اور تنگ ظرف تھا کہ غم کی تاب نہ لاسکا قصور غمخوار کا اور رسوائی ہو ہماری ایسی محبت و دوستی کو آگ لگ جائے۔ ایسے کم حوصلہ لوگ کیوں ہم جیسوں کے رفیق و رازدار بنیں۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ جس غم کو دوسرے دیکھ بھی نہ سکیں اور چیخ اٹھیں اس درد

کی کوئی انتہا بھی ہو سکتی ہے؟ اور پھر ایسے غم کا خاموشی سے برداشت کرنا اور چھپائے رکھنا کیا معمولی ظرف کا کام ہے؟۔

۴۔ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

استاد نے ان دو مصرعوں میں عشق و وفا، جور و جفا، بے التفاتی و بے اعتنائی اور مایوسی کی پوری داستان بھر دی ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان میں تاثیر بھرنی ان کا حق ہے کون داد دے سکے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی مسلسل بے التفاتی و بے مہری سے تنگ آ کر خودکشی کی ٹھان لی۔ لیکن وفاداری اور عشقِ صادق کا تقاضہ یہ تھا کہ مریں بھی تو یار کے آستانے پر سر پھوڑ کر مریں۔ چنانچہ اس اقتضائے عشق و وفا کی بناء پر یار کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں لیکن اس سنگدل کو ان کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو اس نے اس آخری آرزو کو بھی پورا ہونے نہیں دیا۔ اور اپنے سنگِ آستان پر سر پھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ صاف کہدیا کہ مرنا چاہتے ہو تو اور کہیں جا کر مرو۔ میرے ہاں یہ کیا تماشہ ہے۔ معشوق کی اس روش پر جل کر کچھ ناراض سی ہو کر فرماتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو پھر کہاں کا عشق کہاں کی وفا اور تیرے ہی سنگِ آستان کی تخصیص کیوں۔ کہیں بھی جائیں گے اور سر پھوڑ کر مر جائیں گے۔

۵۔ قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اوپر کے شعر کی طرح اس شعر میں بھی استاد نے غم و اندوہ، بدبختی و بے کسی اور انتہائی یاس کا ایک مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ نفسِ انسانی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے یعنی یہ پہلے ہی سے قفس میں تھا۔ اب ایک نو گرفتار بھی داخلِ قفس ہوا دیکھا تو اپنا ہی ہم چمن و ہمدم نکلا۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوگئے۔ اور فطری طور پر سب سے پہلے اس سے اپنے گھر بار و اہل و عیال کی خیریت دریافت کی۔ ہمصفیر کچھ کہتے ہچکچا رہا ہے۔ وہ ڈر رہا ہے کہ یہ پہلے ہی سے گرفتارِ بلا ہے اگر ایسی حالت میں خانہ بربادی کی خبر سنا دوں تو اس کا کیا حال ہوگا۔ ہمدم کی اس حالتِ گومگو کو دیکھ کر اصل حقیقت تاڑ گئے۔ زمین

پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ سمجھ گئے کہ کل جو بجلی گری تھی یقیناً میرے ہی آشیانہ پر گری اوسان خطا ہیں۔ یاس کا عالم ہے مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا خبر بد سے بچنے کی آخری کوشش کی جا رہی ہے اور ہم قفس سے پوچھا جا رہا ہے کہ کل جو بجلی گری تھی وہ کہاں گری

۶۔ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں؟ پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یعنی آپ تو رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں اس لئے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم دل میں نہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس درجہ قربت کے باوصف نظر نہیں آتے۔

۷۔ غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یعنی آپ جو شکایت فرماتے ہیں کہ میرے جذب دل کے اثر نے آپ کو میری طرف کھینچا ہے یہ شکایت غلط ہے۔ انصاف کیجئے کہ قصوروار جذب دل ہے یا آپ ہیں جرم کی ابتداء آپ سے ہے جو مجھ سے کھینچتے ہیں اس لئے جذب دل آپ کو کھینچتا ہے۔ تم اگر کھنچنا چھوڑ دو تو پھر کشاکش خود بخود ختم ہو جائے۔

۸۔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

فرماتے ہیں کہ یہ تو مسلم ہے کہ آسمان کی دشمنی سے خانہ ویرانی ہو جاتی ہے لیکن آپ کی دوستی اس سے بھی زیادہ بربادی کا موجب ہے۔ جب کسی انسان کو تباہ و برباد کرنا ہو تو آپ کی دوستی کا فتنہ کافی ہے۔ آسمان کی دشمنی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حضرت غالب اپنے ایک مکتوب میں جو مرزا حاتم علی صاحب مہر کا موسومہ ہے اس شعر کا دوسرا مصرعہ یوں تحریر فرماتے ہیں۔ ہوا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

۹۔ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

فرماتے ہیں کہ عدو کے ساتھ عہد الفت باندھنے کے بعد میری وفاداری کا امتحان لیا جا رہا ہے یہ آزمانا ہے یا ستانا آپ ہی تصفیہ فرمائیے۔ اگر یہ آزمائش ہے تو ستانا اور ظلم کس چیز کا نام ہے

۱۰۔ کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

یعنی معشوق کو ٹوکا گیا کہ رقیب سے ملنے میں آپ کی رسوائی ہو رہی ہے۔ رقیب ایک ذلیل قسم کا آدمی ہے اس سے ملنا مناسب نہیں جسکے جواب میں معشوق نے کہا کہ غیر سے ملنے میں رسوائی کی کیا بات ہے؟ معشوق کے اس جواب پر کسی قدر ناراض ہو کر طنزیہ اس کے قول کو دہرایا جا رہا ہے کہ ہاں کیوں ہو مطلب یہ ہے یقیناً رسوائی ہو رہی ہے۔ ضرور رسوائی ہو رہی ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ کیوں ہو؟

۱۱ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب　　　تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

یعنی جب خوشامد، چاپلوسی، اور منت سماجت سے کام نہیں نکلا تو آخری تدبیر کے طور پر طعن اور طنز سے کام لیا جا رہا ہے۔ خیال ہے کہ بے مہری کا طعنہ دینے سے یا تو منفعل ہو کر یا ضد وہٹ سے وہ مہربان ہو جائے گا۔ یعنی تو مجھ کو بے مہر کہتا ہے میں مہربان ہو کر تیری تکذیب کروں گا۔ مگر فرماتے ہیں کہ اے غالب یہ تدبیر بھی کچھ کارگر نہیں معلوم ہوتی بے مہر کہنے سے وہ مہربان کیوں ہو ممکن ہے کہ اور زیادہ ناراض ہو جائے۔ کون ہے جو اس غزل کی داد دے سکے۔ پوری غزل آبدار نشتروں سے بھری ہوئی ہے جو پڑھیگا سر دھنیگا۔ اوروں سے قطع نظر خود حضرت مرزا صاحب نے اس غزل کو یوں سراہا ہے۔ اپنے ایک مکتوب بنام مرزا حاتم علی صاحب مہر میں لکھتے ہیں کہ "اگر کسی بے درد پر دل آیا تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں و رخور افزائش ہے بقول غالب علیہ الرحمۃ ؎

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو　　　نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے حسن مطلع ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　　ہوا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے" (ماخوذ از اردوئے معلی)

غزل نمبر ۱۱

۱۔ رہئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو　　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

۲۔ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

۳۔ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں نہایت فصیح اور سلیس زبان میں کہے گئے ہیں۔ کوئی لفظ اور کوئی خیال محتاج تشریح نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم عصر شعراء کی رقابت، کم نظروں کی مضحکہ خیزی، جہال کی دشنام طرازی، معاندین کی ایذا رسانی اور اہل وطن کی ناقدری سے تنگ آ کر دنیا سے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے تنہائی کی زندگی میں صرف ایک تنہائی کی جسمانی تکلیف ہے باقی ان جملہ روحانی اذیتوں سے نجات مل جاتی ہے پہلے شعر میں خصوصیت سے "ہم سخن اور ہم زبان" کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ شعرائے وقت ہی آپ کی ذات اور آپ کے کلام پر بہ مقتضائے رقابت چوٹ کیا کرتے تھے جس کو جہال بہت زیادہ اچھالتے تھے۔

ردیف (ھ)

غزل نمبر (۱)

۱۔ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئنہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

دل۔ کثیر المعانی لفظ ہے۔ صوفیا کے پاس اس کے معنی عام معنی سے جدا ہیں چنانچہ اہل تصوف دل سے مراد نور بصیرت و معرفت لیتے ہیں۔ اس کے سوا دل کی تعریف یوں فرماتے ہیں کہ:۔

ہر کہ دل را دریافت خدا را دریافت و ہر کہ بدل رسید بخدا رسید۔

اس شعر میں حضرت غالب نے دل کو ان ہی معنوں میں باندھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آفتاب سے لے کر ذرہ تک ہر چیز دل ہے اور دل آئنہ ہے جس میں جمال محبوب منعکس ہے گویا دل مظہر جمال ہے۔ لہذا کائنات کا ذرہ ذرہ مظہر جمال ہے۔ طوطی سے مراد عارف ہے یعنی عارف بھی جو ایک دل ہے شش جہت میں اپنا ہی عکس منعکس پاتا ہے

خلاصہ یہ کہ عارف فنافی الحق ہو کر کائنات کے ذرہ ذرہ میں اپنا ہی وجود دیکھتا ہے یا صرف حق ہی

کو پاتا ہے۔

غزل نمبر (۲)

۱۔ ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

غمکدہ : غم کا گھر مراد شاعر کا گھر + فرماتے ہیں کہ موسم برسات میں در و دیوار گر کران پہ گھاس اُگ آئی ہے۔ جب بہار میں یہ بربادی ہے تو پھر اس غم کدہ کی خزاں کا کیا حال ہوگا۔ اس شعر میں بہار و خزاں کے موسموں کو غمکدہ سے متعلق فرما کر شاعر نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

۲۔ ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھایئے　　دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

اس شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "بے کسی" دنیا میں سب سے بُری چیز مانی جاتی ہے۔ جس کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ ہم اس درجہ مجبور اور لاچار ہو گئے ہیں کہ تنگ آکر بیکسی کی تمنا کر رہے ہیں اور ہماری یہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی ہے۔ یعنی ایسے نامراد ہیں کہ بیکسی کی آرزو بھی پوری نہیں ہوتی۔"

فرماتے ہیں کہ زندگی کا راستہ دشوار گذار اور کٹھن ہے۔ اگر ہمراہی و ہمسفر مہربان ہوں تو راستے کی صعوبتوں میں کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سفر میں ہم کو جو ساتھی ملے ہیں وہ بجائے مہربانی و مدد کرنے کے الٹے ظلم و ستم کرتے اور راستہ میں روڑے اٹکاتے ہیں جس کی وجہ زندگی کا یہ سفر اور بھی مشکل ہو جاتا ہے ان ہمراہیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ہم یہ آرزو و تمنا کر رہے ہیں کہ ان کا ساتھ چھوٹ جائے اور ہم تنہا اس راستہ کو طے کریں لیکن ہماری بیکسی کی یہ تمنا بھی پوری نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بھر نہ ان ظالموں کا ساتھ چھوٹے اور نہ بے کسی میسر آئے لاچار بیکسی کی حسرت اٹھاتے رہیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کاروبار میں جب تک پھنسے رہیں لوگوں سے واسطہ اور سابقہ پڑتا رہے گا۔ دنیا کے معاملات جاری رکھ کر اگر کوئی عزلت کی آرزو کرتا ہے یہ آرزو بر نہیں آسکتی۔ البتہ ترک دنیا کے بعد عزلت و بیکسی کی دولت ہاتھ آسکتی ہے۔

ردیف (ی)

غزل نمبر (۱)

۱۔ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

مژگان : پلک ۔ یہاں حجاب مراد ہے ۔

فرماتے ہیں کہ اگر نظر کے حجابات اٹھ جائیں تو یار سو سو طرح سے جلوہ گر نظر آئے مگر کس کی مجال جو تجلیات کی تاب لا سکے ۔

۲۔ ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات : وثیقہ ، چک ۔ برات معاش ، تنخواہ کا چک ۔

فرماتے ہیں کہ جنونِ عشق کی مد معاش یا تنخواہ کا اجازت نامہ پتھر پر لکھا جاتا ہے اور یہ چک یا اجازت نامہ اجراء کرنیوالے "طفلان" ہیں پس جب تک جنون عشق کی معاش جاری ہے منت طفلان اٹھانا ضروری ہے ۔

مطلب ہے کہ مجنوں پر بچے پتھر پھینکا کرتے ہیں اس لئے یہ پتھر جنون عشق کی آمدنی یا معاش ہیں چنانچہ بچوں کے طفیل یہ معاش یا تنخواہ ملتی ہے اس لئے ان کا احسان اٹھانا ضروری ہے

۳۔ دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

خانماں خراب : وہ شخص جس کا گھر برباد ہو گیا ہو ۔

فرماتے ہیں کہ اے خانماں خراب تیرے گھر کی بربادی کا موجب بار احسان ہے ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ تیرے گھر کے در و دیوار مزدور کے احسان کے بوجھ سے خم ہو ہو کر منہدم ہو رہے ہیں ۔ پھر بھی تیری غفلت دور نہیں ہوتی اور تو احسان اٹھائے جا رہا ہے ۔ اگر مزید تباہی سے بچنا چاہتا ہے تو کسی کا احسان نہ اٹھا ۔

۴۔ یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

زخم رشک: مراد صرف رشک ہے۔ چونکہ زخم سے بھی انسان کو تکلیف ہوتی ہے اور رشک سے بھی اس لیے زخم سے تشبیہ دیگئی۔ یہ ایسی ہی ترکیب ہے جیسے گلِ عارض وغیرہ۔ دوسری وجہ زخم کا لفظ لانے کی تبسم کی رعایت ہے۔ زخم اور خندہ میں کشادگی وجہ شبہ ہے۔

تبسم پنہاں: پوشیدہ طور پر ہنسا۔ چپکے چپکے سے بلاسبب مسکرا دینا۔ پردہ اٹھانا۔ بے تکلف ہونا۔ بات نہ چھپانا۔ بھید کھولنا۔

فرماتے ہیں کہ آپ جو بلاوجہ مسکرا دیا کرتے ہیں یہ کیا راز ہے۔ ہم کو یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ کے اور رقیب کے درمیان کچھ راز داری کا معاملہ ہوا ہے اسی کو یاد کرکے آپ تبسم فرمایا کرتے ہیں۔ اس گمان کے ساتھ ہی رشک کا زخم تازہ ہو جاتا ہے اور ہم بے قرار ہو جاتے ہیں اور جب ہم اپنی بے قراری اور بدگمانی کا اظہار آپ سے کرتے ہیں تو آپ ہمارے رشک کو بے بنیاد اور ہمارے گمان کو غلط بتاتے ہیں۔ اب یا تو آپ میرے گمان کو نہ جھٹلائیے اور میرے رشک کو بے بنیاد کہہ کر ذلیل و رسوا نہ کیجئے یا آپ کے قول کے موافق رقیب کا اس خندۂ زیرِ لب سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر اس تبسم پنہاں کا بھید مجھ پر کھول دیجئے تاوقتیکہ آپ بے تکلف ہو کر اس تبسم پنہاں کی وجہ مجھ پر ظاہر نہیں کریں گے میرا رشک اور میری بدگمانی حق بجانب ہوگی

غزل نمبر (۲)

۱۔ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے ۔۔۔ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

خرابات: مے خانہ۔ بھوں: کمان ابرو، محراب مسجد۔ آنکھ: چشم مخمور، مے خانہ۔ قبلۂ حاجات: زاہد خشک۔

شعرا بھوں کو محراب مسجد اور آنکھ کو مے خانہ باندھا کرتے ہیں، اور بیچارے زاہدوں پر چوٹ کرنی یا ان کی پھبتی اڑانی لوازمات شاعری سے ہے۔

فرماتے ہیں کہ اے قبلۂ حاجات مسجد کے ساتھ خرابات بھی ضروری ہے جس طرح محراب ابرو کے نیچے خرابات چشم ہے۔ اگر ابرو کے ساتھ آنکھ نہ ہو تو اس چہرہ کی بے رونقی اور

نقص کا کوئی حساب نہیں۔ اسی طرح مسجد بغیر مئے خانہ کے بے رونق اور بے کار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہری عبادت صوم وصلوٰۃ کے ساتھ باطنی ریاضت اور عشق وعرفان کی شراب بھی ضروری ہے۔ بغیر مئے عشق، نور عرفان و ایمان پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر سجدے کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت بھی دل میں ہو تو وہ نماز کامل ہے ورنہ خالی سر ٹکرانا ہوگا۔

۲۔ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

مکافات: بدلہ۔ فرماتے ہیں ظلم کا بدلہ ضرور لیا جاتا ہے۔ معشوق نے ہم پر مظالم کئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مکافات کے لئے معشوق کو کسی اور کا عاشق کر دیا ہے۔ اب یہ جس پر عاشق ہوا ہے، اس پر ظلم کریگا اس طرح ہم پر جو ستم کیا گیا ہے اس کا بدلہ مل جائیگا۔

۳۔ دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیئے

حسرت پرست: حسرت دوست جس کو رنج وغم اٹھانے کی خواہش ہو۔ تلافی مافات: گذری ہوئی کمی کی تکمیل کرنی۔

فرماتے ہیں کہ اے فلک ستمگر اب تک تو نے جو ظلم وستم ڈھائے ہیں اور ہماری آرزوں اور تمناؤں کا خون کیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ ہم کو تو اس سے بھی زیادہ کی توقع تھی اور چاہئے بھی۔ اس لئے کہ اللہ نے ہم کو دل ہی ایسا دیا ہے جو خوشی و مسرت کی بجائے حسرت وافسوس کا خواہاں ہے پس تو نے اگر اب تک ظلم میں کوئی کھوٹ کسر اٹھائے رکھی ہے تو اس کی تلافی کرے اور ہمارے حسرت پرست دل کی داد دے۔

۴۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

فرماتے ہیں کہ معشوقوں کے پاس رسائی کے لئے کسی نہ کسی ذریعہ کی ضرورت ہے اسلئے ہم نے مصوری سیکھی ہے۔ مہ جبینوں کو اپنے حسن کی تشہیر ونمائش کے لئے ہمیشہ تصویر کھنچوانی پڑتی ہے۔ پس تصویر کھینچنے کے بہانے ان کی ملاقات اور جی بھر کر ان کا دیدار میسر آجاتا ہے۔

۵۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

نشاط: عیش، شادمانی۔ روسیاہ: گنہگار۔ اک گونہ: تھوڑی سی۔

یعنی خدا کو پہنچنے کی سب سے بڑی شرط خودی کو فنا کرنا ہے۔ اس فنائیت کو بے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری مے نوشی عیش و نشاط و کیف و سرور کی خاطر نہیں بلکہ میں شراب اس لئے پیتا ہوں کہ ہر وقت خود فراموشی کے عالم میں رہوں۔

۶۔ ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

لالہ: گہرے سرخ رنگ کا پھول۔ نسرین: سیوتی کا پھول جس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ ہر رنگ: ہر حال

فرماتے ہیں کہ لالہ و گل اور نسرین کے رنگ جدا جدا ہیں۔ لالہ گہرا سرخ ہے۔ گلاب کا رنگ ہلکا سرخ اور نسرین کا رنگ سفید۔ الوان و اشکال کا اختلاف ضرور ہے مگر غور کریں تو ان سب کی اصل واحد ہے یعنے بہار جو غیر مرئی و لطیف ہے۔ لیکن اس کے آثار اس کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں۔ یہی حال اس عالم رنگ و بو کا ہے۔ موجودات لوان گنت ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہی لطافت ہے۔ اگرچہ وہ لطافت نہ صرف غیر مرئی ہے بلکہ ہمارے خیال و قیاس اور گمان سے بھی بالاتر ہے۔ پھر بھی اس کی وحدانیت کا ثبوت اسی کثرت میں موجود ہے

۷۔ سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

۸۔ یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیئے

خم: مراد پیر مغاں یا مرشد کامل، مٹکا۔ ہنگام بے خودی: بوقت استغراق۔ مناجات: دعا، نماز۔ پیمانہ صفات: مراد صرف صفات ذات ہیں اور مے ذات کی رعایت سے صفات کے ساتھ پیمانہ لایا گیا ہے۔ ذات تو ایک ہے مگر صفات کثیر ہیں مثلاً سماعت، بصارت، کلام، علم وغیرہ۔

یعنی انسان ہر وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ کبھی عشق و محبت میں سرشار و بے خود ہے کبھی مصروف عبادت ہے۔ کبھی سمیع ہے کبھی بصیر، کبھی کلیم و علیم ہے۔ یہ صفات کے پیمانے بھی مے ذات سے لبریز اور گردش میں ہیں یعنے بدلتے رہتے ہیں۔ عارف ان صفات کو ذات باری تعالیٰ سے متعلق کر دیتا ہے اور خود کو درمیان سے ہٹا لیتا ہے۔ مثلاً اس کا سننا

اس کا دیکھنا، اس کا کلام اس کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ یہ سب صفات حق کی ہیں اور موصوف بھی حق ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ عارف گردشِ صفات کے لحاظ سے کبھی تو عالم بے خودی میں خم کے پاؤں پر سر رکھے، کبھی نماز و مناجات کیلئے قبلہ رو ہو جائے لیکن ان سب حالتوں میں ذاتِ حق میں اپنے آپ کو گم کر دے۔

۹۔ نشو نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

فرماتے ہیں کہ درخت کی صد ہا ٹہنیوں کا نشو نما اور نمود جڑ سے ہے اگر جڑ نہ ہو تو پھر درخت بھی نہ ہو۔ اسی پر دنیا کی موجودات کو قیاس کر لیجئے کہ ان کی بھی ایک اصل ضرور ہے یعنی خدا جس سے یہ جملہ فروع نکلی ہیں۔ اسی خیال کو ایک دوسری مثال سے یوں ظاہر فرماتے ہیں کہ خاموشی اصوات کا ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اور جملہ باتیں اور آوازیں غیر محسوس سکوت سے پیدا ہوتی ہیں

غزل نمبر ۱۳

۱۔ بساطِ عجز میں تھا ایک دل اک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

بساط = پونجی، سرمایہ، اسباب خانہ۔ عجز = ناتوانی، کمزوری۔ بساطِ عجز = ناتوانی کا سرمایہ۔

فرماتے ہیں کہ ہمارا سرمایۂ ناتوانی یا مجبور دکمزور زندگی کا سہارا ایک دل ہے۔ جو رنج و غم میں گھٹتے گھٹتے صرف بقدر ایک قطرۂ خون باقی رہ گیا ہے۔ بساط عجز کے لئے یہ سرمایہ بھی گراں مایہ و غنیمت ہے۔ لیکن وائے بدبختی کہ قطرۂ خون کی طرح وہ بھی سرنگوں اور ٹپکنے پر آمادہ رہتا ہے۔ معلوم نہیں کس وقت ٹپکے اور زندگی کا خاتمہ کر دے۔

۲۔ رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

چندے = کچھ عرصہ تک۔ تکلف سے = بناوٹ سے۔ تکلف برطرف = بغیر تکلف کے صاف صاف بتا دیتے ہیں

فرماتے ہیں کہ ہم معشوق سے تھوڑی دیر تک کچھ کھنچے کھنچے سے اور آزردہ رہے لیکن ہماری یہ آزردگی بناوٹی تھی۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید ہماری آزردگی کا کچھ تو اثر اس شوخ پر ہو گا لیکن ہماری یہ تدبیر کچھ کارگر نہیں ہوئی بعد میں جب ہم نے اپنی اس حرکت پر غور کیا تو

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک قسم کی دیوانگی تھی جو سرزد ہوئی۔

۳۔ خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے — مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

زبُون = حقیر، ادنیٰ ــــ مطلب یہ ہے کہ عشق و محبت کے تعلق سے جو تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں ان کے مقابلے میں موت کی تکلیف بہت حقیر ہے۔ ہم تو غمِ عشق و سوزِ محبت کے متمنی ہیں اس میں شک نہیں بعض وقت تنگ و مجبور ہو کر موت کی بھی تمنا کی ہے لیکن اصل تمنا تو غمِ عشق کی ہے اس لئے اگر غمِ عشق میسر نہ ہو اور صرف مرنے ہی کی آرزو پوری ہو جائے تو ایک وقت لذتِ مرگ حاصل ہوگی اور روزانہ کی موت کی لذت سے محروم رہیں گے اس لئے موت کا خیال باعثِ تسکین نہیں اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کسی بڑے شکاری کے جال سے ہاتھی، گھوڑے، ارنے، بھینسے نکل جائیں اور صرف ایک خرگوش ہاتھ آئے تو اس صیدِ زبوں سے اس کو کیا خوشی ہوگی۔

۴۔ نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

کاش = حرفِ تمنا۔ ہمدم = ساتھی، دوست۔ باعثِ افزائش = زیادتی کا موجب۔ دردِ درون = دردِ دل ــــ فرماتے ہیں کہ جب آتشِ عشق اور دردِ دل کا وفور ہوا تو اس خیال سے کہ نالہ و آہ و زاری کرنے سے اس آگ میں کچھ کمی ہوگی اور دل ہلکا ہوگا۔ نالہ و زاری کی۔ مگر جوں ہی رونا شروع کیا دردِ دل میں اور اضافہ ہو گیا۔ اے کاش میں نے نالہ نہ کیا ہوتا۔ مگر دوست مجھے خبر نہیں تھی کہ نالہ کرنے سے دردِ دل میں اضافہ ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب انسان غم میں بھرا بیٹھا ہے تو ایک ذرا سی چھیڑ بھی اس کو زار و قطار کر دیتی ہے۔

۵۔ نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

بُرّش۔ کاٹ۔ تیغِ جفا۔ ظلم کی تلوار مراد ظلم۔ بُرّشِ تیغِ جفا۔ ظلم کا اثر جو عاشق کو تڑپاتا ہے۔

یعنی اے دوست تو میری بے تابی اور تڑپ کے دریا کو موجزن دیکھ کر یہ سمجھ رہا ہے

کہ یہ تیرے ظلم وستم اور ناز و انداز کی تاثیر ہے اور بزعم خود اس بات پر اترا بھی رہا ہے کہ تیری تیغِ جفا نے میرے سینے میں دریائے خون موجزن کر دیا۔ مگر دوست تیرا خیال اور تیرا اترانا غلط ہے ہم ان کم حوصلہ اور پست ہمت لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ تیرے اس تھوڑے ظلم سے اس درجہ بیقرار ہوں۔ اس سینے میں صدہا غم ہیں۔ تیری محبت بھی ایک غم ہے۔ تیری جدائی بھی ایک غم ہے۔ رشکِ رقیب کا بھی غم ہے۔ فلکِ ناہنجار کی ہُنر دشمنی کا بھی غم ہے۔ اپنوں کی بیوفائی اور عزیزوں کی عداوت کا بھی غم ہے۔ ایسے ہی صدہا غموں سے مل کر یہ دریائے بیتابی بنا ہے تیری جفا اس دریائے خون کی ایک ہلکی سی لہر ہے۔ اس لئے اپنی تیغِ جفا کی برش پر ناز نہ کر۔

۶۔ مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے	لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مئے عشرت۔ عیش و آرام۔ واژگون۔ اوندھے

فرماتے ہیں کہ گردوں ایذا رسانی اور ظلم وستم کا سرمایہ دار ہے اس کے پاس عیش و آرام کہاں کہ اس سے عیش کی خواہش کی جائے۔ چند جام ضرور لئے بیٹھا ہے مگر ان میں مئے عشرت کا ایک قطرہ بھی نہیں اور رہے بھی کیسے اس کے ساتوں کے ساتوں جام اوندھے ہیں۔ ایسی صورت میں ساقیٔ گردوں سے مئے عشرت کی توقع فضول ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آسمان صاحب کمال وذی ہُنر کا دشمن ہے اس سے بجز تکلیف و ایذا کے آرام کی توقع نہیں شعراء آسمان کو کاسۂ واژوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور آسمان گنتی میں بھی سات ہیں اس لئے ایک، دو، چار جام واژگون کہا ہے۔

۷۔ میرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں	خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ میرے دل میں معشوق سے وصل کی خواہش بھی ہے اور اس سے جدائی کی شکایت بھی ہے۔ خدا وہ دن لائے کہ اس سے اطمینان کی ملاقات ہو تاکہ میں اس کے سامنے اپنے شوقِ وصل اور شکوۂ جدائی کو دل کھول کر بیان کر سکوں۔

غزل نمبر

۱۔ ہی بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آ گئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

فرماتے ہیں کہ معشوقوں کی بزم میں شرم کے مارے ہمارے منہ سے بات نکلتی نہیں اور معشوق انتہائی خوشامد طلب ہوتے ہیں۔ بغیر خوشامد کرنے کے چارہ بھی نہیں۔ عجب حالت کشمکش میں مبتلا ہیں اور ایسے خوشامد پسند معشوقوں سے تنگ آ گئے ہیں۔

۲۔ ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

دورِ قدح: گردشِ ساغر۔ صہبا: شراب۔ خم: مٹکا

آپ چاہتے ہیں کہ خم کی پوری شراب تنہا پی جائیں۔ اس کیلئے کچھ نہ کچھ وجہ پیدا کرنی تھی۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ شراب کا خم سے ساغر میں اور ساغر کا گردش میں آنا بیچاری شراب کو پریشان و پراگندہ کرتا ہے۔ اس کو اس پریشانی سے بچانے کی ایک تدبیر ہے اور وہ یہ کہ خم کو ایک بار میرے لبوں سے لگا دیں۔ وہ خم سے نکل کر میرے پیٹ میں محفوظ ہو جائیگی اور اس طرح پریشانی و پراگندگی سے بچ جائے گی۔

۳۔ رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

زنہار: حرفِ تنبیہ ہے۔ خبردار، ہرگز۔ طرف ہونا: الجھنا۔ طرف: مقابل، حریف۔

فرماتے ہیں کہ اے زاہد عوام تو آپ کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ آپ کی بیجا و بے جا بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں اور جو آپ خفا ہوں تو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کریں مگر رندانِ درِ میکدہ کا یہ حال نہیں۔ یہ بدمست بڑے گستاخ اور منہ پھٹ ہیں۔ خبردار ان بے ادبوں سے دوسروں کی طرح نہ الجھنا ورنہ بری طرح منہ کی کھائے گا۔

۴۔ بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

بیداد وفا: وفا کا ظلم یعنی وہ ظلم جو معشوق ڈھاتا رہا اور وفا نے اس کی مقاومت و انسداد کی ہم کو اجازت نہیں دی اس لئے اس ظلم کی ذمہ دار معشوق سے زیادہ ہماری وفا ہے۔ جان کو لبوں سے ربط تھا۔ یعنی جان بلب ہو گئے تھے۔ نیم جان تھے۔ ہر چند: بہتیرا

فرماتے ہیں کہ عشق و محبت کی سختیاں اور معشوق کا ظلم اٹھاتے اٹھاتے میری جان بیزار ہوگئی اور جسم کو چھوڑ کر جانا چاہتی تھی لیکن لبوں نے قدیم آشنائی کے مدنظر اس کو سمجھا منا کر جانے نہیں دیا اور اپنے پاس رکھ لیا۔ اب جان جسم کی بجائے ہونٹوں پر رہنے لگی ہے۔ لیکن اس نوبت پر بھی میری وفا معشوق کا ساتھ دیتی رہی اس نے جان کا کچھ پاس و لحاظ نہیں کیا وفا کی اس درجہ بے اعتنائی اور ظلم کو دیکھ کر جان تنگ آگئی اور لبوں کو بھی خدا حافظ کہہ کر جاتی رہی

اس شعر میں اپنی وفاداری کی استواری بتلائی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ جان دیدی مگر دامنِ وفا کو نہیں چھوڑا۔

غزل نمبر (۵)

ا۔ تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ‏ ‏ سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ "ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں" لیکن جب میرے دشمن اس کے سامنے میری شکایت کرتے ہیں وہ سن لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کہتا یعنی رقیبوں کی ہمنوائی میں اپنی زبان سے ہماری شکایت نہیں کرتا۔ جو لوگ اس کی خو بو سے واقف نہیں اس کی خاموشی کی مصلحت کو پا نہیں سکتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ آدمی اچھا ہے خود کسی کو بُرا نہیں کہتا اور جو دوسرے کسی کی شکایت کریں مجبوراً سن لیتا ہے کہ نہ سننا بھی ایک بے مروتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی خاموشی کا سبب ہم کو اپنے پاس آنے سے روکنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ تقریب اس تک رسائی کی ڈھونڈھتے رہتے ہیں اگر وہ اپنی زبان سے ہماری شکایت کرے گا۔ ہم اس کی شکایت و شکوہ کے بہانے اس تک پہنچ جائیں گے۔ بس اسی خیال سے وہ ہم کو شکایت کا موقع نہیں دیتا۔

۲۔ غالبؔ تیرا احوال سنا دیں گے ہم اُنکو ‏ ‏ وہ سُن کے بلالیں یہ اجارہ نہیں کرتے

اجارہ کرنا = ذمہ لینا۔ ٹھیکہ لینا ـــــ فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ ہم تیرا حال معشوق کے سامنے بیان کریں گے۔ تیری سفارش میں سعی بھی کریں گے۔ اس کے بعد تیرے مقدر، ہم اس بات

کا ذمہ نہیں لیتے کہ تیرا حال سننے کے بعد وہ تجھ کو ضرور بلالیں گے۔

غزل نمبر (۶)

۱۔ گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا   وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یعنی غم عشق سرو سامان کو تباہ و برباد کرنے والا ہے اور جہاں کچھ بھی نہ ہو تو پھر وہ کس چیز کو غارت کریگا۔ اس لئے معشوق سے باندازِ مایوسی خطاب فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے غم کی تواضع و مدارات ہم نہ کرسکے اگر گھر میں کچھ سرو سامان اور مال و دولت ہوتی تو ہم اس کی نذر کرتے اور وہ اس کو غارت کرتا۔ لیکن ہم پہلے ہی سے تباہ و برباد شدہ ہیں ایک تنکا بھی گھر میں نہیں ایسی صورت میں وہ کیا غارت کرتا۔ البتہ پہلے بھی حسرت تعمیر رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں۔ بجز اس حسرت کے اور کچھ نہیں رکھتے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم ازلی بے نوا فقیر ہیں تمام عمر سرو سامان کی حسرت میں کٹی مگر کسی وقت سرو سامان میسر نہ ہوا۔

غزل نمبر ۷

۱۔ غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی   فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

سر اٹھانے کی فرصت پانا = دم بھر کی مہلت ہونا، تھوڑی سی دیر کے لئے کسی کام سے نجات پانا۔

تقریب = سبب، باعث۔

فرماتے ہیں کہ غم دنیا اس قدر زیادہ ہے کہ اس سے نجات ملنی مشکل اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے سر اٹھانے کی فرصت پائی بھی تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر پڑتی ہے اور اس ستمگر کو دیکھتے ہی آپ کے ظلم و ستم یاد آجاتے ہیں۔ وہ بھی ستمگر اور تم بھی پھر ایک نیا درد اور نیا غم شروع ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی صورت غم سے نجات نہیں ہے یا تو غم روزگار ہے یا غم عشق۔

" یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر

جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔" (از یادگار غالب)

۲۔ کھلیگا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانیکی

جناب بیخود دہلوی نے اس شعر کی اچھی شرح فرمائی ہے جو بجنسہٖ درج کی جاتی ہے:۔
فرماتے ہیں "دو صورتوں سے میرے خط کا مضمون اس پر ظاہر ہو سکتا تھا۔ ایک اس طرح کہ وہ میرے خط کو کھول کر پڑھتا تو اس کے مطالب سے آگاہ و خبردار ہو جاتا اس بات کی تو اس کافر سے امید ہی نہیں وہ کیوں خط کھولے اور پڑھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میرے خط کو غصہ میں آکر جلا دیتا اور اس وقت میرے سوزِ عشق و آتشِ فراق سے آگاہ ہو جاتا۔ مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہے۔ یہ بھی امید قطع ہو گئی" (ماخوذ از مرأۃ الغالب)

۳۔ لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانیکی

پرنیاں:۔ نہایت مہین منقش ریشمی کپڑا جو ملک چین میں بنایا جاتا تھا، حریر، دیبا، لپٹنا یہ لفظ کثیر المعانی ہے۔ ملفوف ہونا۔

فرماتے ہیں کہ پرنیاں میں شعلۂ آتش کا ملفوف ہونا جیسا کچھ مشکل ہے ظاہر ہے پھر بھی حکماء پرنیاں میں شعلہ کو ملفوف کرنے کی کوئی تدبیر و حکمت نکال سکیں اور ممکن ہے شعلہ کو پوشیدہ رکھیں۔ لیکن آتشِ عشق کو دل میں چھپائے رکھنے کی کوئی حکمت اور تدبیر ممکن نہیں گویا دل پرنیاں سے زیادہ نازک اور سوزِ غم شعلۂ آتش سے زیادہ تیز ہے۔

اس شعر میں پرنیاں، دل، شعلۂ آتش، سوزِ غم، مشکل، آساں، لپٹنا، چھپانا لفظی رعایات حضرت غالب کی قادر الکلامی کا ادنیٰ کرشمہ ہیں۔

۴۔ انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

یعنی معشوق بزم سے یہ کہہ کر اٹھا کہ ہم سیر گل کو جاتے ہیں اور گیا اپنے عاشقوں کے زخموں کا تماشہ دیکھنے جو گل و لالہ کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ معشوق کے بہانے کی شوخی و

سفاکی ستم ہے گویا اس کے نزدیک بسیر گل اور زخمیوں کا دیکھنا مساوی ہے۔

۵۔ ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا   ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

سادگی۔ بے وقوفی، عقل کی کوتاہی۔ التفاتِ ناز۔ مراد معشوق کا آنا۔ تمہید۔ عنوان، تقریب آغاز۔ مرنا۔ بے حد خوشی ہونا، فریفتہ ہونا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کے ہمارے گھر آنے سے ہم کو انتہائی مسرت ہوئی۔ مگر ساتھ ہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہماری خوشی سراسر غلط اور اس کے آنے کو جو ہم نے التفات سمجھا وہ ہماری نادانی تھی۔ جہاں اس کے ستانے اور آزار پہنچانے کے صدہا طریقے ہیں اس کا ہمارے گھر آنا بھی ستانے کا ایک ڈھنگ ہے بس ابھی آیا ہی تھا کہ چل کھڑا ہوا۔ گویا اس کا آنا محض جانے کے واسطے تھا۔ نہ سلام نہ کلام نہ توقف نہ قیام آیا اور گیا۔ اب ہم ہیں کہ تڑپ رہے ہیں۔ اس ظالم کا منشا ہی آنے سے یہی تڑپانا تھا۔ اور ہم نے اپنی خوش فہمی سے اس کو التفات سمجھا۔

۶۔ لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

لکد کوب۔ دولتی۔ حوادث۔ جمع حادثہ بمعنی آفات۔ ضامن۔ ذمہ دار، کفیل۔ طاقت۔ صلاحیت

اس شعر سے دو باتیں نکلتی ہیں ایک یہ کہ میں عشق و حسن اور تخیل کی دنیا میں رہنے والا آدمی مجھ کو دنیا کے کاروبار سے اور حوادث سے نپٹنے کے ڈھنگ اور طور طریق یاد نہیں قدرت نے ایک صلاحیت دی ہے اور دوسری یعنی فکر دنیا کی صلاحیت نہیں دی۔ دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ معشوقوں کا ناز اٹھانا حوادث و آفات زمانہ سے بھی زیادہ مشکل کام ہے! ایک زمانہ ایسا تھا کہ میں بتوں کے ناز اٹھایا کرتا تھا۔ مگر اب اس قدر کمزور ہو گیا ہوں کہ حوادث کا معمولی بار بھی نہیں اٹھا سکتا۔

۷۔ کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالبؔ   بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

خوبی۔ بھلائی مگر یہاں طنز ابرائی کے معنوں میں آیا ہے۔ اوضاع۔ جمع وضع بمعنی رنگ ڈھنگ

چال چلن، کردار۔ ابنائے زمان۔ اہل زمانہ، اس شعر میں ابن الوقت کی جمع بمعنی زیادہ مناسب ہے۔

فرماتے ہیں کہ اہل زمانہ کے کردار کی پستی کیا بیان کی جائے۔ جن حضرات کے ساتھ ہم نے ایک دو نہیں بلکہ کئی بار نیکی کی تھی ان ہی لوگوں نے ہمارے ساتھ برائی کی۔

غزل نمبر (۸)

۱۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی　　دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی۔ خرامیدن مصدر سے امر حاضر پر آرزو کا لفظ بڑھا کر آرزو خرام اسم فاعل ترکیبی اور پھر اس سے آرزو خرامی حاصل مصدر بمعنی "خرامیدن بہ آرزو" بنا لیا۔ مراد سعی تلاش اس کے معنی ہوئے۔ ڈوبی ہوئی اسامی۔ وہ کاشتکار جس کی کشت کسی وجہ برباد ہو گئی ہو اور زر لگان ادا کرنے کے قابل نہ۔

فرماتے ہیں کہ کثرت گریہ کی وجہ دل کی پیداوار یا کشت سب بہ گئی ہے۔ اور وہ ڈوبی ہوئی اسامی کی طرح بے مایہ و قلاش ہو چکا ہے۔ اب اس اسامی سے کچھ حاصل ہاتھ آنے کی توقع نہیں ہے۔ حاصل کی آرزو و جستجو عبث ہے۔

مطلب یہ ہے کہ غم کی زیادتی نے دل کو ڈبو دیا ہے، اب نغمہ ہائے مسرت یا نالہائے غم یعنی فکر سخن کی توقع نہیں۔

۲۔ اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھائے　　میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

جلے ہوئے۔ عاشقان الٰہی۔ داغ ناتمامی۔ ناقص ہونے کا عیب۔

فرماتے ہیں کہ میرا شمار بھی عاشقوں اور عارفوں میں ہے فرق یہ ہے کہ وہ کامل ہیں اور میں ناقص۔ میری اور ان کی مثال ایسی ہے کہ وہ روشن شمع ہیں اور میں گل کیا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ روشن شمعوں میں ایک بجھا ہوا شمع داغدار و عیبناک ہوتا ہے۔

غزل نمبر (۹)

۱۔ کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے　　جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

شاعری میں غمزدوں اور عاشقوں کی دنیا تنگ ہی ہوا کرتی ہے۔ بیضۂ مور۔ چیونٹی کا انڈا۔

زمین کے مقابلے میں آسمان کی وسعت کروڑہا گنا زیادہ بلکہ اس کی بڑائی اندازہ اور قیاس سے بھی بالاتر ہے یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم تمرزدگان کے جہان کی تنگی کا اسی سے قیاس کرلیجئے کہ ایک بیضۂ مور اس کا آسمان ہے۔ جس دنیا کا آسمان چیونٹی کا ایک انڈا ہو اس دنیا کی تنگی بھی قیاس و اندازہ سے باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم نصیبوں کے حق میں دنیا بہت تنگ ہے۔

۳۔ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کائنات = عالم کون و مکان، ثوابت و سیار۔ ذوق سے = مرضی سے۔ پرتو = نور، روشنی

فرماتے ہیں کہ جس طرح آفتاب کی کرنوں میں ذرے متحرک نظر آتے ہیں اور بغیر آفتاب کے نور کے وہ معدوم سے رہتے ہیں بھٹیک اسی طرح ان سیاروں کی گردش اور موجودات عالم کی حرکت تیری ہی مرضی سے ہے۔ بغیر تیری مرضی کے یہ بھی معدوم ہیں۔

۴۔ حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

سیلی = گردنی مراد اچوٹ و ضرب۔ خارا = سنگ خارا سخت پتھر۔ شیشہ = مراد دل۔ مے = مراد سامان مسرت و شادمانی۔

فرماتے ہیں کہ میرا دل حوادث و آفات زمانہ کی چوٹوں سے خون ہو کر لالہ رنگ ہو گیا ہے لیکن ناواقف لوگ شیشۂ دل میں خون کی سرخی کو دیکھ کر گمان کرتے ہیں کہ مے گلفام سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ مصائب و آفات روزگار سے دل خون ہو گیا ہے۔ مگر ہم اپنی تکلیف کا کسی پر اظہار نہیں کرتے۔ ہماری وضعداری اور بے نیازی کو دیکھ کر عوام جن کو حقیقت کی خبر نہیں دھوکہ کھاتے ہیں کہ ہم بڑے ہی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

۴۔ کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مقام ہے

جا گرم کرنا = سکونت پذیر ہونا، رہنا۔ اہل ہوس = بوالہوس، رقیب۔ سینہ = مراد دل

فرماتے ہیں کہ رقیب کا سینہ آتش عشق سے عاری ہے اور محبت کی گرمی سے

خالی ہے۔ اس لئے معشوق نے ٹھنڈا مقام دیکھ کر اپنا مسکن بنایا ہے۔

۵۔ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا   بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔ اس میں دو معنی رکھے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے۔ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔ (ازیادگار غالب)

۶۔ بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں   فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

کشور۔ ملک۔ فرمانروا۔ بادشاہ۔

یعنی معشوق کی دیوار کا سایہ جس کو نصیب ہوا اس کی خوش قسمتی کی کوئی حد نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھنے سے اس کو اتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی خوشی کسی بادشاہ کو فرمانروائے ہندوستان ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس شعر میں ہندوستان کی خصوصیت غالباً اس اقلیم کی وسعت، زرخیزی اور آبادی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ دنیا کا کونسا حکمران تھا جس نے ہندوستان کا خواب نہیں دیکھا۔

۷۔ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا   کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

اعتبار۔ خیال، یقین، اطلاق، بھروسا۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے وجود کا یقین یا اطلاق جگر سے تھا یعنی جب تک جگر رہا ہم خیال کرتے رہے کہ ہماری ہستی ہے۔ مگر اب غم نے جگر کو جلا کر ختم کر دیا ہے اور جگر کی بجائے اس کے جلنے کی علامت ایک داغ کی صورت میں باقی ہے۔ لہذا جس چیز پر ہماری ہستی کا اعتبار منحصر تھا وہ چیز ہی باقی نہیں رہی۔ اس لیے ہماری ہستی بھی مٹ گئی۔ لیکن جب ہم اسی بات کو لوگوں سے بیان کرتے ہیں کہ ہمارا وجود باقی نہیں ہے۔ کثرتِ غم سے جگر ہی مٹ گیا اور جگر کی بجائے ایک داغ رہ گیا ہے تو وہ ہماری بات باور نہیں کرتے۔ پھر ہم کس طرح اور کس کو اپنی ہستی کے فنا ہونے کا یقین دلائیں۔

لطف اس شعر میں یہ ہے کہ شاعر اپنے کو معدوم سمجھتا ہے اور دوسرے سب اس کو موجود سمجھتے ہیں

۸۔ ہے بائے اعتمادِ وفاداری اس قدر غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

مطلب یہ ہے کہ باوفا عاشق ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ خواہ معشوق مہربان ہو خواہ نامہربان۔ اس کے برعکس بیوفاؤں اور بوالہوسوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ معشوق اگر مہربان رہا تو خوش رہے اور نامہربان ہو تو ناراض۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ ہم کو اپنی وفاداری پر اس قدر کامل بھروسہ ہے کہ معشوق کے نامہربان ہونے سے بھی ہم خوش ہیں۔ ناراض نہیں ــــ یا ــــ معشوق کو ہماری وفاداری پر کامل اعتماد ہونے کی وجہ ظلم کرتا ہے۔ اس لئے ہم ظلم سے بھی خوش ہیں۔

غزل نمبر (۱۰)

یہ غزل بطور نوحہ مرزا صاحب نے غالباً اسی معشوقہ کے مرنے پر کہی ہے جس کا ذکر مرزا حاتم علی صاحب مہر کے موسومہ ایک رقعہ میں مندرج ہے۔

لکھتے ہیں :" ....

....

.... بھائی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے چالیس، بیالیس، برس کا یہ واقعہ ہے۔ بآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن سے میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آجاتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو...... "

۱۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

مرنے سے پہلے محبوبہ کو بیقرار دیکھ کر فرماتے ہیں کہ اے دوست اب تو میرے درد سے بیقرار ہو رہا ہے لیکن اس سے پہلے تیری یہ حالت نہیں تھی۔ ہم تڑپا کرتے تھے اور تو بے اعتنائی

برتتا تھا۔ تیری وہ غفلت شعاری اب کہاں گئی۔

۲۔ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

آشوب۔ پریشانی۔ غمگساری کرنا۔ غم خواری کرنا، شریک رنج و راحت ہونا۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو غمِ محبت کی پریشانی برداشت نہیں کر سکا اور اپنی جان دیدی جب تیرے دل میں آتی تاب و طاقت نہیں تھی تو تو نے مجھ سے الفت کیوں کی تھی۔

۳۔ کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

غمخوارگی۔ غمخواری۔ دوستی، ہمدردی

فرماتے ہیں کہ میری دوستی کا خیال تجھ کو کس لیے پیدا ہوا۔ اگر مجھ سے دوستی و ہمدردی نہ کی ہوتی تو بہتر تھا۔ افسوس ہے کہ مجھ سے دوستی کر کے تو نے اپنے ساتھ دشمنی کی یعنی رسوائی کے خوف سے مر گیا۔

۴۔ عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو نے مجھ سے تمام عمر وفادار رہنے کا عہد کیا تھا مگر اس پائیدار پیمانِ وفا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس لئے کہ عمر خود ناپائیدار ہے۔ قضا آئی اور عہد ٹوٹ گیا۔

۵۔ زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

چونکہ زندگی کی آب و ہوا تیرے ناموافق تھی اور تو جاتا رہا۔ اس لئے یہ آب و ہوا مجھے زہر لگتی ہے۔ یعنے جو چیز تجھے راس نہ آئے مجھے کس طرح پسند ہو۔

۶۔ گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

گلفشانی، پھول بکھرنا۔ جلوہ، سامنے آنا، خرامِ معشوق۔

فرماتے ہیں کہ جب تک تو زندہ و تندرست تھا سو سو ناز و انداز سے جلوہ گری کرتا تھا۔ وہ ناز و ادا کی گلفشانی خاک میں مل گئی۔ اب ہم تیری قبر پر گلکاری کر رہے ہیں یعنی پھول چڑھاتے ہیں

۷۔ شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

شاعر نے معشوق کے مرنے کو اس کا اختیاری فعل قرار دیا ہے اور مرنے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب ہم سے اس کی آشنائی و محبت کے چرچے ہونے لگے تو رسوائی سے بچنے کے لئے اس نے اپنا منہ خاک میں چھپالیا گویا خود کو خاک میں ملاکر اس نے محبت کی پردہ داری کی اسلئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس پر الفت کی پردہ داری ختم ہوگئی۔

۸۔ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ۔۔۔ اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ناموس: عزت۔ پیمان محبت کی عزت و حرمت اسی میں ہے کہ جو عہد کیا ہے اس پر استوار رہے اس شعر سے دو مفہوم اخذ ہوتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ اے دوست تو نے مجھ سے ہمیشہ کے لئے پیمان وفا باندھا مگر اس پر قائم نہیں رہا۔ مفارقت کر کے عہد شکنی کی اور ناموسِ پیمانِ وفا کو خاک میں ملا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے رسم یاری اٹھ چکی ہے۔ ورنہ اس قسم کی بے وفائی تجھ سے ظاہر نہ ہوتی۔ تیرا پیمان وفا توڑنا ثبوت اس بات کا ہے کہ دنیا میں دوستی و وفا کا نام نہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اے دوست تو ایسا صادق الوعد اور صادق القول تھا کہ تجھ سے ہی پیمان وفا کی عزت اور یاری کی راہ و رسم قائم تھی۔ تیرے مرنے سے ناموسِ پیمانِ محبت بھی تیرے ساتھ خاک میں مل گئی اور دنیا سے دوستی کی ریت اٹھ گئی یعنی اب دنیا میں تجھ سا باوفا دوست کوئی نہ رہا۔

۹۔ ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۔۔۔ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

تیغ آزما: معشوق۔ یعنی ناز و انداز تیغ اور معشوق تیغ چلانے والا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کے ناز و ادا کے خنجر و تیغ نے دل کو پوری طرح گھائل نہیں کیا تھا اس کا ہاتھ بیکار ہوگیا زخم کھانے کی حسرت باقی رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو معشوق کے ناز اٹھانے کی بڑی تمنا تھی۔ ہماری آرزو پوری نہ ہونے پائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔

۱۰۔ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشکال ۔۔۔ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

شب ہائے تار برشکال = موسم بارش کی اندھیری راتیں ۔ یہاں اس سے مراد تنہائی کی رات جس میں تاریکی و غم کی دونوں ہوتی ہیں ۔ خوکردہ = عادی ۔ اختر شماری = تارے گننا مراد اس سے نیند نہ آنا ۔

فرماتے ہیں کہ ہم کو رات تمام نیند نہیں آتی اختر شماری کرتے ہوئے رات کاٹتے ہیں ۔ دوست رہتا تھا ہنستے بولتے ۔ کہتے سنتے رات آسانی سے کٹ جاتی ۔ بے خوابی کی تکلیف ہم نے محسوس نہیں کی ۔ اب جب کہ دوست داغ مفارقت دیچکا ہے اور ہم تنہا رہ گئے ۔ یہ ہجر کی تاریک لمبی راتیں کس طرح کٹیں ۔

۱۱۔ گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

مہجور = فراق زدہ ۔ محروم = بے نصیب ۔

فرماتے ہیں کہ کان دوست کے پیام سے اور آنکھیں جمال سے محروم ہوگئی ہیں ۔ ایک دل متعدد محرومیوں اور مایوسیوں کو کس طرح برداشت کر سکے ؟

۱۲۔ عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ — رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

فرماتے ہیں کہ اے غالب ابھی عشق جنون کی حد تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ معشوق نے مفارقت کی ۔ ہمارے دل میں جامہ دری اور دشت نوردی کا جو شوق تھا وہ پورا نہ ہو سکا ۔ حسرت خواری و رسوائی باقی رہ گئی ۔

غزل نمبر (۱۱)

۱۔ سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے — تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

سرگشتگی = پریشانی ۔ عالم ہستی = زندگی ۔ یاس ۔ مایوسی ۔ نوید = مژدہ ، خوشخبری ۔

فرماتے ہیں کہ تسکین کی تلاش و جستجو میں ہم اس درجہ سرگردان و حیران رہے کہ آخر کار زندگی سے مایوسی ہوگئی ۔ اور تسکین ہے کہ ہم سے بھاگتی رہی ۔ جب زندگی سے مایوسی ہوگئی تو موت کی امید بندھ گئی ۔ موت کے ساتھ تسکین بھی نصیب ہو جائے گی ۔ یعنی جو آرزو زندگی میں بر نہ آئی مرنے پر پوری ہوگی ۔ اسلئے تسکین کو مژدہ سنایا جا رہا ہے کہ مرنے کی آس ہو چلی ہے

اب تو ہم سے دور مت بھاگ، آجا پاس آجا۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ زندگی میں تو سخی کے باوصف تسکین نصیب نہ ہوئی مرنے پر خود بخود حاصل ہوگی۔

۲۔ لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر — اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

فرماتے ہیں کہ میرا دل معشوق کی تلاش میں کوبکو گھومتا رہتا ہے۔ غرض جہاں جہاں اس کا گزر ہوتا ہے۔ یہ آوارہ بھی وہاں موجود مگر اس کے باوصف معشوق کی نخوت اور غفلت شعاری تو دیکھئے کہ نہ اس کو ہمارا دل نظر آتا ہے اور نہ اس کی خبر لیتا ہے۔ ظالم اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ میرا دل میرے ہی سینہ میں ہے۔ حالانکہ جس روز سے اس کافر سے نظر لڑی ہے۔ دل میرے سینے سے نکل کر اس کے پیچھے ہولیا۔ اور آوارہ کوبکو ہے۔

۳۔ کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک — ہر موئے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

سپاس: شکرگزاری۔ سرور: مسرت، مے نوشی کے بعد کی کیفیت۔ تپ: حرارت، گرمی غم عشق یعنی سوزِ عشق میں اس درجہ سرور و لذت ہے کہ ہم بیان نہیں کرسکتے۔ لذت و سرور کی فراوانی کا اندازہ بآسانی اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ہر موئے بدن زبان بن کر تپِ غم کی شکرگزاری میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ بحالت بخار بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں

۴۔ ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا — ہرچند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

بیگانۂ وفا۔ وفا ناآشنا یعنے بے وفا۔ دلِ حق شناس: حق و باطل میں تمیز کرنے والا دل۔

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں "دلِ حق شناس" سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالےٰ نے اوروں کی طرح معشوق کو بھی دلِ حق شناس عطا فرمایا ہے۔ مگر حسن کا غرور ایسا مسلط ہے کہ معشوق کو دلِ حق شناس کے ایماء پر چلنے نہیں دیتا۔ اس لئے ضمیر کی آواز کو خاطر میں نہ لاکر وہ بیگانۂ وفا ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ ہمارا دلِ حق شناس معشوق کے پاس ہے جو ہر وقت اس کی بیگانگی و بے راہ روی پر اس کو ٹوکتا ہے لیکن غرورِ حسن کی وجہ وہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتا

اور بے وفائی کئے جاتا ہے۔

۵۔ پی جس قدر ملی شبِ مہتاب میں شراب — اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

راس ہے، موافق ہے، مفید ہے۔

شراب مزاجاً گرم ہوتی ہے اور بلغمی مزاج برودت کا نتیجہ ہے اور پھر رات کے وقت بلغمی آدمی کو تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ چاندنی رات میں جس قدر بھی شراب مل جائے میں پی جاتا ہوں تاکہ اس حار دوا سے بلغم کا ازالہ ہوجائے یعنی شبِ مہتاب میں شراب نوشی نشاط کی خاطر نہیں ہے بلکہ دوا کے طور پر۔

۶۔ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

شرف، عزت، بزرگی۔ فرماتے ہیں کہ جنگل کی سنسانی و ویرانی کا باعث مجنوں کی موت ہے۔ جنگل اس کا مسکن تھا، جبتک وہ زندہ رہا جنگل آباد اور بارونق رہا۔ اس کے مرتے ہی ویران ہوگیا۔ سچ ہے کہ مکیں سے ہی مکان کی عزت و آبرو ہے۔

غزل نمبر (۱۴)

۱۔ اگر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

فرماتے ہیں کہ اگر خاموشی سے مقصود رازداری ہے یعنی لوگ اس لئے خاموشی اختیار کرتے ہیں کہ اپنے حالات کا یا اپنے مافی الضمیر کا کسی کو علم نہ ہونے پائے تو پھر میری گویائی سے بھی یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے اور میرے دل کی بات نہیں پا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو نازک خیالات اور اچھوتے مضامین حسین انوکھے اسلوب میں بیان کرتے ہیں اس کو عوام سمجھ نہیں سکتے۔ عوام کی اس کوتاہ فہمی پر بجائے رنج کے ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انکی کوتاہ فہمی ہمارے حکیمانہ کلام کی رفعت کا ثبوت ہے ہمارا تخیل جن بلندیوں میں پرواز کرتا ہے دوسروں کی وہاں تک رسائی محال ہے۔

۲۔ کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلا — دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

گلہ: شکوہ۔ حسرتِ اظہار: ظاہر کرنے یا بیان کرنے کی آرزو۔ فرد: واحد، تنہا۔ وہ اکہرا کاغذ جس پر جمع و خرچ کا حساب لکھا جاتا ہے۔ فرد جمع و خرچ: وہ کاغذ جس پر حساب لکھا ہوا ہو۔

فرماتے ہیں احباب سے پر ہم اپنا درد و غم ظاہر کرنا چاہتے ہیں لیکن ہماری یہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی اسلئے کہ کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ تجھکو کیا تکلیف ہے۔ جو بھی آتا ہے گونگوں کی طرح خاموش چلا جاتا ہے۔ پھر ہم اپنا دکھ درد کس کو سنائیں اور حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے کریں۔ کوئی پوچھنے والا بھی تو ہو۔ البتہ احباب کی ان بے التفاتیوں کا حساب دل میں ہے۔ گویا دل ایک فرد حساب ہے جس پر ان نہ پوچھنے والی گونگی زبانوں کا جمع و خرچ درج ہے۔

۳۔ کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا — رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

فرماتے ہیں کہ اے خدا تیری رحمت کس پردہ میں محوِ آرائش ہے کہ اب تک جلوہ گر نہیں ہوئی۔ وہ جلوہ گر ہو تو دیکھے گی ہم بزبانِ خاموشی و انفعال اپنے گناہوں کی عذر خواہی کر رہے ہیں اور سوال کئے بغیر اس کے طالب ہیں۔

"آئینہ پرداز" میں شوخی ہے یعنی ہم تو رحمت کے طلبگار و منتظر بیٹھے ہیں مگر رحمت محوِ آرائش ہے اور جلوہ گر ہونے میں دیر کر رہی ہے۔

۴۔ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

شوق: عشق، محبت۔ منفعل: منفعل ہو، نادم ہو۔

اپنے عشق سے خطاب فرماتے ہیں کہ صدہا ناکامیوں اور مایوسیوں کے بعد تو یہ خیال کر رہا ہے کہ معشوق تیرے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔ توبہ توبہ دوست سے اس قسم کی بدگمانی غضب کی بات ہے۔ منفعل ہو توبہ کر اور اس بدگمانی سے باز آ۔

۵۔ مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مشکین لباس: مشک بو غلاف جس کی مہک دور دور تک پھیلی ہو مراد اس سے شہرت کعبۃ اللہ شریف۔ نافِ زمین: وسطِ زمین، ملک عرب اور خصوصاً مکہ معظمہ نافِ زمین مانا جاتا ہے۔

نافِ غزال: نافۂ مُشک جو ملک ختن کے ہرنوں میں پایا جاتا ہے۔ علی کے قدم سے: یہ مشہور ہے کہ جب حضرت علی کی ولادت باسعادت کا وقت قریب آیا تو حضرت کی والدہ ماجدہ بغرض دعا در کعبہ پر حاضر ہوئیں۔ ندائے غیبی آئی کہ اندر آجاؤ۔ بی بی کعبتہ اللہ میں داخل ہوگئیں اور دروازہ خودبخود بند ہوگیا اور تین دن تک بند رہا تیسرے روز جب دروازہ کھُلا تو بی بی حضرت علی کو لئے باہر تشریف لائیں۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت علی کی ولادت کعبتہ اللہ شریف میں ہوئی تھی۔

اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ کعبہ کو جو شرف و بزرگی حاصل ہے اور اس کی شہرت اقصائے عالم میں پھیل گئی ہے اس کا باعث حضرت علی کی ولادت کا واقعہ ہے چونکہ آپ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی اس لئے کعبتہ اللہ کو یہ شرف اور شہرت حاصل ہوئی۔ لوگ مکہ معظمہ کو نافِ زمین کہتے ہیں مگر نافِ زمین میں مہک کہاں۔ یہ نافۂ غزال نہیں کہ اس میں خوشبو ہو لہذا جو خوشبو اس نافِ زمین میں ہے وہ علی کے قدم سے سمجھو۔

۶۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

عرصۂ آفاق: دنیا کا میدان یعنی وسیع دنیا۔ عرقِ انفعال: خجالت و شرمندگی کا پسینہ

فرماتے ہیں کہ یوں تو دنیا بہت وسیع ہے لیکن میری وحشت اور بیابان نوردی کے مقابلے میں اس کی وسعت بھی ناکافی ہوئی اور عرصہ آفاق میری وحشت کے لئے بہت ہی مختصر اور تنگ ثابت ہوا۔ زمین میری وحشت اور شوق صحرا نوردی کو دیکھ کر بایں پہنائی خجالت سے پسینہ میں شرابور ہوگئی اور یہی پسینہ ہے جس کو سمندر کہا جاتا ہے۔

۷۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

ہستی: وجود۔ خیال: دھوکہ، وہم۔ چونکہ دنیا گول ہے اس لئے دنیا کو حلقۂ دام سے تشبیہ دی ہے۔

فرماتے ہیں کہ دنیا وہم اور دھوکے کا جال ہے۔ جو بھی اس عالم امکان کی چیزوں کو دیکھتا ہے سمجھتا ہے کہ یہ سب ہست ہیں اور ان کا وجود خود ان کا اپنا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت سے بعید محض وہم اور دھوکہ ہے۔ سب اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں البتہ عارف دھوکہ نہیں کھاتا۔

دنیا کے وجود کو نہیں مانتا۔ اس کو موہوم سمجھتا ہے اور صرف ایک ہی وجودِ اصلی اس تمام کائنات میں اس کو نظر آتا ہے۔ لہذا اے اسد تم بھی نہیں اس قسم کا دھوکہ نہ کھاتا اور بجز واجب الوجود کے دوسرے کسی وجود کو نہ مانتا۔

غزل نمبر ۱۳

۱۔ تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو	حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

حذر کرو۔ ڈرو، پرہیز کرو۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست آپ کی طرف سے جو جو دکھ پہنچے ہیں ان شکایتوں کی آگ دل میں دبی ہوئی رہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ۔ اس آگ کو اسی طرح پوشیدہ دبی رہنے دیں۔ اگر آپ اس آگ کو کریدیں گے تو اندیشہ ہے کہ شعلے بھڑک اٹھیں اور آپ جھلس جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں صدہا شکایتیں ہیں جن کا اظہار ہمیں منظور نہیں۔ لیکن ان کے بیان کرنے پر آپ اصرار ہی کریں تو نتیجہ برا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہم بھی بھڑک اٹھیں اور دل کی بھڑاس نکالیں۔ اپنی شکایت سن کر آپ کو رنج ہوگا۔ جل بھن جائیں گے دوستی کی جگہ عداوت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہمارے شکوہ و شکایت کے متعلق آپ سوال ہی نہ کریں۔ ہم کو اپنے حال پر خاموش رہنے دیں۔

۲۔ دلا یہ درد و الم بھی مغتنم ہے کہ آخر	نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

الم۔ رنج، غم۔ مغتنم ہے۔ غنیمت ہے۔ گریۂ سحری، عشاق کا پچھلے پہر کا رونا۔ آہ نیم شبی آدھی رات کے وقت آہ و زاری کرنا۔

فرماتے ہیں کہ اے دل اس دردِ غم کو بھی غنیمت سمجھ جس کی وجہ گریۂ سحری اور آہِ نیم شبی حاصل ہے۔ اور یہ گریۂ و آہ آثار زندگی سے ہیں۔ پس زندگی جس حال میں بھی گذرے غنیمت ہے ورنہ مرنے کے بعد نہ تو درد الم باقی رہے گا اور نہ گریہ و آہ۔

بالکل اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرماتے ہیں۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے	بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

غزل نمبر ۱۴

۱۔ ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار ۔ وہ آلہ جس سے غلط حرف و الفاظ مٹائے یا چھیلے جائیں مثلاً ربڑ، چاقو وغیرہ وہ کاغذ جس سے حروف بآسانی حک کئے جا سکیں۔

"غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے" (ازیادگار غالب)

۲۔ جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے

یعنی آتش عشق سینے میں دہک رہی ہے جس کے اثر سے نفس آتش بار ہے یا وصف اس حرارت کے افسوس ہے ہم جل کر خاکستر اور فنا نہیں ہو گئے اور ہمارا شوق فنا ناتمام رہ گیا۔ پھر ہم کو اس پر رنج و افسوس کیوں نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ فنا فی اللہ ہنوز کا نج ہے

۳۔ آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا ہر کوئی درماندگی میں نالے سے لاچار ہے

درماندگی ۔ مصیبت ۔ نالہ سے لاچار ہے ۔ آہ و فغاں کرنے پر مجبور ہے۔

فرماتے ہیں کہ آگ جب پانی میں بجھتی ہے خود بخود طبعاً اس میں سے آواز اٹھتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب مصیبت اس پر پڑتی ہے اور بجھنے لگتا ہے تو فطرۃً نالہ و زاری کرنے پر مجبور ہے اگر وہ روکنا بھی چاہے تو نالہ نہیں رک سکتا۔

۴۔ ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ جسکے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے

ہر ذرہ ۔ ہر مخلوق ۔ عذر خواہ ۔ معافی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا۔

"اس شعر میں دعوے ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے
مطلب یہ ہے کہ ذراتِ عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں انکی بدمستی و غفلت
کا عذر خواہ وہی ہے جسکے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں (از یادگارِ غالب)

۵- مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست آپ مجھ کو میرا قول ان الفاظ میں یاد دلایا کرتے تھے۔
"تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی" آیندہ یہ الفاظ اپنی زبان پر نہ لائیے۔ اس لئے کہ اب میرا دل
زندگی سے بیزار ہو گیا ہے اب بھی آپ میرا قول دہرائیں تو خدانخواستہ آپ سے بیزاری کا مرادف
ہوگا۔ میں اپنی جان سے بیزار ہوں۔ تم سے بیزاری کی کیا مجال اس کا تصور بھی تو نہیں آسکتا

۶- آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست ہم کو اس کا یقین ہے کہ آپ ہمارا خط کھول کر پڑھتے تو نہیں
پھر بغیر کھولے خط کے مضمون سے آگاہی کس طرح ہو۔ اس لئے ہم نے یہ تدبیر کی ہے کہ لفافہ
پر ہی آنکھ کی تصویر کھینچ دی تاکہ بغیر خط کھولے اور پڑھے آپ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ہماری
آنکھ آپکے دیدار کی آرزو رکھتی ہے گویا سرنامہ کو دیکھنے سے خط کا مضمون آپ پر کھل جائیگا۔

غزل نمبر ۱۵

اپینس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

پینس = پالکی، ڈولی ——— فرماتے ہیں کہ مجھ سے اس درجہ نفرت ہے اگر کسی وقت
اتفاقاً ان کی سواری میری گلی سے گذرتی ہے تو کہاروں کو کندھا بھی بدلنے نہیں دیتے گویا
کندھا بدلنے میں جو توقف ہوتا ہے اتنی دیر بھی میری گلی میں سواری کا رکنا انھیں منظور نہیں۔

غزل نمبر ۱۶

۱- میری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

فرماتے ہیں کہ میری ہستی تمناؤں کا حیرت کدہ بنی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تک جبکہ

حیرانی کا یہ عالم نہیں تھا آہ و نالہ کیا کرتے تھے۔ اب تحیر کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ نالہ بھی نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی آرزوئیں خاک میں مل گئی ہیں کہ اب رونے کی آرزو بھی باقی نہیں رہی۔

۲۔ خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

یعنی ایسے طائر کے لئے جو قفس میں بند ہو اور جس کے بال و پر نوچے گئے ہوں۔ بہار و خزاں اور دوسرے سب موسم یکساں ہیں۔ کسی وقت اس کو غم سے نجات نہیں۔ ہر وقت قید و بند کا رنج اور بے بال و پری کا ماتم ہے۔ ایسی صورت میں بہار کیا اور خزاں کیسی دونوں برابر ہیں۔

۳۔ وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

حزیں = غمگین ــــ فرماتے ہیں کہ اے رفیق معشوقوں سے کبھی کبھار جو اظہار وفا ہو جاتا ہے وہ ایک اتفاقی امر ہے یہ نہ سمجھنا کہ عاشقوں کے غمگین دلوں سے جو فریاد نکلتی ہے اس کا اثر ہے اس لئے کہ فریاد میں اثر ہوتا ہی نہیں۔

۴۔ نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

شوخی = چالاکی، طراری ــــ فرماتے ہیں کہ ہماری آرزو بر نہ آئی اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ مایوسی ہو گئی۔ بحالت مایوسی رنج و غم سے ہم کفِ افسوس ملنے لگے۔ لیکن ہمارا تخیل بڑا چالاک و طرار نکلا وہ مایوسی کی تکلیف برداشت نہ کر سکا اور از سر نو تمنا کی ایک صورت پیدا کر دی یعنی کفِ افسوس ملنے کو عہد تجدید تمنا قرار دیدیا۔ اس طرح جو مایوسی ہو گئی تھی وہ پھر امید سے بدل گئی۔

غزل نمبر ۱۷

۱۔ رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

بود = ہستی، حیثیت۔ چراغ کشتہ = بجھا ہوا چراغ۔ نبض دودی = نہایت کمزور نبض، عالم نزع کی نبض۔ بیمار وفا = عاشق۔

فرماتے ہیں کہ اگر تو نے اس سے پہلے رحم نہ کیا مضائقہ نہیں۔ لیکن اب ہم قریب المرگ ہیں اور ہماری نبض اس درجہ دھیمی اور غیر محسوس ہے جیسے بجھے ہوئے چراغ کا دھواں غیر محسوس ہوتا ہے۔ کم از کم اس نوبت پر تو رحم کر یعنی تیرا عاشق اب تھوڑی دیر کا مہمان ہے اس کی ہستی چراغ کشتہ سے کچھ زیادہ نہیں۔ اس حالت میں ستانے سے کیا حاصل۔

۲۔ دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ‍ ‍ ‍ ‍ ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

دل لگی، محبت، عشق۔ سود، فائدہ۔

یعنی شمع جب تک جلتی رہتی ہے بارونق رہتی ہے۔ بجھنے کے بعد بے رونق ہو جاتی ہے۔ اور آرام اس کو حاصل ہوتا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرماتے ہیں کہ ہمارا فائدہ تو اسی میں تھا کہ دل آتش عشق سے فروزاں نہ ہوتا گو اس میں کچھ تاریکی و بے رونقی ضرور تھی مگر آرام و سکون تو حاصل ہوتا۔ لیکن کمبخت دل کب نچلا بیٹھنے دے اس کو تو عشق و محبت کا لپکا ہے بے چین کئے جاتا ہے۔ اور ہمارا جلنا دور نہیں ہوتا۔

غزل نمبر ۱۸

۱۔ چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ‍ ‍ ‍ ‍ سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

نوا، آواز، شبد۔ نوا پرداز ہے، باتیں کر رہی ہے۔ شعلۂ، زبان آتش۔ تو کہوے، گویا۔

چشم، آنکھ۔ دیکھنے کے علاوہ غم و غصہ اور محبت کا اظہار، مطالب کی ادائی آنکھوں سے بھی ہوتی ہے گویا آنکھ زبان کا کام بھی دیتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے "آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنا"

اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ معشوق تو خاموش ہے لیکن اس کی آنکھیں باتیں کر رہی ہیں۔ آنکھوں سے خفگی اور غصہ کا اظہار ہو رہا ہے۔ آتش غضب کے شعلے نکل رہے ہیں چونکہ شعلہ زبان سے مشابہ ہوتا ہے اور آواز زبان سے نکلتی ہے اس لئے چشم خوباں کی آواز شعلہ غضب ٹھیری۔ پھر شعلہ کے ساتھ دھواں لازمی ہے۔ چنانچہ چشم خوباں کا کاجل اسی شعلہ کا دھواں ہے۔

" مطلب صرف اس قدر ہے کہ دوست بحالتِ خفگی بات نہیں کرتا البتہ آنکھوں سے اظہار برہمی کر رہا ہے۔"

۲۔ پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے — نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

پیکر: جسم۔ ساز: باجا۔ طالعِ ناساز: بختِ خفتہ، طالعِ خوابیدہ، نحس طالع۔

طالع: کسی کی پیدائش کے وقت سیارہ کا مقام یا برج، نجومیوں کے ہاں بارہ برج یا طالع ہیں۔ ان میں سے بعض سعد ہیں اور بعض نحس۔ اگر نحس طالع میں کسی کی پیدائش ہو تو وہ مولود بدبخت ہوگا + عشاق: شاعری میں عشاق کی بدنصیبی ایک کلیہ ہے۔ گویا جملہ عشاق طالعِ ناساز میں پیدا ہوتے ہیں + گردشِ سیارہ: سیارہ کی چکر، سیارہ کا گھومنا، بدنصیبی۔

ان مبادی اور لفظی رعایات کو ذہن نشین کرنے کے بعد شعر کا یہ مطلب ہوگا کہ عاشقوں کا پیکر بدنصیبی کا باجا ہے۔ اسی لئے اس باجہ میں سے ہمیشہ آہ وزاری کی آواز نکلتی رہتی ہے۔ گویا یہ آواز ستاروں کی گردش کا نتیجہ ہے، + حاصل یہ ہے کہ عشاق پیدائشی بدقسمت ہوتے ہیں اور نالہ وزاری ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

۳۔ دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا — یک بیابان جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ: قدرت۔ دیدۂ خون بار: خون برسانے والی آنکھ۔ یک بیابان جلوۂ گل: بیابان بھر پھولوں کا جلوہ، کثرتِ گل۔ پا انداز: وہ فرش جو دروازوں پر بچھا جاتا ہے تاکہ اس سے پاؤں کی گرد صاف کر کے گھر میں داخل ہوں۔

فرماتے ہیں کہ دیدۂ خونبار کی وجہ مجنون کو جو دستگاہ اور شان وشوکت حاصل ہے وہ قابلِ دید ہے اس کے دیدۂ خونبار نے بیابان کے چپہ چپہ کو گلزار بنا دیا ہے۔ جدھر دیکھئے جلوۂ گل نظر آتا ہے اور یہ گل اس کا فرشِ پا انداز ہے جن کو وہ روندتا پھرتا ہے اتنا بڑا! اور خوشنما فرشِ پا انداز بادشاہوں کو بھی میسر نہیں اس لئے مجنوں کی دستگاہ و قدرت بادشاہوں وشہنشاہوں سے بھی زیادہ اور دیکھنے کے قابل ہے۔

غزل نمبر ۱۹

۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

سہی ۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اصل میں صحیح تھا۔ کئی موقعوں پر بولا جاتا ہے مگر صرف اہل زبان ہی بول اور سمجھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اگر بولے گا تو فوراً خطا کھا ئے گا۔ لہذا ہم چند مشہور قریب الفہم موقع زیادہ تر حضرت غالب کی غزل سے بتا کر آگے چلتے ہیں" اس تمہید کے بعد مصنف نے حضرت غالب کی اسی غزل کے اشعار نظیراً پیش کئے ہیں۔ اور حضرت غالب نے جن جن معنوں میں اس لفظ کو باندھا ہے۔ صاحب فرہنگ نے ان موقعوں کو درج لغت کیا ہے۔ ہم بھی وہی نقل کئے دیتے ہیں۔ (۱) تاکید کلام کے واسطے "مانو، جانو، خیال کرو۔ مندرجہ بالا شعر میں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے دوست تو میری دیوانگی کا باعث اگر عشق کو نہیں مانتا اور صرف جنون ہی جنون خیال کرتا ہے تو اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے یعنی خواہ وہ عشق ہو یا جنون مگر عوام میں تو یہی شہرت ہے کہ میں تیرے حسن کا دیوانہ ہوں۔ پس میری وحشت کو کم از کم تو اپنی شہرت کا باعث تو مان۔

۲۔ قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۲) سہی ۔ تسلسل کے واسطے۔ جاری رہے، چلے جائے، برقرار رہے۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست اگر آپ ہم سے محبت اور لگاؤ نہیں رکھنا چاہتے نہ رکھئے کم از کم عداوت تو رکھئے تاکہ آپ سے جو تعلق قائم ہو گیا ہے برقرار رہے۔ خواہ وہ تعلق محبت کا ہو یا دشمنی کا۔ ہم تو آپ سے ایک نسبت کے متمنی ہیں۔

۳۔ میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۳) سہی ۔ منظور کرو، قبول کرو ـــ فرماتے ہیں کہ اے دوست تو اپنی بزم میں اگر رسوائی کے ڈر سے مجھ کو نہیں بلاتا ہے مضائقہ نہیں مگر خلوت میں تو رسوائی کا کوئی خوف نہیں

اس لئے مجلس نہ سہی خلوت ہی میں بلانا منظور کر۔

۴۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(۴) سہی = برائے ایجاب۔ قبول، منظور، مانا

طنزاً فرماتے ہیں کہ اے ظالم اگر تجھ کو یقین ہو چکا ہے کہ رقیب تیرا سچا عاشق ہے اور وہ تجھ کو دل سے چاہتا ہے۔ اسی بنا پر تو اس پر مائل اور ہم سے بیزار ہے تو ہم بھی اسکو مان لیتے ہیں لیکن اس بات کا تو خیال کر کہ ہماری خستہ حالی کس بات کا نتیجہ ہے۔ بجز تیری محبت کے ہماری بربادی و تباہ حالی کی کیا دوسری وجہہ ہو سکتی ہے۔ کیا ہم اپنے دشمن ہیں کہ بلا سبب خود کو اس حالت میں پہنچا دیں۔ تو اگر ذرا بھی غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری خستگی تیری ہی محبت کا نتیجہ ہے۔

۵۔ اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

(۵) سہی = تسلی خاطر یا من سمجھوتی کے واسطے۔ یہی سمجھیں گے یوں ہی جانیں گے (فرہنگ آصفیہ)

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس شعر میں سہی لزوم کے معنی دیتا ہے یعنی دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہو۔ لازماً ہو۔

فرماتے ہیں کہ خواہ آگاہی ہو خواہ غفلت اپنی ہستی ہی سے کسی اور سے نہیں۔ اپنی ہستی سے آگاہی کا بھی وہی نتیجہ ہے جو غفلت کا ہے یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پایا۔ اور جس نے اپنے آپ کو کھویا اس نے بھی خدا کو پایا۔

اس شعر میں بڑا لطف یہ ہے کہ بالکل متضاد حالتوں یعنی آگہی و غفلت کا حاصل ایک ہی ہے۔ یہ شعر حضرت غالبؔ ہی کا حصہ ہے۔ کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۶۔ عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

(۵) سہی = تسلی خاطر یا من سمجھوتی کے واسطے، یہی سمجھیں گے، یوں ہی جانیں گے (فرہنگ آصفیہ)

مگر ہمارے خیال میں سہی اس شعر میں غنیمت ہے کے معنی دے رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عمر کا وقفہ بہت ہی مختصر سا ہے۔ برق جس تیزی سے گذر جاتی ہے عمر بھی اسی سرعت سے گزرتی ہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں دنیا کے دوسرے بڑے کام انجام نہیں پا سکتے اور نہ ہی کسی مقصد میں کامیابی و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان کے لئے کافی مہلت درکار ہے۔ البتہ دل کے خون کرنے کے لئے کم سے کم وقت کی ضرورت ہے۔ اس مختصر زندگی میں اتنی فرصت تو مل جاتی ہے بس یہی غنیمت ہے۔ حاصل شعر یہ کہ زندگی میں کامرانی و شادمانی تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ چلو دل کے خون کرنے کی فرصت ہی غنیمت سمجھو۔

۷۔ ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں   نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

(۵) یہی سمجھیں گے ۔ فرماتے ہیں کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو عشق و وفا کی مصیبتوں سے گھبرا کر وفا ترک کر دیتے ہیں محبت اور وفا کی راہ میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ آجائے اس ڈگر سے ہمارا قدم نہ ڈگے۔ اگر کوئی ناصح ہم کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ عشق ایک عذاب ہے تو ہم اس ناصح مشفق کو یہی جواب دیں گے کہ عشق نہ سہی مصیبت و بلا سمجھ کر اس بلا کو مول لیں گے۔

۸۔ کچھ تو دے اے فلک نا انصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

(۶) سہی : تاکید کے واسطے حرف تاکید کے لئے۔

فرماتے ہیں کہ اے ظالم و ناانصاف آسمان تجھ سے بھلائی کی توقع قطعاً نہیں۔ تیرا پیشہ ظلم ہے اور تو برابر ظلم کئے جا رہا ہے اس کا بھی ہم کو شکوہ نہیں۔ تو شوق سے ظلم کئے جا مگر ظلم کے ساتھ سخت ناانصافی یہ ہو رہی ہے کہ ہم کو آہ و فریاد کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ مارے اور رونے نہ دے۔ خیر کچھ نہ دیا نہ دے۔ آہ و فریاد کی اجازت تو دے تاکہ رو دھو کر دل تو ہلکا کریں۔

۹۔ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

(۵) سہی : یوں ہی جانیں گے، یہی سمجھیں گے۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست جب دیکھئے آپ سے شان بے نیازی ظاہر ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ بے نیازی آپ کی عادت ہے۔ اب ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ تسلیم و رضا کی عادت ڈالیں۔ آپ کی ذات بے نیاز اور ہمارا کام رضا جوئی۔ کوئی گلہ نہ شکوہ۔

اس شعر کو حقیقت اور مجاز دونوں پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۷) سہی = مغتنم ہے، غنیمت ہے، بہتر ہے۔ حسرت = تمنا، آرزو۔ چھیڑ = ہنسی، ٹھٹھا، دل لگی

فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ وصل یار سے مایوس ہو کر خاموش نہ بیٹھئے۔ خاموش بیٹھنا کوئی کام کی بات نہیں کوشش کئے جاؤ، چھیڑ خانی، دل لگی، ہنسی مذاق کی کوئی نہ کوئی تقریب نکال کر چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھو۔ ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی وصل کی کوئی صورت نکل آئے اگر وصل نصیب نہ ہو تو جانے بھی دو۔ وصل کی حسرت ہی غنیمت ہے۔ غرض چھیڑ چھاڑ میں فائدہ کے سوا نقصان نہیں۔ اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ ع

چھیڑ خوبان سے چلی جائے اسدؔ

غزل نمبر ۲۰

اے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — صبح وطن ہے خندۂ دندان نما مجھے

آرمیدگی = آرام طلبی۔ نکوہش = ملامت۔ خندۂ دندان نما = ملامت کی ہنسی۔

فرماتے ہیں کہ عاشق کے لئے بیابان نوردی، غم و اندوہ، رنج و تکلیف مخصوص ہے۔ اگر کوئی عاشق ان حالات میں مبتلا نہ ہو اور پھر بھی عشق کا دم بھرے تو وہ قابل ملامت ہے اس لئے میرا آرام طلبی سے وطن میں پڑا رہنا بجا طور پر قابل ملامت ہے۔ وطن کی ہر صبح طنز و ملامت کی ہنسی سے میرا مضحکہ اڑایا کرتی ہے۔ چاہئے کہ بحالت وحشت گریبان چاک کرتا ہوا کسی صحرا میں نکل جاؤں اور بے سروسامانی اور غریب الوطنی کی صعوبتیں برداشت کروں

نے ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

مغنی۔ گانے والا۔ آتش نفس۔ آتش نوا، جس کے گانے میں سوز و گداز ہو۔ برقِ فنا، پھونک دینے والی برق۔

فرماتے ہیں کہ دل ایسے مغنی آتش نفس کا متلاشی ہے۔ جس کی شعلہ نوائی میرے وجود کو اس طرح پھونک دے جس طرح برق خرمن کو فنا کر دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مرشد کامل کی تلاش ہے جن تعلیم و تفہیم کے اثر سے میری خودی جاتی رہے اور میں خدا کو پالوں۔

۳۔ مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدعا مجھے

مستانہ۔ مستی کی حالت میں وادیٔ خیال۔ دشتِ جنون۔ بازگشت۔ لوٹ آنا۔

فرماتے ہیں کہ میں وادیٔ عشق و جنون کا راستہ بحالت مستی و بے خودی طے کر رہا ہوں تاکہ اس وادی میں پہنچنے کے بعد وہیں کا ہو رہوں۔ پھر اس وادی سے واپسی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ اگر بحالت ہوش و حواس اس راستہ کو طے کرتا تو راستہ نظر میں رہتا۔ واپسی کا امکان تھا۔ استاد نے اس شعر میں اپنی مئی نوشی کی ایک شاعرانہ وجہ جواز پیدا کی ہے۔

۴۔ کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

بے حجابی۔ بے حیائی۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق غیروں کے ساتھ باغ میں جا کر خوب رنگ رلیاں اور بے حجابیاں کرتا ہے۔ باغ کے اندر یہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے دیکھنے سے تو کیا، خیال اور تصور ہی سے ہم کو شرم آتی ہے۔ جہاں کسی نے باغ کا ذکر کیا اور ہمکو معشوق کی بے حجابیاں یاد آ گئیں۔ ہم نے شرم سے سر نیچا کر لیا۔ یا پھولوں کی خوشبو آئی باغ کے جملہ واقعات تصور میں آ گئے اور نکہت گل سے ہم کو شرم آنے لگی۔ غرض اس شوخ کی بے حجابیاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ اس کے خیال سے ہم کو شرم آنے لگی۔ تو باغ میں رنگ رلیاں اور بے حجابیاں کرتا ہے اور نکہت گل ان واقعات کی تشہیر کرتی ہے اس لیے مجھکو اس سے شرم آتی ہے۔

۵۔ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کھلنا۔ معلوم ہونا۔ معاملہ۔ حال

فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ابتداء سے عشق و محبت کی آگ تھی مگر چھپی ہوئی کسی کو اس کی خبر نہ تھی کہ میں عاشق مزاج ہوں لیکن اشعار کے انتخاب نے راز فاش کر دیا اور چھپا ہوا عشق سب پر ظاہر ہو گیا میں نے جتنے شعر چنے وہ عشقیہ تھے یا اپنے اشعار کے لئے جس مضمون کا انتخاب کیا وہ عشق تھا۔ میری آتش نوائی سے کاغذ جل اٹھا اور دل کا حال سب پر آشکارا ہو گیا۔ یا ـــ یہ کہ اصل دیوان تمام ادق اشعار سے بھرا ہوا تھا جس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے احباب کے اصرار اور مشورہ سے موجودہ اشعار کا انتخاب کیا گیا جو عام فہم تھے۔ اس لئے فرماتے ہیں اس انتخاب نے مجھے رسوا کیا اور جو کمالات میں نے ان مشکل اشعار میں رکھا تھا وہ ظاہر نہ ہو سکا۔

غزل نمبر ۲۱

۱۔ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

اس رنگ سے ۔ اس بے سروسامانی اور پریشانی سے

حضرت غالبؔ نے اپنے رقعات اُردوئے معلیٰ و عود ہندی میں اس شعر کو باربار دہرایا ہے۔ اس سے ان کی تکالیف و پریشانیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ ہماری زندگی اس بے سروسامانی اور پریشانیوں ہی میں اگر گذر جائے تو ہم کیا یاد کریں گے کہ ہمارا بھی خدا تھا۔ اس شعر میں تھوڑی سی شوخی اور کچھ شکوہ ہے۔ یعنے خدا نے جو دانا بینا، علیم و خبیر ہے اپنے لاچار و مصیبت زدہ بندے کی خبر نہ لی۔

غزل نمبر ۲۲

۱۔ اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بنا، ممکن ہونا + فرماتے ہیں کہ معشوق کی بزم میں بے حیائی اور بے غیرتی کے بغیر چارہ نہیں۔ میں بزم میں بیٹھا ہوا ہوں اور میری موجودگی میں ان کے اشارے غیروں سے

جاری ہیں۔ ان کو روکنے کا مقدور نہیں۔ اگر غیرت کو کام میں لاؤں تو بزم سے اٹھ جانا پڑتا ہے مگر دل نہیں مانتا۔ دل چاہتا ہے کہ بیٹھا رہوں۔ لہٰذا ان کی بزم میں غیرت و حیا ممکن نہیں۔ بے حیائی کا جامہ پہنے چپ سادھے بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔

۲۔ دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا　　میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

سیاست ۔ ڈانٹ ڈپٹ، قہر و غضب، سخت گیری۔ صدا کرنا ۔ درویشوں اور فقیروں کی طرح سوال کرنا۔

فرماتے ہیں کہ دل ایک بہت نازک چیز ہے اور پھر عاشق کا دل اور بھی کمزور ہوتا ہے اس لئے دربان کی سخت گیری اور ڈانٹ ڈپٹ سے ڈر گیا ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں آپ کے در تک آؤں اور بغیر حسن کی بھیک مانگے چلا جاؤں۔ اس شعر میں ایک معاملہ باندھا گیا ہے یعنی کچھ وقفہ کے بعد عاشق کو معشوق کی ڈیوڑھی پر صدا لگانے کا موقع مل گیا۔ معشوق ان سے چند روز نہ آنے اور سوال نہ کرنے کا سبب پوچھ رہا ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میں تو روز ہی آیا کرتا ہوں مگر دربان دھمکا کر صدا کرنے نہیں دیتا اور آگے بڑھا دیتا ہے جیسا کہ عام طور پر بھک منگوں کو دھتکار دیا جاتا ہے۔ اگر دربان کی داروگیر نہ ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آپ کی ڈیوڑھی پر آؤں اور بھیک نہ مانگوں۔ ہم اوروں کی طرح ایسے شوخ چشم بے حیا فقیر تو نہیں کہ دربان کی بری بھلی سنیں اور پھر بھی صدا لگائیں۔

۳۔ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے　　مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

خرقہ ۔ پیوند لگا ہوا پرانا جامہ، فقیروں کا لباس۔ سجادہ ۔ جائے نماز۔ آب و ہوا ۔ مراد موسم بہار

مطلب یہ ہے کہ سجادہ و خرقہ علامت ہے درویشی و زہد و تقویٰ کی ان دو چیزوں کو شراب نوشی سے کوئی پیوند نہیں۔ اب جب کہ موسم بہار آگیا ہے۔ اس کی خاطر و مدارات کے لئے محفل شراب گرم کرنی ضروری ہے۔ اور یوں بھی یہ مہمان عزیز (یعنی فصل بہار) ایک عرصہ کے بعد آیا ہے اس لئے اہتمام خاص چاہیئے۔ خرقہ و سجادہ رہن کرنے سے دونوں

مقصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایک تو زہد و تقویٰ کی مزاحمت جو مانع مئے نوشی ہے۔ دور ہو جائے گی۔ اور سنئے نوشی سے مناسبت پیدا ہوگی۔ دوسرے شراب خریدنے کو زر بھی ہاتھ آئیگا۔

۴۔ بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

بے صرفہ = بے فائدہ + حضرت = حضرت خضر علیہ السلام + کل = روز قیامت۔

فرماتے ہیں کہ انسان کی عمر خواہ کتنی ہی دراز ہو بیکار اور بیفائدہ گزر جاتی ہے۔ نتیجہ موت ہے اور خالی ہاتھ دنیا سے کوچ ۔ یہہ صرف ہمارا خیال نہیں ہے۔ قیامت کے دن دیکھ لینا کہ حضرت خضر بھی اپنی درازیٔ عمر پر افسوس فرمائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے دنیا میں کوئی کام انجام نہیں دیا۔ ساری عمر بے فائدہ ہی گزر گئی۔

۵۔ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

مقدور = قدرت، اختیار + لئیم = کنجوس، کمینہ + گنج ہائے گرانمایہ = قیمتی خزانے مراد حکما، عقلا، صاحبانِ کمال جو زیر زمین ہو چکے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ ہزاروں اہل ہنر جو حقیقت میں علم و حکمت کے قیمتی خزانے تھے زمین میں دفن ہیں۔ یہ کمبخت لئیم ان خزانوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ نہ خود ان سے فائدہ اٹھائے نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دے۔ اگر مجھکو یہ قدرت حاصل ہو جائے کہ ان خزانوں کا حساب اس لئیم سے لوں تو پھر اس سے پوچھوں گا کہ یہ سب گنج ہائے گران مایہ تو نے کیا کئے اور کہاں چھپائے رکھے ہیں۔

۶۔ کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

تہمت تراشنا = جھوٹے الزام لگانا، بہتان باندھنا + آرے چلنا = رنج و مصیبت اٹھانا۔

فرماتے ہیں کہ دشمن یعنی رقیب روزانہ ہم پر نئی نئی تہمتیں باندھا کرتے ہیں اور معشوق کو ہمارے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ معشوق ان پر بھروسہ کر کے ہر روز نت نئے ستم کیا کرتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ ہم کو ذلت و خواری اور رنج و مصیبت نہ اٹھانی

پڑتی ہو۔

۷۔ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

فرماتے ہیں کہ معشوق اس سے پہلے تک بڑا ہی باحیا اور خود دار تھا۔ التجا کرنے پر بھی بوسہ دینا مشکل تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ بغیر مانگے بوسہ دینے لگا ہے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ رقیب کی بری صحبت میں یہ بے حجابی پیدا ہو گئی ہے۔

۸۔ ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں   بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

فرماتے ہیں۔ معشوق فطرۃً بہت اچھا ہے۔ مگر ضد اور ہٹ جو تقاضائے سن ہے ایک جدا بات ہے۔ جب ضد پر آجاتا ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتا بہت ستاتا ہے۔ لیکن اس کا ستانا بدفطرتی کا نہیں ضد کا ستانا ہے۔ اس کی نیک خوئی کا یہ ثبوت ہے کہ ضد اور ہٹ کو بھول جاتا ہے تو سادگی کی حالت میں سینکڑوں وعدے وفا کئے ہیں۔

۹۔ غالبؔ تمہیں کہو کہ ملیگا جواب کیا   مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

فرماتے ہیں کہ اے غالب ہم نے یہ فرض کر لیا کہ تمہاری رسائی معشوق تک ہو گئی اور تم نے اپنا مدعائے دلی ان سے کہدیا اور ہم نے یہ بھی مان لیا کہ جو کچھ تم نے کہا انھوں نے توجہ سے سنا۔ مگر اس کد و کاوش کا آخر نتیجہ کیا؟ اس سے پہلے سو دفعہ آزما چکے ہر وقت ناکامی اور مایوسی ہوئی اب تمہیں بتاؤ کہ کیا جواب ملیگا؟ اس بیوفا سے مہر و وفا کی توقع فضول ہے۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔

غزل نمبر ۲۳

۱۔ رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے   اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

رفتارِ عمر = عمر کا گذرنا۔ قطع رہ اضطراب = بحالتِ اضطراب و پریشانی حکمتہ تیزی سے راستہ طے کرنا یعنی انسان بحالت اطمینان و سکون آہستہ روی سے راستہ طے کرتا ہے اور بحالتِ اضطراب و پریشانی انتہائی سرعت سے گزر جاتا ہے۔ عمر کے گزرنے کو رہ اضطراب کے

قطع کرنے سے تشبیہ کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو سرعت دوسرے پریشانی۔ انسان کی عمر سرعت سے کٹتی ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے ہر حال میں مضطرب و پریشان رہتا ہے نہایت بدیع اور انوکھی تشبیہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مصرعہ میں سرعت رفتار کی توضیح کی گئی ہے۔ رفتار کا اندازہ وقت سے کیا جاتا ہے مثلاً فی ثانیہ اتنے میل کی رفتار یا فلاں فاصلہ اس مدت میں طے ہوگا۔ اور وقت آفتاب کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ آفتاب جب بارہ برج طے کرے اور پورے بارہ مہینے گزریں تب کہیں چل کر ایک سال ہو۔ عمر کی تیز رفتاری کے لئے وقت کا یہ پیمانہ موزوں نہیں۔ آفتاب کی گردش کی بجائے بجلی کی چمک کا پیمانہ مناسب ہے۔ یعنی بجلی جتنی دیر میں چمکے ایک سال۔ بس اسی حساب سے عمر گزر رہی ہے۔

۲۔ مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار مے   بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

بالِ تدرو = کنایہ ابر + مطلب یہ ہے کہ عام طور پر موسم بہار کے اجزا ابر، باغ، نہر وغیرہ لوازمات مے نوشی سے سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی مے نوشی کا لطف تو جب ہی ہے کہ موسم بہار کا ہو، ابر چھایا ہوا ہو، باغ ہو، سرو ہو، نہر کا کنارہ ہو، وغیرہ مگر شاعر کہتا ہے کہ ہم کو ان میں سے کسی کی ضرورت نہیں۔ صرف شراب مل جائے تو بس ہے۔ جملہ لوازمات کا لطف مینائے شراب میں موجود ہے۔ موجِ مے کا جلوہ وہی نظارہ پیدا کرتا ہے جو کہ ابر میں ہے۔ اور مینائے شراب میں باغ بھی ہے بہار بھی ہے شیشۂ سرو نما سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ تو باغ ہے اور شراب نشاطِ بہار ہے۔ غرض یہ کہ شراب کی بوتل میں جملہ سامان نشاط موجود ہیں۔ اس شعر میں سرو سے باغ کا استعارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا   نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

پاشنہ = ایڑی، عقب۔ پائے ثبات = استقلال۔ گوں = فرصت، موقع۔ اقامت = ٹھہرنا، رہنا

مطلب یہ ہے کہ انسان اسی وقت کسی کام میں مستقل مزاجی سے منہمک ہوسکتا ہے یا کسی خیال وارادہ پر قائم رہ سکتا ہے جب کہ اس کا قلب مطمئن ہو۔ جہاں پریشانیوں نے گھیرا اطمینان جاتا رہا اور پائے ثبات کو لغزش ہوئی۔ لہذا فرماتے ہیں کہ ایک عرصے تک مردانہ وار ہم مستقل مزاجی سے پریشانیوں کا مقابلہ کرتے رہے آخر کار افکار وحوادث نے ہمارے پائے استقلال کی ایڑی کو زخمی کر دیا۔ اس لئے ان دشمنوں یعنی افکار وحوادث سے جان بچا کر بھاگنے کا موقع ہے اور نہ کھڑے ہوئے جم کر ان کا مقابلہ کرنے کی تاب۔ شعر میں صرف پاشنہ کا زخمی ہونا بیان کیا ہے۔ پورا پاؤں زخمی نہیں ہوا اگر پورا پاؤں زخمی ہو جاتا تو مجبور محض اور مایوس ہو جاتے موجودہ کشمکش بھاگنے اور اقامت کی باقی نہیں رہتی۔ صرف ایڑی زخمی ہوئی ہے۔ پنجہ کا تھوڑا بہت سہارا باقی ہے اس لئے مجبوری ومختاری اور یاس وامید کے بین بین حالت ہے اور یہی کیفیت زیادہ تکلیف دہ ہے۔

۴۔ جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت ... غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جاداد۔ جائیداد، ذریعہ آمدنی۔ غافل۔ ناواقف۔ گیتی۔ دنیا خراب ہے۔ ویران ہے، بُری ہے، نکمی ہے۔

فرماتے ہیں کہ رندوں کی نظر میں شش جہت یعنی دنیا آباد اور قیمتی ہے۔ اس کے ذرہ ذرہ سے ان کو بادہ نوشی کے لئے سرمایہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ناآگاہ دنیا کو ویران بُری اور نکمی سمجھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عارف کو ذرہ ذرہ میں جلوۂ حق نظر آتا ہے اور ہر وقت وہ شراب معرفت سے سرشار رہتا ہے مگر جن لوگوں نے اس بھید کو نہیں پایا ہے وہ دنیا کو خراب کہتے ہیں۔

۵۔ نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا ... جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

حریف۔ مقابل۔ یعنی معشوق حقیقی کا حسن برق کی طرح نظر کو خیرہ کرنے والا ہے اور اس کا نقاب جوشِ بہار ہے۔ گویا جوشِ بہار میں جلوۂ برق پوشیدہ ہے۔ جب

انسان صرف نقاب حسن یعنی جوشِ بہار ہی کو دیکھ کر بیخود اور وارفتہ ہو جاتا ہے تو حسن کو دیکھنے کی تاب کیا لاسکے۔ کیا مجال کہ نظر اس برقِ حسن کی حریف ہو۔

۶۔ میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

اس شعر میں تھوڑی سی شوخی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست تو نے نقاب اٹھا کر اپنا رخ دکھا دیا آنکھ تیرے دیدار سے کامیاب ہو گئی پھر بھی میں نامرادی رہا اور دل کی تسلی نہ ہوئی۔ دل کی تسلی تو اس وقت ہوگی کہ وصل کی دولت مجھے حاصل ہو اور میں بامراد ہو جاؤں۔ ورنہ دل کی بے قراری میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

۷۔ گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

گزرا: ہاتھ دھویا، باز آیا۔ یعنی دوست کا پیغام اگر قاصد لائے تو یقیناً مقامِ مسرت ہے لیکن پیام لانے کے لئے قاصد کو اس کے حضور میں جانا ہوگا۔ پھر دوست سے سوال و جواب کرنا پڑیگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو جو اس کے دیدار کے مستحق اور اس سے بات کرنے کے مشتاق ہیں، محروم ہیں۔ اور قاصد ایک۔ ایرا غیرا ان لذتوں سے لطف اندوز ہو یہ تو ہم سے نہ دیکھا جائیگا لہذا پیغام کی مسرت سے ہم باز آئے اس مسرت سے کہیں زیادہ اس رشک کی تکلیف ہے۔

غزل نمبر ۲۴

۱۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قاعدہ ہے کہ انسان کو جب بڑی دولت خلافِ توقع اچانک مل جائے تو دماغی توازن باقی نہیں رہتا بعض تو خوشی سے مر بھی جاتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ حواس خمسہ کا تعلق دماغ سے ہے جب دماغ متاثر و مختل ہو جائے تو حواس بھی اپنا کام نہیں کرسکتے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ دوست توقع کے خلاف اچانک عاشق کے پاس آگیا اس انتہائی خوشی میں عاشق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دماغی توازن جاتا رہا۔ جملہ حواس کے ساتھ

بینائی بھی مختل ہوگئی ہے نہ اس کو جی بھر کر دیکھ سکتے ہیں اور نہ اظہار مدعا پر قادر۔ اس سے زیادہ اور کیا بدقسمتی ہوگی۔ جس دولت کے ایک عرصہ سے متمنی تھے وہ دولت تو ہاتھ آئی مگر اس سے استفادہ کی قدرت جاتی رہی۔ اصل واقعہ تو یہ ہے۔ مگر شاعر اپنی بدحواسی پر پردہ ڈالنے یا نازاتاً معشوق کو نہ دیکھنے کی شاعرانہ توجیہہ یہ کرتا ہے کہ رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے تو کجا خود میں بھی اس کو دیکھوں۔

۲۔ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اندیشہ = تخیل۔ آبگینہ = شراب کا شیشہ۔ تندیٔ صہبا = شراب کی تلخی و تیزی اس شعر میں حضرت استاد نے اپنے تخیل کو صہبا اور دل کو شیشے سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ شیشے اور دل کی نزاکت و صفائی اور تخیل و شراب کی گرمی بہت واضح ہے۔

فرماتے ہیں کہ اے غالب اگر تیرے تخیل میں اس درجہ گرمی ہے جس کا اظہار تیرے کلام سے ہوتا ہے تو بس دل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ اندیشہ کی گرمی تیرے دل کو پگھلا دے گی اور اس کی مثال یہ ہوگی کہ شراب کی تندی سے شیشہ پگھلا جا رہا ہے۔ اس شعر میں آبگینہ کو آگ سے پگھلانے کی بجائے شراب کی گرمی سے پگھلانے کا یہ مفہوم ہے کہ تخیل میں صرف گرمی ہی گرمی نہیں کیفیت اور نشاط بھی ہے۔

۳۔ غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

فرماتے ہیں کہ رقیب بوالہوس کی دست درازیوں اور گستاخیوں کو معشوق کیسے روکے۔ رقیب کی ناشائستہ حرکات سے اس کو حیا آنے لگتی ہے مگر کچھ کہنے سے اس درجہ شرما جاتا ہے کہ شرم کے مارے اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ رقیب کو بے حیائی سے منع نہیں کر سکتا۔

” یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے۔ اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا در حقیقت

ایک ہی چیز ہے. تو پھر اس کے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے. بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ اگر حیا بھی اس کو آتی ہے۔ یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے اور شرما جائے ہے۔ یعنی غیر سے اس کے ساتھ تکرار کرنے سے" (از یادگار غالب)

۴۔ شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

لت : بری عادت۔ فرماتے ہیں کہ فریاد کرنے کے شوق کو نالہ کھینچنے کی بری عادت پڑی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دم بدم نالہ کھینچتے رہیں۔ نالہ کھینچنے کے لئے دل میں توان کا ہونا ضروری ہے۔ مگر دل اس درجہ کمزور ہو گیا ہے کہ نالہ کھینچنا تو کجا سانس لینے سے بھی اس کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ گھبرا جاتا ہے۔ عجیب کشمکش کی حالت ہے اِدھر شوق خاموش بیٹھنے نہیں دیتا اور اُدھر دل ڈوبا جا رہا ہے۔

۵۔ دور چشمِ بد تری بزم طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

بہ ظاہر معشوق کی بزم طرب کی تعریف ہے مگر حقیقت میں معشوق کی سنگدلی پر طنز کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست تیری بزم طرب عیش ونشاط اور شادمانی سے ایسی معمور ہے کہ غم واندوہ بھی اگر اس بزم میں جائے تو خوشی سے بدل جائے۔ ٹھیک اسی طرح کہ جو چیز کان نمک میں جائے نمک بن جائے چنانچہ میرا نالہ غم تیری بزم میں نغمہ شادی ہو جاتا ہے۔ یعنی میری آہ وزاری سن کر اہل بزم اور زیادہ ہنستے ہیں واہ واہ کیا بزم طرب ہے خدا اس کو نظر بد سے بچائے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے رونے کی آواز سن کر وہ سنگ دل بے وفا اور اس کے ساتھی یعنی میرے رقیب قہقہوں سے میرا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

۶۔ گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

تغافل : بے التفاتی۔ کھوئے جاتے ہیں : بے خود و وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ پا جائے ہے : تاڑ جاتا ہے۔ اس شعر میں ضمیر "وہ" کا مرجع اگر معشوق تصور کریں تو تغافل عاشق سے متعلق ہو گا۔ اور وہ

سے مراد اگر رقیب لیں تو تغافل معشوق سے متعلق ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہم دوست کی محفل میں ایسے انجان بیٹھتے ہیں کہ گویا ہم کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں، ہمارے اس طرز تغافل سے کسی کو ہمارے لگاؤ کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ باوصف اس بناوٹی بے التفاتی کے اس کی محبت میں ایسے وارفتہ اور بے خود ہو جاتے ہیں کہ معشوق ہمارے راز عشق کو پا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ معشوق کا تغافل ہم دونوں کی محبت کی پردہ داری کرتا ہے لیکن اس کی محبت میں میں ایسا دیوانہ اور وارفتہ ہو جاتا ہوں کہ رقیب ہمارے راز عشق سے واقف ہو جاتا ہے۔

۷۔ اسکی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

بزم آرائی: محفل گرم کرنا۔ رنجور: بیمار۔ دل بیٹھنا: دل مرنا، دل افسردہ ہونا۔

نقش بیٹھنا: سکہ بیٹھنا، کام بننا، مراد کے موافق اثر ہونا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کی محفل کے تذکرے اور رقیب کی کامیابیوں کی کیفیت سن سنکر ہمارا ناتوان دل اسی طرح بیٹھ جاتا ہے جسطرح رقیب کا نقش مدعا معشوق کے دل پر بیٹھ رہا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کی محفل میں رقیب کی کامیابی سن کر دل اور بھی رنجیدہ اور افسردہ ہو جاتا ہے۔

۸۔ ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

پری رخ: حسین، پری چہرہ۔ رنگ کھلنا: چہرے پر رنگ زیب دینا، خوبصورت دکھائی دینا رنگ اڑنا: چہرہ فق ہونا، رنگ جاتا رہنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق پری رخ کسی پر عاشق ہو گیا ہے، غم عشق کی وجہ خون میں کمی ہو گئی اور رنگ اڑتا جا رہا ہے، لیکن جیسے جیسے چہرہ کی سرخی کم ہو رہی ہے اس کا چہرہ اور بھی حسین اور دلکش نظر آ رہا ہے۔

۹۔ نقش کو اسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں   کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

کھچنا یا کھنچنا ۔ تننا ، دور رہنا ، کشیدہ ہونا ، اکڑنا ، روٹھنا ۔ نقش ۔ تصویر ۔

فرماتے ہیں کہ جسطرح معشوق عاشقوں پر ناز کرتا ہے ، اس کا نقش مصور پر ناز کرتا ہے

جوں جوں مصور معشوق کی تصویر کاغذ پر کھینچتا ہے تصویر ناز سے اکڑتی اور روٹھتی جاتی ہے

گویا معشوق کی اینٹھن اور رمیدگی کا اثر اس کی تصویر میں بھی آیا ہے

۱۰۔ سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ   پاس مجھ آتش بجان کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

قاعدہ ہے کہ جب کسی پر برا وقت آتا ہے تو اپنے بیگانے سب اس سے کنارہ کرنے لگتے

ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ افکار و حوارث نے سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے ، حالت اس درجہ

ابتر ہو گئی کہ اپنے پرائے سب کنارہ کش ہو گئے حتیٰ کہ میرا سایہ بھی مجھ سے دور بھاگ رہا ہے

جیسا کہ آگ سے دھواں بھاگتا ہے ۔ سچ ہے مصیبت میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے اور پاس آتا

ہے ، استاد اپنے حسن اخلاق سے بھاگنے کا الزام احباب پر عاید نہیں فرماتے ۔ بلکہ خود اپنے سر لیتے

ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ میں آتش بجان ہوں اس لئے کوئی میرے پاس ٹھہر نہیں سکتا ۔ لہٰذا دور بھاگنے

والوں کا کوئی قصور نہیں

غزل نمبر ۲۵

۱۔ گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے   تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

بردِ لیالی ۔ رات کی سردی ۔

فرماتے ہیں کہ شب ہجر نہالی کی تصاویر دیکھ کر معشوق کی یاد نے مجھ کو گرم فریاد کر دیا

چونکہ فریاد نے گرم کر دیا تھا اس لئے شب تاریک کی سردی سے جان بچی ورنہ بردِ لیالی میرا

کام تمام کر دیتی ۔

۲۔ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے میری ہمتِ عالی نے مجھے

نسیہ ۔ ادھار یعنی عالم عقبیٰ ، نقد دنیا ، موجودہ عالم و حقیقت معلوم ۔ کوئی حقیقت نہیں

ہیچ ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرے مقابلے میں دنیا و عقبیٰ دونوں عالم کی قیمت کم ہے۔ اگر کوئی ہر دو عالم دے کر مجھ کو حاصل کرنا چاہئے تو یہ قیمت میرے لایق نہیں۔ اس لیئے میری عالی ہمتی نے مجھ کو مجھ سے خرید لیا ہے۔ تاکہ دو عالم کی حقیر قیمت پر میں نہ بِک جاؤں۔

مطلب یہ ہے کہ جنت و عقبیٰ کا معاملہ تو ادہار ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے وہ یقینی نہیں نقد جو موجود دنیا ہے اسمیں بجز آلام و مصائب کے اور کیا دھرا ہے! اس لیے ہمکو نہ دنیا سے دل بستگی ہے اور نہ عقبیٰ سے۔ اپنی ہمت عالی کی وجہ ہر دو سے بے نیاز ہیں۔

۳۔ کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم — کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

پرستاری وہم، وہم کی پرستش۔ اصنام، جمع صنم بمعنی بت۔ اصنام خیالی، وہم کے پیدا کئے ہوئے بت۔

فرماتے ہیں کہ وجود حقیقی ایک ہے لیکن ہم وہم کی پرستاری کے سبب عالم امکان کی ہر چیز کو ایک علحدہ وجود سمجھ رہے ہیں۔ گویا وحدت کو کثرت تصور کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے ایک حقیقی وجود کے ہم لاکھوں فرضی اور خیالی وجودوں کے قائل ہوگئے۔ یہ خیالی اور وہمی صور و اشکال درحقیقت باطل بت ہیں جن کی پرستش ہمارا وہم کر رہا ہے۔ اس طرح ان باطل خداؤں کے ماننے سے ہم کافر ہوگئے۔ حاصل اس شعر کا بن ہی وحدۃ الوجود ہے۔

۴۔ ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا — عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

فرماتے ہیں کہ جس طرح بے پر و بال بلبل گل کی ہوس سے آزاد ہو جاتا ہے اسی طرح بے سر و سامانی نے مجھ کو دنیا کی محبوب و مرغوب چیزوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اگر کچھ بھی اسباب مہیا ہوتے تو میں ان کے حصول کے لئے جان کھپاتا چونکہ یہ صورت نہیں ہے اسلئے آرام سے ہوں

غزل نمبر ۳۰

۱۔ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

خط نمبر (۱۳۶) موسومہ مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر صفحہ (۱۵۶) عودِ ہندی میں حضرت غالب نے

اس شعر اور اس کے بعد کے دو شعروں کا مطلب حسب ذیل تحریر فرمایا ہے۔ "داغ سامان، مثل انجم انجمن
وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمایش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور
پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ ۱۲۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے
دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے
مقصود شاعر کا یہ ہے وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم
ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ
مخالف راحت اور صورت رنج" یعنی

دعویٰ یہ ہے کہ جو چیز دنیا میں پیدا ہوتی ہے وہ رنج میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ
لالہ جب اگتا ہے داغدار ہوتا ہے۔ داغ علامت رنج کی ہے۔ اس داغ یا رنج کا
باعث کسان کی سعی ہے جو اس نے لالہ اگانے میں صرف کی۔ اگر اس نے مشقت نہ اٹھائی
ہوتی تو نہ لالہ پیدا ہوتا اور نہ اس کے دل میں داغ پڑتا۔

۲۔ غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم ‌ ‌ ‌ باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

کلی جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگ
عافیت معلوم یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام مصرع —
برگ عیشی بگور خویش فرست۔ برگ و سر و برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل حقیقت اگل
باعتبار خموشی و برجا ماندگی۔ پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی۔ وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا
ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشان نصیب ہے" (از عود ہندی)
ہر اعود ہندی میں شخصیت گل لکھا ہے غالباً سہو کتابت ہے۔ حاصل شعر یہ کہ غنچہ بہ
ظاہر خاطر جمع ہے لیکن پھول بننے تک سامان عافیت کا باقی رہنا ممکن نہیں، پھول بنا اور
پریشان ہو گیا۔ یہی حال انسان کے دل کا ہے اس کو بھی اطمینان نصیب نہیں۔

۳۔ ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے ‌ ‌ ‌ داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

"پشتِ دست صورت عجز اور عجز ادرخس بدندان وکاہ بدندان گرفتن بھی اظہار عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ دست زمین پر رکھدی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو" (از عود ہندی)

مطلب یہہ ہے کہ شعلہ اور داغ آگ سے متعلق ہیں پھر بھی آتشِ عشق کی تاب نہیں لا سکتے اور اظہار عجز کرتے ہیں۔ پھر ہم اس رنج کو کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔

غزل نمبر ۲۷

۱۔ اگ رہا ہی در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہی

یعنی وحشت اور جنون کی وجہ گھر چھوڑ کر بیابان میں آوارہ پھر رہے ہیں۔ ادھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گھر ویران اور منہدم ہو گیا۔ در و دیوار پر سبزہ اگنا ویرانی اور بربادی کی علامت ہے۔ طنزاً اس کو بہار کہا ہے۔ حاصل شعر کا صرف یہ ہے کہ جنون کی بدولت ہم کو صحرا نوردی اور گھر کو ویرانی نصیب ہوئی۔

غزل نمبر ۲۸

۱۔ سادگی پر اسکی مرجانے کی حسرت دل میں ہے — بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

سادگی: بھولا پن، الڑپن۔ بس نہیں چلتا: بن نہیں پڑتی، بے اختیار ہیں۔ کف: ہتھیلی مراد ہاتھ

مطلب یہ ہے کہ ہم معشوق کی سادگی پر جان دینا چاہتے ہیں۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ خنجر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے معشوق کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہماری آرزو پوری کرنی نہیں چاہتا۔ پھر کے لفظ سے یہ پایا جاتا ہے کہ اس سے پہلے بھی عاشق نے جان دینے کی آرزو کی تھی اور اس وقت بھی خنجر معشوق ہی کے ہاتھ میں تھا اس لئے خنجر سینے میں گھونپ کر جان دینے کا موقع نہیں ملا۔

۲۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہی

فرماتے ہیں کہ دوست کی باتوں میں ایسا لطف ہے جسکی تعریف ہم نہیں کر سکتے جو وہ کہتا ہے فوراً دل میں اتر جاتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دل کی باتیں وہ بیان کر رہا ہے۔

حضرت حالی نے یادگار غالب میں اس شعر کی خوبی یوں بیان فرمائی ہے :۔

"کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی"

۳۔ گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کس کس برائی سے : طرح طرح کی برائی سے۔ با ایں ہمہ : اس کے باوجود۔ فرماتے ہیں کہ دوست کی مجلس میں طرح طرح سے میری شکایت ہوتی ہے اور سو سو عیب میرے بیان ہوتے ہیں اس کے باوجود میرا ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ اس کو محفل یار تو نصیب ہے اور میں اس دولت سے محروم ہوں۔

۴۔ بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

اس شعر میں انسان کی اس فطرت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی جملہ کوششیں ایک امید پر ہوتی ہیں خواہ وہ امید بر آئے یا نہ آئے۔ جب انسان کسی کام میں مصروف و منہمک ہوتا ہے تو ایک قسم کی لذت و دلچسپی پیدا ہوتی ہے، مایوسی کی صورت میں نہ سعی باقی رہ سکتی ہے اور نہ سعی کی لذت۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ اے ہجوم ناامیدی بس کر ہم کو اس سے زیادہ مایوس نہ ہونے دے۔ ورنہ تیرے ہجوم کی یہی صورت باقی رہے تو ہم ترک سعی کر دیں گے۔ اور لذت سعی سے محروم ہو جائیں گے اس میں شک نہیں کہ ہماری سعی سے ہمکو کچھ ملنا نہیں لاحاصل سعی ہے تاہم لذت تو حاصل ہے جو خاک میں مل جائے گی۔

۵۔ رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

واماندگی : تھکاوٹ۔ فرماتے ہیں کہ تھکاوٹ کو ہمارے قدم سے عشق ہو گیا ہے وہ ایک لمحہ کیلئے قدموں سے جدا نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قدم منزل میں ہے وہ اٹھ نہیں سکتا اس طرح راستہ کی تکلیف سے خود بخود نجات مل جاتی ہے۔ شاعر صرف یہ بتلانا چاہتا ہے کہ سعی بے حاصل کرتے کرتے اس قدر تھک گئے ہیں کہ پھر قدم نہیں اٹھ سکتا۔

۶۔ جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

جلوہ زار : جلوہ گاہ ۔ آب گل : خمیر یہاں مراد معشوق کا وجود معشوق کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ مان لیا کہ ہمارے دل کی آگ آتشِ دوزخ کے مماثل ہے لیکن یہ تو فرمائے کہ شور قیامت کا فتنہ کس کے وجود میں ہے یعنی اے دوست آپ کی ہستی قیامت ہے اور میرا دل دوزخ پہلے قیامت ہے اور اس کا نتیجہ دوزخ ہے ۔

۷ ۔ ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب　　رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

شوریدہ : دیوانہ آشفتہ طلسم : جادو کی وہ عمارت جس میں داخل ہونے کے بعد نکلنے کی کوئی صورت اور راہ نہیں ۔ جادو کی بھول بھلیاں ۔ پیچ و تاب : رنج و غم ۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست غالب کا دل شوریدہ پیچ و تاب کی بھول بھلیاں بن گیا ہے ۔ یعنی جو آرزو اس میں داخل ہوتی ہے وہ پھر نہیں نکلتی اسی طلسمِ رنج و غم میں دفن ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اب اس دلِ شوریدہ میں تیری تمنا ہے ۔ اندیشہ ہے دوسری آرزوؤں کی طرح یہ تمنا بھی دفن ہو کر رہ جائے ۔ اس لئے ہم پر نہ سہی ہمارے دل پر نہ سہی کم از کم اس اپنی تمنا پر رحم کر اور اس پیچ و تاب کا طلسم توڑ دے تاکہ اس کو نکلنے کی راہ ملے اور مشکل سے نجات پائے ۔ مطلب شاعر کا صرف اس قدر ہے کہ "مہربانی فرما کر ہماری آرزو پوری کر" لیکن اس سیدھی سادی بات کو جس رنگینی سے پیش کیا ہے وہ لطف سے خالی نہیں ۔

غزل نمبر ۲۹

۱ ۔ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

دونوں کو رضامند کر گئی : یعنے اگر صرف دل ہی کو چھیدتی تو جگر کو گلہ ہوتا یا صرف جگر کو گھائل کرتی تو دل ناراض ہو جاتا ۔ اب ہر دو خوش ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ یار نے نگاہِ ناز کا ایسا تیر چلایا ہے بیک وقت دل اور جگر دونوں چھد گئے ۔ اب نہ تو دل کا گلہ رہا اور نہ جگر کا دونوں یار سے خوش ہیں

۲ ۔ شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق　　تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

خوشا لذتِ فراق : فراق کی لذت بھی کیا چیز ہے ۔ پردہ داری : چھپانا ۔ طنزاً فرماتے ہیں

فراق میں بڑا مزا ملا ایک تو یہ کہ آہ و فریاد کرتے کرتے سینہ شق ہو گیا دوسرے یہ کہ سینہ شق ہونے کی وجہ زخم جگر چھپائے رکھنے کی جو تکلیف تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ سینہ شق ہوتے ہی سب راز فاش ہو گیا۔ پھر پردہ داری کی کیا ضرورت ہے۔

۴۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر ہو گئی

بادۂ شبانہ: رات کی شراب، مراد عالمِ جوانی کا لطف و سرور۔ سرمستیاں: بدمستیاں: خوابِ سحر: صبح کی میٹھی نیند یہاں مراد پیری کی غفلت۔ فرماتے ہیں کہ جوانی کا لطف پیری میں کہاں۔ جوانی کے مزے اور بدمستیاں جاتی رہیں۔ رات تمام بدمستی اور عیش میں گزرتی۔ صبح آرام کی نیند سویا کرتے تھے۔ اب پیری میں نہ رات کا عیش ہے اور نہ صبح کی نیند کی لذت۔ اس لئے اب جاگو۔ اس سے زیادہ غفلت مناسب نہیں۔

۵۔ اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

فرماتے ہیں کہ جبتک زندہ رہے کوئے یار میں پہنچنے کے لئے بال و پر کی خواہش تھی (بال و پر سے مراد اسبابِ قدرت ہیں) لیکن زندگی میں یہ مراد بر نہ آئی۔ مرنے کے بعد ہماری خاک کوئے یار میں اڑتی پھر رہی ہے۔ یعنی جو آرزو زندگی میں پوری نہ ہوئی تھی مرنے کے بعد نکلی۔ اس لئے اب پر و بال کی خواہش جاتی رہی۔

۵۔ دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

گل کترنا: یہ محاورہ کئی موقعوں پر بولا جاتا ہے ”عجیب و غریب کام کرنا“ غضب ڈھانا، فتنہ برپا کرنا، نقش و نگار کرنا۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی خرام نازسے جو نقشِ پا زمین پر اٹھے ہیں انکا انداز اور ان کی دلفریبی قابلِ دید ہے جو دیکھتا ہے عاشق ہو جاتا ہے۔ معشوق کی چال نے ایک فتنہ برپا کر دیا ہے۔ ہزاروں والہ و شیدا ہو کر تڑپ رہے ہیں۔

۶۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

بوالہوس: لالچی، نفسانی خواہشوں کا بندہ۔ حسن پرستی: عشق۔ شعار کی: اختیار کی، اپنا شعار بنا لیا۔

شیوہ : طرز، روش، طریقہ ۔ اہل نظر : صاحب نظر، سچے عاشق، حقیقت بین، نقاد ۔ فرماتے ہیں کہ ہر بوالہوس حسن پرستی اور محبت کا دم بھرنے لگا ہے ۔ ان لالچی فرومایہ نفس پرستوں کو حسن اور محبت سے کیا تعلق وہ کیا جانیں کہ حسن کیا ہے اور محبت کیا ہے ۔ ان کی اس ہوسناکی کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل نظر جو حسن کے نقاد اور شیوۂ عشق و وفا کے جاننے والے ہیں بے آبرو ہو رہے ہیں ۔ لوگ کیا جانیں کہ عاشقوں میں بوالہوس کون ہیں اور اہل نظر کون اس لئے ان سفلوں کی ذلیل حرکات کو دیکھکر ہر عاشق کو ان ہی پر قیاس کرتے ہیں ۔

۷. نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پہ بکھر گئی

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے حسن کو دیکھکر ہر ایک مست ہو گیا ۔ بحالت مستی و سرشاری انسان کو کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی ۔ اس لئے عاشق بھی تیرے حسن کو پوری طرح نہ دیکھ سکے اور عاشقوں کی مست نگہ تیرے رخ پر منتشر ہو کر نقاب کا کام کر گئی ۔ نظر کا چہرہ پر بکھرنا ایک واقعہ ہے ۔ یعنی نظر رخ کے کسی ایک ہی نقطہ پر تو پڑتی نہیں پورے رخ پر پھیل جاتی ہے ۔ اور پھر بیشمار نظریں تہ بہ تہ رخ پر بکھر جائیں تو نقاب بن جائیں گی ۔

۸. فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

فردا : فردائے قیامت، آنے والا کل ۔ دی : گزرا ہوا کل ۔ تفرقہ : فرق ۔ قیامت گزرنا : سخت رنج ہونا، مصیبت ٹوٹنا، آفت آنا ۔ یعنی جبتک یہ آسمان زمین ہیں زمانۂ ماضی و مستقبل کا تصور ہے ۔ قیامت کے دن زمین آسمان وغیرہ سب فنا ہو جائیں گے اس کے ساتھ فردا و دی کا تفرقہ بھی ختم ہو جائیگا ۔ لہٰذا فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے آپکا جانا ہی قیامت ہے ۔ کل آپ اٹھ کر چلے گئے اور ادھر ہم پر قیامت آگئی ۔ ماضی و حال مستقبل سب برابر ہو گئے ۔ آپکے جانے کے رنج میں نہ ماضی کا خیال ہے نہ مستقبل کی فکر ۔ حضرتِ حالی نے یوں بیان فرمایا ہے ۔

" کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بہ سبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی ۔ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں

مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ بس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دو معنی ہیں۔ نہایت سختی کا زمانہ گزر جانا اور خود قیامت کا آ جانا۔" (از یادگار غالب)

۹۔ مار ا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں — وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

فرماتے ہیں کہ جبتک جوان تھے دل میں عشق و محبت کے ولولے تھے لیکن اب زمانے نے بڈھا کر دیا۔ آدمی کا بڈھا ہونا اور مرنا دونوں برابر ہیں' جوانی گئی' توان گیا' ولولے گئے۔ یک پیری و صد عیب اب کیا رکھا ہے جس پر زندگی کا اطلاق ہو سکے۔

غزل نمبر ۳۰

۱۔ تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تیری صورت مگر ملے

نہ روئیں = شکوہ و شکایت نہ کریں۔ ذوقِ نظر = لطف دید۔ فرماتے ہیں کہ ہماری تسکین قلب تو اے دوست تیرے ساتھ اور تجھ پر منحصر ہے۔ مرنے کے بعد آپ سے جدائی ہو گی اور اس کے ساتھ تسکین قلب بھی رخصت ہو جائیگی۔ اگرچہ خلد میں ہم کو دیگر سامان نشاط کے ساتھ حوران بہشتی بھی ملیں گی۔ لیکن ان حوران خلد سے بھی تسکین نہ ہو گی۔ ہم اپنی تسکین کے لئے یہ تو دعا اور تمنا نہیں کر سکتے کہ نصیب دشمنان آپ بھی ہمارے ساتھ جنت سدھاریں البتہ ایک تمنا ہماری یہ ہیکہ یہ حوران بہشتی تیرے ہم شبیہ ہوں تاکہ تسکین قلب نہ سہی آنکھیں کم از کم ٹھنڈی ہوں۔ اگر ہماری یہ تمنا پوری ہو جائے اسی کو غنیمت جان کر صبر کر لیں گے اور تسکین حاصل نہ ہونیکا شکوہ اللہ میاں سے نہ کریں گے۔

۲۔ اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل — میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

فرماتے ہیں کہ اے دوست مجھ کو قتل کرنے کے بعد اپنے گھر سے کسی دور مقام پر دفن کر دینا۔ اپنی گلی میں دفن نہ کرنا۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ میرے واقعہ قتل کی شہرت سن کر تیری گلی میں جمع ہوں۔ اس رو سے ان کو تیرے گھر کا پتہ چل جائے۔ اور پھر جو تجھ کو دیکھے عاشق ہو جائے غرض یہ کہ مرنے کے بعد بھی کسی دوسرے کا تجھ کو دیکھنا اور تجھ پر مرنا ہمیں منظور نہیں۔

۳۔ ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

فرماتے ہیں کہ اے دوست یوں تو ہر شب تھوڑی بہت جس قدر شراب ملے ہم پی پیا کرتے ہیں مگر تشنگی دور نہیں ہوا کرتی۔ آج آپ ساقی ہیں اس لئے امید ہے کہ جی بھر کر پئیں گے۔ آپ بھی اپنی ساقی گری کی لاج رکھتے ہوئے اتنی پلائیے کہ تشنگی کی شکایت اور سیری کی ہوس باقی نہ رہے۔

۴۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

حضرت غالب نے اپنے ایک مکتوب میں اس شعر کی اس طرح تشریح فرمائی ہے:۔

"شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہے مگر کھٹکا ہے کہ قاصد کہیں میرے معشوق پر عاشق ہو جائے۔ ایک دوست اس عاشق کا، ایک شخص کو لایا اور اس عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد ہے۔ میں ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کریگا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ اتفاقاً عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیدا ہو گیا۔ کیسا خط کیسا جواب دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چلدیا۔ اب عاشق اس واقعے کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب دان تو خدا ہے کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر۔ اے ندیم تجھ سے کلام نہیں۔ اگر نامہ بر کہیں ملے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم عاشق نہ ہونے کے کیا کیا وعدے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔"

۵۔ تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

مجنوں نے کیا کیا: یعنی مجنوں نے کچھ نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ فن عاشقی و وحشت میں مجنوں طفل مکتب تھا۔ بجز کپڑے پھاڑ کر دشت میں پھرنے کے اس نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔ اگر غم پنہاں کی کشمکش سے نجات مل جائے تو ہم دنیا کو دکھا دیں گے کہ ہمارے مقابلہ میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ یا جو کچھ اس نے کیا ہیچ تھا۔ ایک اور جگہ مجنوں پر اپنی برتری اس طرح جتلاتے ہیں:۔

تھا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر

۶۔ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

پیروی، اتباع، پیچھے پیچھے چلنا۔ فرماتے ہیں اگر راہ سلوک و معرفت میں حضرت خضر علیہ السلام

ہمارے ہمسفر ہوں تو یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہم ان کا اتباع کریں شوخی یہ رکھی ہے کہ حضرت خضر کے پیچھے کیوں چلیں ان کو پیچھے چھوڑ کر ہم آگے بڑھ جائیں گے۔

۷۔ اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا　　تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

دیکھنا، خبر لینا۔ آشفتہ سر، دیوانہ فرماتے ہیں کہ اے معشوق کی گلی کے رہنے والو۔ غالب بحالت وحشت و دیوانگی اسی کوچہ کی طرف گیا ہے۔ جا کر بہت عرصہ ہوا معلوم نہیں کہ کس حالت میں ہے۔ آیا بچوں نے پتھروں سے اس کو زخمی کر دیا ہے یا وہ خود کسی دیوار سے ٹکرا رہا ہے یا بوجہ خستگی و ناتوانی کسی دیوار کے سایہ میں پڑ گیا ہے۔ یا معشوق کے در پر پڑا ہوا آہ و فغاں کر رہا ہے یا دربان کے جور ستم اٹھا رہا ہے یا اس دیوانہ کو کسی نے پا بہ زنجیر کر رکھا ہے۔ دوستو! ذرا اس کی خبر لینا اگر نظر آجائے۔ بھوکا پیاسا، خستہ و ناتوان، مجنوں و آوارہ، بیکس و بیچارہ ہے ذرا رحم کیجئے اور دیکھو کہ تم اس کی کس طرح مدد کر سکتے ہو۔ اس شعر کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے۔ وجدان بیان میں نہیں آسکتا خاصکر لفظ "دیکھنا" اس انداز سے رکھا ہے کہ ذوق وجد کرنے لگے

غزل نمبر ۳۱

۱۔ کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

جی میں ٹھانی ہے، مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ زندگانی: عاشق کی زندگی مع لوازمات عاشقی۔ فرماتے ہیں کہ اگر ہماری زندگی آئندہ بھی اسی رنج و کلفت، حرماں نصیبی و نامرادی میں گزرنے والی ہے تو ہم نے اپنے دل میں ایک بات ٹھان لی ہے۔ جس کا اظہار ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ سر پھوڑ کر مر جائیں یا نکل جائیں یا فقیر بن کر بیٹھ رہیں وغیرہ۔

۲۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں　　سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

اور ہے: زیادہ ہے۔ غم ہائے نہانی، غم ہائے عشق و محبت۔ فرماتے ہیں کہ آتش دوزخ کی حرارت تو مسلمہ ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں لیکن غم الفت کی سوزش آتش دوزخ سے بھی زیادہ ہے مطلب یہ ہے کہ عذاب دوزخ کے مقابلے میں غم پنہاں کی تکلیف زیادہ ہے۔

۳. بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

سرگرانی: خفگی - اور ہے یعنی پہلی تمام رنجشوں سے سوا ہے - فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی کئی بار دوست کی رنجشوں کا ہم کو تجربہ ہوا ہے۔ ناراض ہوا، تھوڑی دیر کے بعد غصہ جاتا رہا۔ سمجھانے منانے سے راضی ہو گیا لیکن اس دفعہ کی ناراضی کسی طرح دور نہیں ہو رہی ہے۔

۴. دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

اور ہے: اس کے علاوہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ قاصد، دوست کا خط دینے کے بعد ہم کو دیکھ رہا ہے اور اس کے چہرے سے کشمکش و پیچ د گو مگو کی کیفیت نمایاں ہے۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس خط کے علاوہ زبانی بھی کچھ کہلوایا ہے۔ لیکن وہ ایسی بات نہیں جو صاف صاف کہی جا سکے اس لئے قاصد اس زبانی پیغام کو کہتے جھجک رہا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے اس نے گالیوں سے ہماری تواضع کی ہے۔

۵. قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

قاطع، قطع کرنے والا۔ اعمار: جمع عمر کی۔ اور ہے: سب سے زیادہ ہے۔ بلائے آسمانی: معشوق اس لئے کہ قضا و قدر کے حکم سے مسلط ہے۔ فرماتے ہیں کہ نجوم کی گردش عمروں کو کاٹتی رہتی ہے، ہر روز، ہر ماہ، ہر سال عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ کٹتا ہے لیکن کاٹنے کا یہ عمل کئی سال میں تکمیل کو پہنچتا ہے اس کے برخلاف معشوق کی ایک ہی ادا ایک ہی لمحہ میں کام تمام کر دیتی ہے۔ لہٰذا گردش افلاک کی بلاؤں سے یہ آسمانی بلا کہیں زیادہ ہے۔

۶. ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

فرماتے ہیں کہ قسمت میں جتنی بلائیں لکھی گئی تھیں وہ سب ہم پر بیت گئیں اب صرف ایک مرگِ ناگہانی باقی رہ گئی ہے لیکن اس کا کوئی وقت مقرر نہیں، معلوم نہیں کب آئے۔ وہ آ جائے تو نجات ملے۔

غزل نمبر ۳۲

۱. کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

فرماتے ہیں کہ ہم ایسے بدقسمت ہیں کہ آج تک ہماری کوئی آرزو بر نہیں آئی اور آئندہ کامیابی اور امید برآنے کی کوئی صورت ہے۔

۲۔ موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

موت: دائمی آرام۔ نیند: عارضی آرام۔ اس شعر میں موت کی آرزو و انتظار کیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ اگر موت آجائے تو دنیا کی سب تکالیف کا خاتمہ ہو جائے مگر کیا کیا جائے اس کا ایک دن اور وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے وہ نہیں آسکتی۔ خیر جانے بھی دو۔ اگر اس دائمی آرام کے لئے کچھ مدت درکار ہے تو عارضی آرام کو کیا ہو گیا وہ بھی میسر نہیں۔ حاصل یہ کہ ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ نہ موت آتی ہے نہ نیند غرض آرام وچین کی کوئی صورت نہیں۔

۳۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ زندہ دلی تھی خوشی تو خوشی رنج کے موقعہ پر بھی آجایا کرتی تھی دل کی دیوانگی اور حرمان نصیبی کو دیکھ کر ہنس پڑتے تھے۔ مگر اب یہ حال ہے کہ جوانی کے ولولے جاتے رہے۔ دل مر گیا حسرت و یاس کا عالم طاری اور موت کا انتظار ہے کسی بات سے نہ دل خوش ہوتا ہے اور نہ ہنسی آتی ہے۔

۴۔ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

طاعت: عبادت۔ زہد: پرہیزگاری۔ فرماتے ہیں کہ میں عبادت اور پرہیزگاری کے ثواب اور فائدوں سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ طبیعت طاعت و زہد کی طرف مائل نہیں ہوتی ہر کام کی توفیق اللہ کی طرف سے ہے بندہ مجبور محض ہے۔

۵۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کچھ ایسی ہی بات ہے: یعنی زبان پر لانے کے قابل نہیں، راز کی بات ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری خاموشی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھ کو بات کرنی نہیں آتی۔ بلکہ میں اس لئے خاموش ہوں کہ وہ بات جو مجھ کو معلوم ہے کہنے کے قابل نہیں اگر پھوٹ جائے تو معشوق کی رسوائی کا اندیشہ ہے۔

۶۔ کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　میری آواز گر نہیں آتی

نالہ و فریاد آہ و زاری کرتے کرتے تھک کر تھوڑی دیر آرام لینا چاہوں اور گرم فریاد نہ رہوں تو وہ یاد فرماتے ہیں کہ کیا ہوا اس دیوانے کی آواز نہیں آرہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے در پر پڑا ہوا رات دن نالہ و فریاد کیا کرتا ہوں۔

۷۔ داغِ دل گر نظر نہیں آتا　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

فرماتے ہیں کہ جو معالج ہمارے غم عشق کے علاج پر معمور ہے اس کے سامنے ہم اپنا احوال بیان کر رہے ہیں کہ فلاں فلاں تکلیف ہے چنانچہ اس کے باعث دل پر داغ پڑ گئے ہیں معالج اس مرض سے محض ناواقف کہتا ہے کہ "ہمکو داغ واغ کچھ نظر نہیں آتا تم جھوٹ بک رہے ہو۔ تم کو کوئی مرض نہیں ہے"۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اے نادان طبیب اگر داغ دل نظر نہ آیا تو کیا ہوا۔ دل کے کباب ہونے کی بو بھی نہیں آرہی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ دل سینے کے پردے میں ہے اس لئے اس کا جلنا دیکھا نہیں جا سکتا مگر جلنے کی بو تو آسکتی ہے۔

۸۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

تصوف کے رنگ کا شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مقام فنا میں پہنچ گئے ہیں جب ہم باقی ہی نہیں رہے تو ہم اور ہماری خبر دونوں کا جھگڑا چک گیا۔

۹۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

مرنا: موت آنا، کسی بات کے بے حد مشتاق ہونا۔ لفظ مرنا کے مذکورہ دو معنوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مرنے کی آرزو میں مرتے ہیں۔ جب مرتے ہیں تو موت آنے کی دلیل ہے۔ اس طرح روزانہ موت آتی ہے لیکن (حقیقی) موت نہیں آتی۔

۱۰۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

شعر بالکل صاف ہے۔ یعنے تمام عمر تو گناہ کرتے کٹی۔ اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اب جو کعبۃ اللہ کی زیارت کا ارادہ ہے کیا تم کو کعبہ جاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟

اس مقدس مقام کو جانے کا تم کو منہ کہاں ہے؟

غزل نمبر ۳۲

۱۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اپنے دل کو محبت آمیز ترحم سے فرماتے ہیں کہ اے نادان دل تجھ کو یہ کیا سودا ہو گیا ہے جو تو اپنے درد کا درماں چاہتا ہے۔ ایک ناممکن بات کے پیچھے پڑنا نادانی ہے۔ بھلا دردِ عشق کی بھی دنیا میں کہیں دوا مل سکتی ہے؟

۲۔ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

فرماتے ہیں کہ دنیا کا یہ دستور ہے کہ جو محبت کرے اس سے محبت کرتے ہیں اور جو نفرت اور بیزاری کا اظہار کرے اس سے نفرت اور بیزاری کی جاتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ الٹا ہے ہم تو ان پر مرتے ہیں مگر وہ ہیں کہ ہم سے بیزار۔ آخر معاملہ کیا ہے۔ ماجرا کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مولانا حالی نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:۔

" گویا ابھی کوچۂ عشق میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ان سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔" (از یادگار غالب)

۳۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ بزم معشوق میں بہت سے لوگ جمع ہیں جن میں عاشق بھی ہے معشوق ہر ایک سے پرسش کر رہا ہے ان کی سنتا ہے اور مناسب جواب سے دلداری کرتا ہے لیکن عاشق کی طرف التفات نہیں کرتا اور نہ اس سے کچھ پوچھتا ہے۔ عاشق کچھ انتظار کے بعد جب مایوس ہو جاتا ہے تو ناراض ہو کر معشوق کو متوجہ کرتا ہے کہ آخر ہم سے بھی ہمارا مدعائے دل پوچھئے جیسے دوسرے اپنا اپنا مطلب بیان کر رہے ہیں۔ ہم بھی اپنا مدعا بیان کریں گے۔ ہمارے منہ میں بھی زبان ہے۔

قطعہ

۴۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

۵۔ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

۶۔ شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

۷۔ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ چار شعر قطعہ بند ہیں ۔ ان میں کوئی لفظ تشریح کا محتاج نہیں ۔ زبان نہایت سلیس صاف انداز بیان سیدھا ۔ لہٰذا ادبی اعتبار سے ان مصرعوں کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ۔ البتہ ان میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کا سمجھنا آسان نہیں ۔

حضرت غالبؔ وجود کی وحدت کے نہ صرف قائل بلکہ اس پر کامل ایمان رکھتے تھے لیکن قطعہ کے دیکھنے سے بہ ظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس مسلک پر اعتراض وارد کیا ہے یعنی جب خدا کے سوا دنیا میں کوئی موجود نہیں ہے تو پھر یہ حسینوں کا ہجوم اور ابر و باد وغیرہ کیا چیز ہے ۔ گویا وحدت وجود کا مسلک اور تصور درست نہیں ۔ خدا کے سوا یہ علیٰحدہ وجود بھی ہیں ۔ اگر ہم اس استفہام کو اعتراض فرض کریں تو سب سے بڑی شکل یہ ہوتی ہے کہ غالبؔ کا فلسفۂ الٰہیات یکقلم باطل ہو جاتا ہے ۔ جس کی اس نے اپنی نظم و نثر میں پرزور تبلیغ کی ہے ۔ لہٰذا اس استفہام کا مقصد اعتراض ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

شاعر نے جملہ رعنائیاں اور لطافتیں تین شعروں میں جمع کی ہیں اور اس کے بعد پوچھتا ہے کہ یہ رعنائیاں اور لطافتیں کس کی ہیں ؟ یعنی تیری ہی تو ہیں مطلب یہ ہے کہ خوبی اور لطافت درحقیقت ایک ہی ہے اور یہ تعینات جو اصل میں معدوم محض ہیں اسی لطافت اور رعنائی کے مظاہر ہیں ۔

۸۔ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

معشوق مسلمہ بے وفا مشہور ہیں پھر ایسوں سے وفا کی امید رکھنی نادانی ہے ۔

۹۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہے

صدا : سوال ۔ فرماتے ہیں کہ فقیر یہی صدا لگا کر بھیک مانگتا ہے کہ "بھلا کر تیرا بھلا ہوگا" میں بھی تیرے در کا فقیر ہوں اس لئے تو میری امید بر لا تاکہ خدا اس کے بدلے تیرا بھی بھلا کرے اس کے سوا میں کچھ نہیں مانگتا۔

۱۰۔ جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

فرماتے ہیں کہ دعائیں دے کر کام بنانے والے اور ہیں اور جان نثار کرنے والے اور۔ اے دوست مجھ کو دعا دینے کا ڈھب نہیں آتا البتہ جان دینے کا ڈھنگ یاد ہے میں تم پر اپنی جان نثار کرتا ہوں اس کے مقابلے میں دعا کی کیا حقیقت ہے۔

۱۱۔ میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ غالب ایک بے قدر اور ناکارہ آدمی ہے لیکن مفت ہاتھ آرہا ہے ۔ اس کو لینے کے لئے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا تو پھر اس کو اپنی غلامی میں قبول کرنے میں کیا ہرج ہے۔

غزل نمبر ۳۴

۱۔ کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے ۔۔۔ ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

غالیہ : ایک قسم کی خوشبو جو کافور مشک عنبر وغیرہ سے مرکب ہوتی ہے ۔ وو : ضمیر جمع غائب وہ کی جمع ۔ مطلب یہ ہے کہ بزم نشاط میں جملہ سامان طرب مہیا ہے ۔ ہر شخص بے چینی سے معشوق کا انتظار کر رہا ہے اور دعائیں مانگ رہا ہے کہ خدا کرے وہ آئے ۔ اس پر شاعر کہتا ہے کہ اس کے آنے کی تو سب دعا مانگ رہے ہیں ۔ کوئی گھبرا کے یہ چلا اٹھے کہ لو وہ آگیا ۔ یعنے اس کے آنے کی خوشخبری دے ۔ قاعدہ ہے کہ شدید انتظار کی حالت میں اگر مطلوب دور سے نظر آئے تو آدمی چلا اٹھتا ہے کہ دیکھو وہ آگیا یا آرہا ہے۔

عاشق فراقِ یار میں جاں بلب ہے۔ دوست احباب اس کی حالت پر رحم کر رہے ہیں اور دعا مانگ رہے ہیں کہ اس کا معشوق آجائے تو اس کی جان بچے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی کلمہ ہے کہ خدا کرے وہ آ جائے۔ اس پر عاشق فرطِ اشتیاق سے کہتا ہے کہ تم سب دعا تو مانگ رہے ہو کوئی دفعتاً یہ مژدہ بھی سنا دے کہ لو وہ آگیا۔ تاکہ جو جان حالتِ نزع میں لبوں پر ہے خوشی سے نکل جائے اور ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جائے۔

۲۔ ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت — کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

فرماتے ہیں کہ اے جذبِ محبت تو دوست کو کھینچ کر میرے پاس لے آ اگرچہ میں عالم نزع کی کشمکش میں ہوں۔ اس سے بات تو نہیں کر سکتا مگر یہ تسکین کیا کم ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے مر جاؤں۔

۳۔ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے

صاعقہ: بجلی۔ سیماب: پارہ۔ فرماتے ہیں کہ معشوق بہت انتظار اور بڑی التجا کے بعد آیا۔ مگر اس کا آنا نہ آنا دونوں برابر۔ اس لئے ہم سمجھ بھی نہ سکے وہ آیا بھی ہے۔ سمجھتے اس وقت اگر کچھ دیر وہ ٹھہرتا۔ توقف کرتا۔ بیٹھتا۔ مگر اس کا حال تو بجلی، شعلہ اور سیماب کا سا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اس کو قرار نہیں۔

۴۔ ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

نکیرین: وہ دو فرشتے جو قبر میں سوال و جواب کرتے ہیں۔ بادۂ دوشینہ: شب گزشتہ کی شراب

فرماتے ہیں کہ یہ تو ظاہر ہے فرشتے انسان سے گھبراتے نہیں۔ جب نکیرین میری قبر میں آئیں گے گھبرا کر نہ بھاگیں گے۔ ان کو بھگانے کی البتہ ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ رات میں خوب شراب پیئیں اور صبح میں مر جائیں۔ اس حالت میں شراب کی بو منہ سے آتی رہے گی۔ جہاں شراب کی بو آئے وہاں فرشتے کیسے ٹھہریں۔ شراب کی بد بو سے گھبرا کر بھاگ جائیں گے اور ہم کو پرسش سے نجات مل جائے گی۔

مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں :۔

"بادہ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی محض از راہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال وجواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تا کہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال وجواب کئے چلے جائیں" (از یادگار غالب)

۵۔ جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

"گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے" (از یادگار غالب)

یا

جلاد بظاہر دشمن بنکر آتا ہے مگر ہمارا دوست ہے اور واعظ دشمن ہے مگر دوست کے بھیس میں آتا ہے۔ہم دوست دشمن کو خوب جانتے ہیں خواہ وہ کسی روپ میں آئے۔

۶۔ ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اہل طلب : وہ لوگ جو دوست کی تلاش وطلب میں ساتھ تھے' ساتھی ۔ فرماتے ہیں کہ ساتھیو تم دوست کی تلاش میں ہو اور میں بھی اس کو ڈھونڈھنے نکلا تھا ۔مگر وہ نہ ملا ۔ اب خالی ہاتھ واپس آجاتا تو لوگ کہتے کہ بڑی شیخی سے دوست کی طلب میں نکلا تھا مگر اپنا سا منہ لے کر آ کام ہوا ۔ احباب کے اس طعنہ سے بچنے کے لئے اپنے کو وہیں کھو آیا جب میں نہ رہوں تو طعنہ کس کو دینگے۔ اس شعر میں لطف یہ ہیکہ ملنے اور کھونے کی ضدین کا نتیجہ ایک ہے یعنی اپنے آپ کو کھوئے یعنی اس کو پالیا ۔پھر اہل طلب طعنہ کیسے دیسکتے ہیں ۔

۷۔ اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

شیوہ : طریقہ ۔ فرماتے ہیں کہ ہم بے چین آدمی ہیں کسی جگہ آرام سے بیٹھنے کی عادت نہیں ۔ معشوق کے در پر گئے تھے ۔بار نہیں ملا ۔ اجازت کے انتظار میں کون آرام سے بیٹھے رہے ۔ اپنی خو سے مجبور اٹھے کہ چلو یہاں بار ملنے تک کعبہ ہی ہو آئیں ۔سو کعبہ ہو آئے ۔شوخی اس شعر میں یہ رکھی ہے کہ مقصود اصل تو زیارت یار تھا کعبہ جیسے وقت گذاری کیلئے گئے تھے ۔

۸. کی ہمنفسوں نے اثر گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

فرماتے ہیں کہ میرے دوست میری سفارش کیلئے معشوق کے پاس گئے۔ اور میری آہ و زاری کا ذکر اس سے کیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ اس کی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ وہ بھی بیمار ہے تو اس کی پرسش اور ہمدردی کی۔ اور کہا کہ افسوس آپ کی حالت بھی دن بدن خراب ہو رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہارے عاشق کے گریہ کی تاثیر ہے جو تم کو گھلا رہی ہے لہٰذا جلد اس کا مداوا کیجئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معشوق کے ہاں وہ تو ہمدرد و غمخوار ہو گئے اور میں اس کا دشمن یعنے بیمار ڈالنے والا ثابت ہوا۔

۹. اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالبؔ — ہم بھی گئے واں اور تیری تقدیر کو رو آئے

فرماتے ہیں کہ معشوق کی محفل سبحان اللہ رعنائیوں اور دلچسپیوں سے معمور ہے۔ اس کی رنگینیوں کی کیا بات ہے۔ ہم بھی گئے تھے بہت محظوظ ہوئے۔ تیرے وہاں رہنے کا بجد افسوس ہوا تیری بدقسمتی کو رو آئے۔

غزل نمبر ۳۵

۱. پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے

جویا: متلاشی۔ فرماتے ہیں کہ پھر دل میں ایک نئی بے قراری اور تڑپ پیدا ہو گئی ہے اس سے پہلے تک ہم نے جتنے زخم جگر کھائے اس سے دل کو تسکین نہیں ہوئی اس لئے اب کاری اور دل کشا زخم کی سینے کو تلاش ہے۔ مطلب یہ ہیکہ پھر درد محبت دل کو تڑپا رہا ہے۔ اور پھر ناز و ادا کے گہرے زخم اٹھانے کی آرزو ہے۔

۲. پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمد فصلِ لالہ کاری ہے

فصل: موسم۔ لالہ کاری: لالہ کی کاشت۔ فرماتے ہیں کہ پھر جگر میں گدگدی شروع ہو گئی اور ہم ناخن سے جگر کریدنے لگے۔ اس کا یہ منشا ہیکہ لالہ کی کاشت کا موسم آگیا۔ اب ناخن سے جگر میں گڑھے کر کے تخم ریزی کرینگے۔ اس کے بعد گل لالہ کی وہ فراوانی ہوگی کہ جہاں بیٹھیں گے زمین کو سرخ کر دیں گے۔

۳۔ قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز   پھر وہی پردۂ عماری ہے

عماری: ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہونے کا ہودہ۔ قبلۂ مقصد: مقام مقصد جائے مقصود۔ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق عماری میں نکلا کرتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ہماری نیاز مندانہ نظریں پھر پردۂ عماری پر پڑ رہی ہیں گویا پردۂ عماری ہماری مشتاقانہ نگاہ کا قبلۂ مقصد ہے۔

۴۔ چشم دلالِ جنسِ رسوائی   دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

دلال: رہنما، سودا کرانے والا۔ جنس رسوائی: عشق، جنون۔ ذوق خواری: مراد عشق۔ فرماتے ہیں کہ آنکھ عشق و رسوائی کا سودا کرانے والی ہے اور دل اس جنس کا خریدار ہے۔

۵۔ وہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہی صد گونہ اشکباری ہے

جب چشم نے دلالی اور دل نے خریداری کی یعنی عاشق ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو سو طرح سے رو رہے ہیں اور آنسو بہا رہے ہیں۔

۶۔ دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بے قراری ہے

ہوا: خواہش، آرزو۔ محشرستانِ بے قراری: نہایت بے قرار۔ فرماتے ہیں کہ دل معشوق کی خرام ناز کی آرزو میں نہایت بے قرار ہے۔

۷۔ جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روز بازارِ جاں سپاری ہے

جان سپاری: جان دینا، مرنا۔ فرماتے ہیں کہ معشوق پھر ناز و ادا سے جلوہ گر ہوتا ہے اس لئے روزانہ محبت کا بازار گرم ہے۔

۸۔ پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

یعنے پھر اس بے وفا معشوق کی محبت ستا رہی ہے اس لئے پھر آوارگی و دیوانگی کی زندگی ہے۔

۹۔ پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز   گرم بازارِ فوجداری ہے

۱۰۔ ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

۱۱۔ پھر دیا پارۂ جگر نے سوال   ایک فریاد و آہ و زاری ہے

۱۲۔ پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے

۱۳۔ دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

فوجداری : تعزیری مقدمات ۔ سررشتہ دار : میر منشی ، منتظم ۔ زلف بھی تار تار رہتی ہے اور جب رخِ یار پر پراگندہ ہوتی ہیں تو ان کی دلفریبی سے عاشقوں پر قیامت ٹوٹ جاتی ہے —

سوال دینا : دعویٰ دائر کرنا ، عرضی پیش کرنا ۔ روبکاری : تاریخ پیشی ، مقدمہ کی سماعت ۔

قطعہ ۹ تا ۱۳ ۔ اس پوری غزل میں محبت اور اس کی پریشانی کا ایک ہی خیال مختلف طریقوں سے باندھا گیا ہے ۔ ان قطعہ بند اشعار میں بھی وہی ایک خیال عدالتی اصطلاحات میں جلوہ گر ہے ۔ فرماتے ہیں کہ عدالتِ ناز جس کا مجسٹریٹ معشوق اور زلف سررشتہ دار ہے (تعطیلات گرما کے بعد) کھل گئی ۔ مجسٹریٹ کا جلوہ گر ہونا تھا کہ صدہا قتل و خون کے فوجداری مقدمات دائر ہو گئے ۔ ہمارے دل نے بھی مژگانِ یار کے ظلم و ستم کے خلاف ایک مقدمہ دائر کر رکھا تھا کئی پیشیاں چلیں آج پھر اس مقدمہ کی پیشی ہے ہمارے پارۂ جگر نے فریاد کناں آہ و زاری کرتے ہوئے (جلد فریاد رسی کیلئے اچھل کر) ایک اور عرضی پیش کر دی ۔ لیکن جہاں مجسٹریٹ معشوق سا سفاک اور حق ناشناس اور زلف سررشتہ دار ہو ۔ انصاف کی کیا توقع ۔ ان دونوں نے ناانصافیوں سے دنیا میں ایک اندھیر مچا رکھا ہے (چنانچہ آج کی پیشی پر) مکرر عشق کے گواہ طلب کئے گئے ہیں یعنی عاشق ہونے کے ثبوت میں دوبارہ گواہ پیش کریں ۔ (گواہوں کے حاضر ہونے اور ان کا بیان قلمبند ہونے تک) تجویز عدالت یہ ہے کہ ہم روتے رہیں (آخر فیصلہ کب اور کیا ہوگا اللہ ہی کو علم ہے) ۔

۱۴۔ بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ تجھ پر جو بے خودی طاری رہتی ہے ۔ یہ بلاوجہ نہیں اس بیخودی کا کوئی خاص سبب ضرور ہے ۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے جس کو تو چھپا رہا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تو کسی پر عاشق ہوا ہے اور اس کے تصور میں کھو جاتا ہے ۔ لیکن اس راز کا افشا نہیں کرتا ۔

غزل نمبر ۳۶

۱۔ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی ‌ ‌ ‌ ‌ نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

تہمت کشِ تسکین : تسکین کی تہمت جس پر لگائی جائے۔ خراشِ دل : زخمِ دل۔ فرماتے ہیں کہ میری زندگی کی لذت زخمِ دل کی نمک پاش ہے۔ بالفاظِ دیگر زخمِ دل پر نمک پاشی لذتِ زندگانی ہے۔ یعنی جب میرے زخمِ دل پر نمک پاشی ہوتی ہے تو مجھ کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ لذت حاصل ہونے کا نتیجہ شادمانی ہے۔ لہٰذا اگر میں نے شادمانی کی تو یہ نہ سمجھو کہ میرے جنونِ عشق میں کمی ہو گئی ہے۔ اور اس پر تسکین پذیری کی تہمت مت لگاؤ۔ میری شادمانی سے دھوکہ مت کھاؤ یہ زخمِ جگر پر نمک پاشی کی شادمانی ہے جس سے وحشت اور جنون میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی ‌ ‌ ‌ ‌ ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

کشاکش ہائے ہستی : زندگی کی پریشانیاں۔ فرصت : آزادی۔ فرماتے ہیں کہ آدمی جب تک زندہ ہے اس کو زندگی کی کشمکش سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس کا ہست ہونا یعنی عدم سے وجود میں آنا ہی قید و بند اور مصائب میں مبتلا ہونے کی دلیل ہے۔ انسان کے وجود کی مثال سمندر کی موج کی سی ہے۔ جب تک موج نہ اٹھے وہ سمندر رہے اور ہر قسم کی بندشوں سے آزاد جونہی اس کو روانی کی فرصت ملی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ (ظاہر ہے کہ موج کی شکل زنجیر کی ہوتی ہے)

۳۔ پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے ‌ ‌ ‌ ‌ شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

فرماتے ہیں کہ زندگی تمام جنون و دیوانگی میں گزری۔ بستی کے بچے پتھروں سے تواضع کرتے رہے۔ مرنے کے بعد بھی ان بچوں سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ زندگی میں میرا سر ان کی سنگ باری کا نشانہ تھا۔ اب لوحِ مزار پر سنگ باری ہوتی ہے۔ سنگ باری سے جو چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں میری تربت پر گلفشانی کرتی ہیں۔

غزل نمبر ۳۷

۱۔ نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی ‌ ‌ ‌ ‌ مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

نکوہش: ملامت۔ مبادا: کہیں ایسا نہ ہو۔ خندۂ دنداں نما: طنز آمیز ہنسی بشرا ہنسی کو صبح سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ صبح محشر روز عدل و انصاف کا ہوگا حساب کتاب ہوگا مظلوموں کی فریاد سنی جائے گی۔ ظالموں کو سزا دیجائیگی۔ ہم اس توقع پر ظلم سہے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک کھٹکا بھی لگا ہوا ہے وہ یہ کہ روز محشر بیداد دلبر کے فریادی بن کر جب ہم پیش ہوں گے تو ایسا نہ ہو کہ ہمکو ہی سزا دی جائے۔ اس لئے معشوق کے ظلم کی فریاد کرنی کم حوصلگی ہے اور کم حوصلگی کی سزا ملامت۔ پس اندیشہ ہیکہ صبح محشر جس سے ہم نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں ہمارے حق میں خندۂ ملامت نہ ہو جائے۔

۲۔ رگ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے ۔۔۔ اگر بووے بجا دانہ دہقاں نوک نشتر کی

رگ لیلیٰ اور نشتر سے بعض حضرات کو تلمیح کا دھوکہ ہوا ہے۔ اس شعر میں تلمیح نہیں ہے۔ محض نشتر کی رعایت سے رگ آئی ہے۔ ریشگی بخشے: جڑیں پیدا ہوں، جڑ اور رگ میں مشابہت ہے۔ مطلب ہیکہ مجنوں کے فیضِ عشق سے دشتِ مجنوں کی زمین "لیلیٰ خیز" بن گئی ہے۔ اس میں کوئی چیز بوئی جائے مگر پیدا ہوگی لیلیٰ۔ غلہ کے دانوں میں تو نشو نما کی صلاحیت موجود ہے اگر اس سے لیلیٰ اگے تو چنداں تعجب نہیں فیض عشق کا یہ اثر ہے کہ دانہ کی بجائے فولاد کا ٹکڑا بھی بو دیا جائے تو اس میں بھی رگہائے لیلیٰ کی جڑیں پیدا ہوں اور پودا نکلے تو وہ لیلیٰ ہو۔

۳۔ پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا ۔۔۔ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کشتی میں بادبان سے روانی پیدا ہوتی ہے۔ اور ساغر کے دور میں گرمیٔ محفل سے روانی پیدا ہوتی ہے اس شعر میں شاعر نے پروانے کے پر کو کشتیٔ مے کا بادبان قرار دیا ہے جس کے زور سے کشتی چلنے لگی۔ پروانہ کا وجود بغیر حرارت و نور کے نہیں۔ وہ نور یا حرارتِ عشق ہے۔

ان مبادی کو ذہن نشین کر لیا جائے تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ محفل کی گرمی پروانے کے جلنے سے ہے اس کے بعد کشتیٔ مے یعنی ساغر میں روانی پیدا ہوتی ہے گویا کشتی مے کی روانی کا باعث پروانہ ہے۔ حاصل اس شعر کا یہ ہے کہ عشق کی حرارت کے بغیر زندگی میں کیف و سرور نہیں

۴۔ کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت ۔۔۔ کہ طاقت اڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی = پھڑکنا۔ کیا قدرت = کیا مجال ہے ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں کہ میرے ذوقِ پرفشانی نے مجھ پر ایسا ظلم کیا ہے جس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ کم عمری ہی میں ذوقِ پرفشانی پھڑکانے اور تڑپانے لگا۔ اس نوعمری میں اس قدر پھڑکے کہ شہپر بیکار ہو گیا۔ جب پر و بال پوری طرح آئے اڑنے کی عمر ہوئی۔ اڑنا چاہے تو محسوس ہوا کہ شہپر بیکار ہو گیا ہے اڑ نہیں سکتے۔ برا ہو ذوق کا کہ اس نے ہمکو عین لطف کے زمانے میں نکما سا کر دیا۔

۵۔ کہاں تک روؤں اسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ۔۔۔ میری قسمت میں یارب کیا تھی دیوار پتھر کی

فرماتے ہیں کہ معشوق خیمہ میں فروکش ہے ہم کو داخل ہونے کی اجازت نہیں خیمہ کے پیچھے کھڑے ہوئے رو رہے ہیں۔ آخر رونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ انسان کہاں تک روئے قیامت تو یہ ہے کہ میرے اس قدر رونے پر بھی اس کو رحم نہیں آتا۔ چاہتا ہوں کہ دیوار سے سر ٹکرا کر جان دوں اور اس غم سے نجات پاؤں مگر یہاں بھی بدبختی حائل ہو رہی ہے خیمہ کی دیواریں کپڑے کی ہیں پتھر کی دیوار کہیں نہیں۔ اب بدبختی کا کیا علاج۔

غزل نمبر ۳۸

۱۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۔۔۔ جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

بے اعتدالی = کسی کام میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ سبک ہوئے = ہلکے ہوئے ذلیل ہوئے۔ کم ہوئے = حقیر و ذلیل ہوئے۔ کسی معاملہ میں انسان اعتدال پر نہ رہے حد سے زیادہ تجاوز کر جائے تو اس کا نتیجہ ذلت اور پریشانی ہے! اس لئے فرماتے ہیں کہ بے اعتدالیوں کے باعث سب لوگوں میں ذلیل ہو گئے۔ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی توضیح ہے۔ یعنی جتنا کوئی آگے بڑھیگا۔ اس کا ردِ عمل ضروری ہے۔ اتنا ہی پیچھے ہٹے گا۔

۲۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۔۔۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

پنہاں تھا = پوشیدہ تھا۔ دام سخت = مضبوط جال۔ فرماتے ہیں کہ جس آشیانے میں ہم نے

جنم لیا اور بال و پر نکالے اسی سے متصل ایک جال بھی چھپا ہوا تھا جب اڑنے کے قابل ہوئے تو ساتھ ہی جال میں پھنس گئے۔

خصوصیات کلام غالب کے بیان کے ضمن میں جناب حالی نے اس شعر کو بطور مثال پیش کیا ہے اور جو استعارہ و تمثیل اس شعر میں ہے اس کی تصریح اس طرح کی ہے۔

"جو مطلب اس طریقہ سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا" (از یادگار غالب)

۳۔ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

اس شعر کا مطلب حضرت غالب نے مکتوب بنام میر مہدی صاحب میں اس طرح لکھا ہے فرماتے ہیں "پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے۔ قد اس کا کتنا لمبا ہے۔ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں رنگ کیسا ہے۔ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیت میں سے نہیں۔ ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے یعنی کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہوگئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے"۔

۴۔ سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

سختی کشانِ عشق: عشق کی سختیاں اٹھانے والے یعنی عشاق۔ الم: رنج و غم۔ سراپا: بالکلیہ۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو عشاق کی کیا خبر پوچھتا ہے۔ وہ غم سہتے سہتے سراپا غم بن گئے ہیں یعنی بجز رنج و غم کے ان کے وجود میں اب اور کچھ نہیں رہا۔ اس لئے وہ نظر نہیں آتے پھر ان کی خبر کیا پوچھتے ہو۔

۵۔ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

معشوق کے مہربان ہونے کے باوصف عاشق افسردہ ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر معشوق حیرت سے پوچھتا ہے کہ اب تو تم کو خوش ہونا چاہیے تھا۔ یہ افسردگی کیوں؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایک تیرے مہربان ہو جانے سے تمام مظالم کی تلافی کیونکر ہو۔ اگر صرف تیرا ہی ظلم ہوتا تو تیری مہربانی سے اس کی تلافی ہو جاتی اور پھر کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ زمانے نے تو ہم پر صدہا ستم توڑے ہیں ان کی تلافی بھی تو چاہیے۔

۶۔ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حکایاتِ خونچکاں : ایسی دردناک حکایات جن کے لکھنے میں قلم سے اور سننے والوں کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے ۔ ہاتھ قلم ہونا: ہاتھ کٹ جانا ۔ یہاں اس سے مراد زخمی یا شل ہونا ۔ فرماتے ہیں کہ عشق وجنون کے دردناک واقعات ہم لکھتے رہے ۔ لکھتے لکھتے ہاتھ زخمی ہوگئے لیکن ہم نے اپنا لکھنا جاری رکھا ۔

۷۔ اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے　　اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

تندی خو : تیز مزاجی ' بدمزاجی ' بیم : خوف ۔ رزق ہم ہوئے : ہم رزق ہوئے یعنی ایک دوسرے کا رزق بن گئے ۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست تیری بدمزاجی کے خوف سے میں نالہ نہ کرسکا گویا نالے کے اجزا دل میں ایک دوسرے کا رزق ہوگئے اور نالہ ختم ہوگیا ۔

۸۔ اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق　　جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

اہل ہوس : بوالہوس ' غرض کے بندے ' رقیب ۔ نبرد : لڑائی ' جنگ ۔ علم : پرچم ' لوا ۔

فرماتے ہیں کہ رقیبوں کی جیت اسی میں ہے کہ میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگ جائیں ۔ وہ غرض کے بندے عشق کی سختیوں کی تاب نہیں لا سکتے ان کی کامیابی یہی ہے کہ عیش کریں اور برا وقت آئے تو بھاگ جائیں ۔ بھاگنے میں جو پاؤں اٹھتے ہیں اسی کو لوائے ظفر کا بلند ہونا سمجھیں ۔

ہوس کو پاس ناموس وفا کیا ؟

۹۔ نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے　　جو واں نہ کھچ سکے سو یاں آ کے دم ہوئے

فرماتے ہیں جب ہم عدم میں تھے نالوں کی ایک غیر معین تعداد ہمارے ذمہ لگی تھی ۔ جب تک عدم میں رہے نالے کھینچتے رہے ۔ ابھی وہ فرض پورا نہ ہوا تھا کہ اس دنیا میں بھیج دیئے گئے ۔ لہٰذا جو نالے عدم میں کھینچنے سے باقی رہ گئے تھے یہاں سانس بن گئے ہیں جب تک زندہ ہیں نالے کھینچتے رہیں گے اور اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے مطلب صرف اسقدر ہے کہ پیدائشی بدنصیب ہیں جب تک زندہ ہیں روتے رہیں گے ۔

۱۰۔ چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی　　سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

دل لگی : عشق بازی ۔ سائل : گدا ۔ فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ گدائی میں بھی محبت ہم نے نہیں چھوڑی

سائل بنکر سوال کرتے دربدر پھرے اور جہاں کسی نے احسان کیا اس کے عاشق ہو گئے۔

غزل نمبر ۳۹

۱۔ جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

نقد: روپیہ اشرفی۔ داغ کو شعراء کبھی سیاہ اور کبھی سرخ چیز سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ بعض وقت جلد جل کر سیاہ دھبہ آ جاتا ہے اور بعض وقت جلنے سے زخم آ جاتا ہے تو سرخ ہوتا ہے۔ فسردگی: افسردگی، گمگینی۔ کمین: گھات۔ بے زبانی: خموشی۔ پاسبانی: حفاظت۔ مطلب یہ ہے کہ شعلۂ عشق کی وجہ داغِ دل ہے۔ اور یہ داغِ دل بڑی قیمتی چیز ہے۔ دنیا کی ساری چہل پہل نغمہ سرائی، رونق داغِ دل یعنی محبت سے ہے۔ حیوانات کے علاوہ محبت کا جذبہ نباتات و جمادات میں بھی ساری ہے۔ سیاروں کی باہمی کشش، مادوں میں کشش اتصال، نباتات میں بقائے نوع کی خواہش یہ سب محبت ہی کی مختلف کیفیتیں ہیں۔ بالفاظ دیگر محبت زندگی کا دوسرا نام ہے اور اسی سے دنیا قائم ہے۔ اگر محبت باقی نہ رہے تو مُردنی اور سکوت طاری ہو جائے۔ اس سیدھے سادے خیال کو تشبیہات اور استعاروں سے پیچیدہ کر دیا گیا ہے (شعلہ کو شعراء زبان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اسی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں بے زبانی لایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ داغ دل کی (جو ایک قیمتی متاع ہے) حفاظت شعلۂ عشق کر رہا ہے۔ اگر وہ حفاظت نہ کرے تو افسردگی خموشی و سکوت کی گھات سے نکل کر اس کو چرا لے جائے۔)

۲۔ مجھے اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

کودکی: بچپن۔ یعنی معشوق کم سنی ہی میں میرے بہلاوے میں نہیں آیا حالانکہ بچے بھولے بھالے اور کہانیاں سننے کے شوقین ہوتے ہیں۔ ایسے شوخ و طرار سے جوان اور باشعور ہونے کے بعد کیا توقع ہو سکتی ہے کہ پھسلاوے میں آ جائے اور میری بات سنے۔

۳۔ یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

اس شعر سے حضرت غالب کی شرافتِ نفس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو شخص دشمن کو بھی تکلیف نہ پہونچانا چاہے اس کی پاک باطنی اور اخلاق کی پاکیزگی کے کیا کہنے۔

فرماتے ہیں کہ میری زندگی جن آلام و آفات سے گھری ہوئی ہے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں بجز میرے ان مصائب و شدائد کو دوسرا کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر دوات کا لیف کے برداشت کے قابل ہوتا تو دعا کرتا کہ اے خدا میری زندگی میرے دشمن کو دیدے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ وہ اس دکھ کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر ایسی دعا کر کے اس کو دکھی کرنا مناسب نہیں۔

غزل نمبر ۴۰

۱۔ ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اس شعر کا مطلب ایک رقعہ میں جو مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کے نام لکھا گیا ہے حضرت غالب نے اس طرح بیان فرمایا ہے :۔

"پیر و مرشد۔ مصرع۔ ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے۔ یہ خبر ہے پہلے مصرعہ کی۔ مصرع۔ ظلمتکدے میں میرے شب غم کا جوش ہے۔ یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمت غلیظ، سحر نا پید اگویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں دلیل، صبح کی بود یہ ہے۔ یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھیرایا وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ بس دیکھا چاہئے جس گھر میں علامت صبح موند ظلمت ہوگی۔ وہ گھر کتنا تاریک ہوگا" (از عود ہندی)

۲۔ نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

آشتی۔ صلح۔ یعنی ایک عرصہ ہوا کہ کان وصال کی خوشخبری سے اور آنکھ دوست کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس محرومی کا نتیجہ یہ ہے کہ کان اور آنکھ میں رشک کی وجہ جو چشمک تھی جاتی رہی اب دونوں میں آشتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جبتک دوست سے تعلقات قائم تھے کبھی اس کے جمال سے نظر محظوظ ہوتی تو کان کو رشک آتا اور کبھی نامہ و پیام سے وصل کی نوید سنائی دیتی تو کان مسرور اور آنکھ جلنے لگتی۔ لیکن اب یہ ہے نہ وہ اس لئے ایک کا دوسرے پر رشک کرنا جاتا رہا۔

۳۔ مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

حسنِ خود آرا: ایسا حسن جسکو بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں' بناؤ کی لاکھوں دلفریبیاں خود حسن میں موجود بے حجاب کرنا: مراد چمکانا' نمایاں کرنا تسلیم ہوش: ہوش و حواس حسن کے حوالے کر دینا۔ فرماتے ہیں کہ شراب نے معشوق کے حسن کو چار چاند لگا دئیے ہیں۔ اب حسن بہت نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے۔ اس لئے شوقِ دیدار کو اجازت تو ہے مگر دیکھنے کی نہیں۔ صرف ہوش اس کے حسن کے حوالے کرنے کی یعنی بے ہوش ہونے کی۔ مطلب یہ ہیکہ مئے نوشی سے معشوق کا رنگ سرخ اور حسن دوبالا ہو گیا ہے اس لئے جو دیکھتا ہے فریفتہ اور وارفتہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

گوہر: موتی - عقدِ گردن: مالا۔ ستارہ اوج پر ہونا: نہایت بلند اقبال اور خوش نصیب ہونا۔ فرماتے ہیں کہ گوہر فروش نے معشوق کے ہاتھ جو موتی بیچے وہ موتی اس کے گلے کی مالا بن گئے اب گوہر فروش اپنے موتیوں کی رسائی اس سرو قامت کی گردن تک دیکھتا ہے تو اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہے۔

۵۔ دیدار بادہ' حوصلہ ساقی' نگاہ مست بزمِ خیال' میکدۂ بے خروش ہے

میکدۂ بے خروش: ایسا شرابخانہ جہاں کوئی آواز نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ مئے خانہ میں بادہ' ساقی' مستی اور میخواروں کی ہائے وہو کا شور ضروری ہے۔ مگر ہماری خیالی بزمِ نشاط میں میخانے کی سی کیفیت رکھتی ہے البتہ خروش سے خالی ہے۔ (دیدار بادہ) معشوق کو سر تا پا ہو کر تصور میں دیکھنا شراب کا سا سرور پیدا کرتا ہے (حوصلہ ساقی) اس کے جلوہ کی تاب لانا حوصلہ ہی کا کام ہے۔ اس لئے حوصلہ ہمارا ساقی ہے جو بادہ دیدار عطا کرتا ہے (نگاہ مست) دوست کے دیکھنے سے نگاہ مست ہو جاتی ہے گویا بزمِ خیال میں بادہ بھی ہے ساقی بھی ہے اور مستی بھی البتہ خروش نہیں ہے

قطعہ

۶۔ اے تازہ وارداں بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

۷۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

۸۔ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

۹۔ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

۱۰۔ لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

۱۱۔ یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

۱۲۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(تازہ واردان ، نو واردان ۔ بساط : فرش ۔ ہوائے دل : خواہشات نفسانی) : نوجوانو زنہار : خبردار ۔ ہوسِ نائے و نوش : عیش و طرب کی بیجا خواہش ۔ عبرت نگاہ : عبرت حاصل کرنے والی آنکھ ۔ گوش نصیحت نیوش : نصیحت سننے والے کان ۔ آگہی : عقل و خرد ۔ تمکین : عزت ۔ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش یعنی گلوں سے بھرے ہوئے ۔ مندرجہ بالا پورے قطعے میں کوئی خیال اور ترکیب ایسی نہیں جس کی تشریح ضروری ہو ۔ خلاصہ اس قطعہ کا یہ ہے کہ تازہ گرفتاران ہوا و ہوس یعنی نوجوانوں کو خطاب کرکے فرماتے ہیں ۔ خبردار عیش و نشاط کی ہوس میں مبتلا نہ ہونا ۔ مجھ بڈھے کی حالت سے عبرت حاصل کرو اور میری نصیحت سنو ساقی (معشوق) ایمان اور عقل کا اور مطرب عزت و ہوش کا دشمن ہے ۔ (محفل عیش میں) یعنی جوانی میں گل ہی گل نظر آتے ہیں ۔ معشوق کا ناچ اور چنگ کی آواز بہت بھلی معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن صبح تک یعنی بڑھاپے میں یہ تمام خوشیاں کافور ہو جاتی ہیں ۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا نہ ساقی نہ مطرب نہ گل ۔ البتہ رات کی جلی ہوئی داغدار شمع اس بزم طرب کی نشانی رہ جاتی ہے وہ بھی بجھی ہوئی ۔ شب سے جوانی ، صبح سے پیری اور بجھی ہوئی شمع سے انسان کا داغدار دل مراد ہے ۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ جوانی کی مسرتیں چند روزہ ہیں اگر انسان دیوانہ وار بے اعتدالیوں کا شکار ہو جائے ان خوشیوں کی مدت اور بھی مختصر ہو جاتی ہے ۔ ضعیفی قبل از وقت نمودار ہوتی ہے ۔ اس کے بعد حسرت و افسوس تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں رہتا ۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ جوانی میں احتیاط اور عقل و ہوش سے کام لے ۔ تاکہ کفِ افسوس ملنا نہ پڑے ۔

۱۳۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

سر یر خامہ: قلم کی آواز۔ نوا: آواز۔ سروش: حضرت جبرئیل علیہ السلام، پیغام لانے والا فرشتہ۔

فرماتے ہیں کہ ایسے بلند پایہ مضامین منجانب اللہ میرے خیال میں آتے ہیں گویا میرے قلم کی آواز حضرت جبرئیل کی آواز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام الہامی ہے۔ الہام ہوتا ہے اور میں لکھتا ہوں۔

غزل نمبر ۱۸۱

۱۔ آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

شعر صاف ہے معشوق کے انتظار میں بیقرار ہیں اور کہتے ہیں کہ جلد آ، انتظار کی تکلیف قابل برداشت نہیں ہے۔

۲۔ دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے — نشہ باندازہ خمار نہیں ہے

نشہ: سرور۔ خمار: تکلیف، درد سر، وہ بدمزگی جو نشہ کے اتار کے وقت لاحق ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں انسان کو جو تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں اس کے معاوضہ کے طور پر آخرت میں جنت دی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کی کھوتیوں کا جنت پورا پورا معاوضہ نہیں ہوسکتی۔ اس سے کچھ زیادہ دیا جاتا تو مناسب تھا۔

۳۔ گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھکو — ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

فرماتے ہیں کہ بزم معشوق سے محض رونے کی بنا پر میں نکالا جاتا ہوں۔ جونہی رونے لگا معشوق کا حکم ہوتا ہے کہ اس منحوس کو نکال دو۔ ہائے افسوس مجبوری یہ ہے کہ گریہ پر مجھکو اختیار نہیں ہے۔ بلا قصد خود بخود آجاتا ہے۔ پیدائشی منحوس ہیں۔

۴۔ ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر — خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

عبث: غلط، فضول۔ عشاق کی خاک: عشاق کی سرشت یا خمیر۔ غبار: کینہ، کدورت۔

فرماتے ہیں کہ ہم عاشقوں سے رنجیدگی کا گمان درست نہیں۔ عاشقوں کا دل کبھی میلا نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کی فطرت کینے و کدورت سے پاک ہوتی ہے۔

۵۔ دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی — غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

معانی: علم معانی، یعنی (الفاظ کا) وہ علم جو ادائے معنی مطلوبہ میں وقوع خطا سے محفوظ رکھے۔

اور نیز عبارت کی بد اسلوبی سختی اور دشواری سے بچائے بلاغت کلام اسی سے حاصل ہوتی ہے (فرہنگ آصفیہ)

مطلب یہ ہیکہ جس طرح بہار کا آئینہ گل ہے یعنی بہار کا جلوہ گل ہی میں نظر آتا ہے اسی طرح میرے کلام کی بلاغت کا آئینہ پڑھنے والوں کا دل ہے۔ کلام کے حسن کو آئینہ دل ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔ یعنی میرے کلام کی بلاغت صرف دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ بیان میں نہیں آسکتی۔

۶۔ قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

فرماتے ہیں کہ بڑی مسرت کا مقام ہے معشوق نے میرے قتل کا وعدہ تو کیا ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ عہد بھی دوسرے وعدوں کی طرح بودا ہوا تو سخت افسوس ہوگا۔

۷۔ تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

مے کشی کی قسم کھائی ہے۔ مے کشی سے انکار کیا ہے۔ یا مے کشی کا عزم ارادہ کر لیا ہے۔

فرماتے ہیں غالبؔ نے مے کشی کی قسم اس انداز سے کھائی ہے کہ اس سے پینے اور ضرور پینے کے دونوں پہلو نکلتے ہیں دوسرے غالبؔ جیسا عادی شرابی وہ شراب چھوڑ دے باور نہیں آتا۔ ان دونوں باتوں کے پیش نظر اسکی قسم کا اعتبار نہیں ہے

غزل نمبر ۴۲

۱۔ ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے — کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

فرماتے ہیں کہ ہجوم غم کا بوجھ میرے سر پر اتنا پڑا ہے کہ سر جھکتے جھکتے آنکھیں دامن سے چپک گئی ہیں۔ اب تار دامن اور تار نظر میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ شاعر کا منشا یہ ہے کہ غم کے بوجھ سے سرنگوں ہو کر روتے ہیں اور دامن سے آنسو پوچھتے ہیں نہ رونا کم ہوتا ہے اور نہ دامن آنکھوں سے جدا ہوتا ہے۔

۲۔ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

پاس، لحاظ، خیال۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے زخموں کو اس لئے ٹانکے دلواتا ہوں کہ زخم میں سوئی کے چبھنے سے زیادہ درد ہو۔ لیکن بوقت رفو میری قوت برداشت، تمکنت اور سکون دیکھکر نادان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے اس کو درد کا احساس اور خیال ہی نہیں ہوتا

ورنہ کیا ممکن کہ زخم میں سوئی چھپائی جائے اور یہ ٹس سے مس نہ ہو۔ اس خیال کی تردید فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاسِ درد سے یہ دیوانہ غافل نہیں۔ ٹس سے مس نہ ہونا۔ یہ اپنی اپنی برداشت اور اپنے اپنے حوصلہ کا معاملہ ہے بعض معمولی تکلیف سے بلبلا اٹھتے ہیں اور بعض سخت سے سخت مصیبت کو خندہ پیشانی سے سہے جاتے ہیں۔

۳۔ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

فرماتے ہیں کہ معشوق جس چمن میں جاتا ہے۔ غنچۂ گل اسے دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔ غنچۂ گل کا چٹکنا ان کے خندۂ دل کی آواز ہے اور یہی ان کے خوش ہونے کی دلیل ہے۔

غزل نمبر ۱۴۳

۱۔ پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

پا بدامن ہونا: چلنے پھرنے سے باز آنا۔ صحرا نورد: صحرا میں گھومنے والا۔ آئینۂ زانو: چھپنی ---

فرماتے ہیں کہ میری حیرانی اور پریشانی مجھ کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی آئینہ زانو پر سر دھرے متفکر بیٹھا رہتا ہوں۔ گویا آئینہ زانوں کے جوہر کانٹے بنکر پاؤں میں چبھ گئے ہیں اور صحرا نوردی سے روکتے ہیں۔ مجھ جیسے صحرا نورد کا اس طرح بے بسی کے عالم میں بیٹھ جانا قابل رحم ہے۔

۲۔ دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ہے نگاہ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے

فرماتے ہیں کہ اے دوست ہم آغوشی کے وقت تیرا بال بال بھلا معلوم ہوتا ہے اور دل کی بے قراری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ یعنی نگاہ آشنا جس طرح دل میں چبھ کر دل کو تڑپا یا کرتی ہے۔ وہی دلفریبی ہم آغوشی کے وقت تیرے بال بال میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی نوکیں برچھی کی انی کی طرح دل کو چھیدتی ہیں۔ اختلاط کے وقت کی کیفیت ظاہر فرمائی جا رہی ہے۔

۳۔ ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

سازِ آہنگِ شکایت: وہ باجا جس سے شکایت کے راگ نکلیں۔ گراموفون کا ریکارڈ جس میں شکایتوں کا راگ بھرا ہو۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست میرا دل تیری شکایتوں سے لبریز ہے جہاں کسی دن

ذرا چھیڑا اور ہم پھوٹ پڑے۔ اس لئے لوگوں میں تو مجھ کو مت چھیڑ اگر چھیڑیگا ہم تو بھرے بیٹھے ہیں خود بخود شکایتوں کا سلسلہ جاری ہو جائیگا اور تیری رسوائی ہوگی۔

غزل نمبر ۴۴

۱۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے ۔۔۔ جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آئے

کالبد: جسم۔ صورت دیوار: دیوار کے نقش و نگار، تصویر دیوار۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست جس محفل میں تو ناز سے بات چیت کرنے لگے تو گفتار کی شیرینی اور اس کے اثر جان نوازی سے جاندار تو رقص کرنے ہی لگیں گے۔ بے جان تصویروں میں بھی جان پڑ جائے گی۔

۲۔ سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو صنوبر ۔۔۔ تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرا قد ایسا دلکش و بلند و بالا ہے کہ سرو صنوبر بھی اس کو دیکھیں تو فریفتہ و غلام ہو جائیں اور سایہ کی طرح تیرے جلو میں چلنے لگیں۔

۳۔ تب ناز گرانمایگی اشک بجا ہے ۔۔۔ جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آئے

گرانمایگی: قیمتی ہونا۔ فرماتے ہیں کہ اشک اس وقت اپنی گراں مایگی اور بیش قدری پر فخر کرسکتا ہے جبکہ جگر کے ٹکڑے بھی اس کے ساتھ شامل ہو کر دیدۂ خونبار سے ٹپکیں۔ ورنہ صرف سادہ آنسو تو قابل قدر نہیں۔

۴۔ دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر ۔۔۔ کچھ تجکو مزہ بھی مرے آزار میں آئے

فرماتے ہیں کہ اے ظالم تو ظلم کرتا ہے اور آہ و فریاد کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم خاموشی کے ساتھ تیرے ستم برداشت کئے جاتے ہیں۔ ہم کو تو مزہ آتا ہے لیکن تو اس لطف سے محروم ہے۔ اس لئے مجکو شکایت کی اجازت دے تاکہ میری فریاد، آہ و زاری اور تڑپ دیکھکر تجھ کو بھی کچھ مزہ آئے کہ تیرے ستم یعنے نیم نگاہی، ناز و ادا نے کیسا اثر کیا ہے۔

۵۔ اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ ۔۔۔ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

فرماتے ہیں کہ اگر معشوق آئنہ دیکھتے دیکھتے آنکھ کا اشارہ کر دے تو آئنہ بھی بولنے لگ جائے

اس لئے اس کی آنکھوں میں جادو بھرا ہوا ہے اور جادو کے زور سے مافوق العادات حرکات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ طوطی آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر بولتا ہے۔ اگر طوطی کی طرح آئینہ بھی بات کرنے لگے تو یہ چشم فسوں گر کا اثر ہے۔

۶۔ کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ‌‌‌ اک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آئے

فرماتے ہیں کہ کانٹوں کی زبان پیاس سے سوکھ گئی ہے اب ضرورت ہیکہ کوئی دیوانہ صحرانوردی کرتے ہوئے اس پُرخار وادی میں آجائے تاکہ اس کے پاؤں کے آبلوں کے پانی سے کانٹوں کی زبان تر ہو اور تشنگی جاتی رہے۔

۷۔ مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک ‌‌‌ آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آئے

حلقہ زنار اور خم آغوش میں مشابہت ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ جب میں اس نازنین کے جسم پر زنار دیکھتا ہوں تو رشک سے جل کر مر جاتا ہوں۔ رشک اس بات کا ہوتا ہے کہ میرے خم آغوش کی بجائے وہ تنِ نازک زنار کے آغوش میں ہے۔

۸۔ غارتگرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر ‌‌‌ کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

فرماتے ہیں کہ زر کی خواہش عزت و ناموس کو برباد کرنے والی ہے۔ چنانچہ شاہدانِ بازاری اسی ہوس میں گھر سے نکلکر عصمت فروشی کرتے ہیں۔ اس خیال کو ایک لاجواب تمثیل سے اس طرح واضح فرماتے ہیں گل ہوس زر میں باغ سے بازار میں آتا ہے اگر زر کا لالچ نہ ہو تو وہ باغ ہی میں رہے اور بازار میں آکر ذلیل نہ ہو۔

حاصل شعر یہ ہیکہ دولت کی ہوس جس کو ہوتی ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔

۹۔ تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں ‌‌‌ جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آئے

فرماتے ہیں کہ خالی گریباں چاک کرنے میں کوئی لطف نہیں ہے۔ مزہ تو جب آئیگا کہ گریباں کے ہر تار میں ایک تار نفس بھی الجھا ہوا ہو۔ ایسی حالت میں جب گریباں چاک کیا جائیگا تو تارہائے گریباں کیساتھ تارہائے نفس بھی ٹوٹ جائیں گے اور ہمارے آلام زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا

۱۰۔ آتشکدہ ہے سینہ میرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

ایک پوشیدہ راز کو چھپائے ہوئے ہوں جس کی گرمی سے سینہ آتشکدہ بنا ہوا ہے مگر اس راز کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ جس بار کو پہاڑ نہ اٹھا سکے دوسرا کون اٹھائے یہ صرف عاشقوں کا سینہ ہے جو اس آگ کا متحمل ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

گنجینہ: خزانہ۔ طلسم: جادو کی ایسی عمارت جس میں داخل ہونے کے بعد باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نہایت بیش قیمت اور نایاب خزانوں کی حفاظت کیلئے طلسم باندھا جاتا تھا۔ تاکہ یہ خزانے کسی کے ہاتھ نہ لگیں۔ فرماتے ہیں کہ میرا ہر شعر معانی کا بیش بہا گنجینہ ہے جسکی حفاظت کے لئے میں نے الفاظ کا طلسم باندھا ہے۔ میرے کلام کا ہر لفظ ایک طلسم ہے۔ گنجینۂ معانی کا متلاشی اسی طلسم میں پھنس جاتا ہے مگر گنجِ معانی تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔

غالباً یہ ان حضرات معاصرین کا جواب ہے جو استاد کے کلام کو بوجہ اس کی پیچیدگیوں کے یا تو پسند نہیں کرتے تھے یا بغیر سمجھنے کی کوشش کئے مہمل قرار دیتے تھے۔

غزل نمبر ۴۵

۱۔ حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بہ ہنگامِ کمال: بدر ہونے کی حالت میں۔ مہِ خورشید جمال: معشوق جو حسن میں خورشید کے مثل ہو۔

فرماتے ہیں کہ اگرچہ چودھویں رات کا چاند بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس سے میرا خورشید جمال معشوق زیادہ خوبصورت ہے۔ حضرت حالیؔ نے یادگارِ غالب میں منتخب اشعار میں اس شعر کو بھی لیا ہے اور اس کے متعلق لکھتے ہیں: "دوسرے مصرعہ میں دعویٰ متضمن دلیل ہے معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اس کو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

۲۔ بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

مطلب یہ کہ دل کی قیمت ایک بوسہ ہے۔ تو دیں اور دل لیں۔ مگر معشوق بغیر قیمت ادا کئے دل لینا چاہتا ہے۔

۳ ۔ جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے   اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

فرماتے ہیں کہ اگر جام سفال ٹوٹ جائے تو شراب نوشی میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی بازار میں بکثرت اور بہت ارزاں ملتے ہیں جتنے چاہیں لے آئے ۔ مگر جام جم کا بدل دنیا میں نہیں اگر وہ ٹوٹ جائے تو شراب نوشی ہی ترک ہو جائے اس لئے جام جم سے ۔ جام سفال اچھا ہے ۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں جہاں تخیل یا امیجنیشن سے بحث کی ہے اس شعر کو اور اسی غزل کے اور ایک شعر کو بطور مثال پیش فرمایا ہے تحریر فرماتے ہیں : ۔

" شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا ۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جسکی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فایق اور افضل سمجھا جاسکے ۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزہ میں بھی شراب پی جاسکتی ہے ۔ اب قوت متخیلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک لفریب پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا کہ زبان اس کو پڑھکر متلذذ اور کان اس کو سنکر محظوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے ۔ اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہنکر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اس کا نام شعر ہے ۔ نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلیٰ درجہ کا واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے ۔ "

۴ ۔ بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

یعنی سوال کرنے اور مانگنے میں ذلت ہے پس جو چیز ذلت کیساتھ حاصل ہو اس میں مزہ کہاں

لطف اس میں ہے کہ بغیر طلب کیے کوئی چیز مل جائے۔ لہٰذا جس فقیر کو سوال کی عادت نہ ہو وہ اچھا ہے۔ اس شعر میں دین کا فاعل خالق و مخلوق دونوں ہو سکتے ہیں۔

۵۔ ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شعر صاف ہے محتاج تشریح نہیں۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس شعر کے متعلق لکھا ہے کہ:۔ اسی کے قریب قریب سعدیؒ کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں "گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو گویم ؏ چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی" دونوں کا حصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدیؒ کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہرا بدحالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے کیوں کہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے۔ نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا باایں ہمہ سعدی کے شعر کو ہر حال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیونکہ الفضل للمتقدم"۔ اس کے علاوہ مقدمہ شعر و شاعری میں امیجنیشن یا تخیل کی بحث کے ضمن میں اس شعر کو بھی بطور مثال پیش فرمایا ہے۔

" شاعر کو پہلے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالت زار اور اس کی جدائی کا صدمہ نہ جتائے۔ دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض خوشی سے دفعتاً ایسی بشاشت ہو سکتی ہے کہ رنج اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے۔ اب امیجنیشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اس وقت معشوق نہیں ہوتا۔ اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں رہتی اس مثال میں بھی امیجنیشن کا عمل معناً و لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحب ذوق سلیم پر ظاہر ہے۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

۶۔ دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

برہمن: یہاں اس سے مراد جوتشی ہے۔ " گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا دبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ " (از یادگار غالب)

لیکن ہمکو اس شعر میں عاشق کے استغراق کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ ہر شخص اپنے مطلب کی سوچیگا۔ کسان کھیتی سے متعلق۔ تاجر اپنے کاروبار کی نسبت اور عاشق معشوق سے خوش آیند توقعات وابستہ کریگا۔

ہماری رائے میں پہلا مصرع استفہام انکاری ہے یعنے عشاق بتوں سے کوئی فیض نہیں پائیں گے۔ باوصف اس کے کہ سال کے مبارک ہونے کی پیشنگوئی برہمن نے کی ہے۔ اس لئے عشاق ازلی بدقسمت ہوتے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں برہمن کی پیش گوئی پر طنز ہے۔

۷۔ ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا　　جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

فرہاد جو ایک باکمال سنگتراش تھا قصر شیریں کی تعمیر کے سلسلہ میں وہاں پہنچ سکا اور شیریں سے ہمکلام ہوا۔ اگر اس کو اپنے پیشہ میں کمال نہ ہوتا تو اس کی رسائی شیریں تک نہیں ہو سکتی تھی اس لئے پیشہ خواہ کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو اس میں بھی کمال حاصل ہونا فائدے سے خالی نہیں۔

۸۔ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

مآل: نتیجہ۔ فرماتے ہیں کہ جس کام کا نتیجہ اچھا ہو وہ کام اچھا ہے۔ سب سے اچھا کام وہ ہے جو انسان کو ادنیٰ درجے سے انتہائی اعلیٰ درجہ تک پہنچا دے۔ لہٰذا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا اور اس میں واصل ہونا سب سے بڑا کام ہے۔ دیکھو قطرہ کسقدر بے بضاعت ہے لیکن جب وہ اپنے آپ کو فنا کرتا ہے تو دریا بن جاتا ہے۔ پس تم بھی فنا ہو کر دریا بن جاؤ۔ اس سے زیادہ نتیجہ خیز اور کوئی کام نہیں۔

۹۔ خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

خضر سلطان: بہادر شاہ ظفر کے ایک صاحبزادے کا نام۔ تازہ نہال: نونہال۔ دعا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ کے صاحبزادے شہزادہ خضر سلطان کو تندرست و شاد رکھے۔

۱۰۔ ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

حقیقت: اصلیت، حال۔ مطلب یہ ہے کہ جنت کی حقیقت سے ہم واقف ہیں یعنی یہ صرف ایک خیالی باغ ہے اور اس کے متعلق جو جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ دل بہلانے کے افسانے ہیں۔ استاد نے جابجا شوخیاں برتی ہیں۔

نوٹ: ۔ یادگارِ غالبؔ اور فرہنگ آصفیہ میں "دل کے خوش رکھنے کو" ہے اور بعض نسخوں میں "دل کے بہلانے کو"

غزل نمبر ۱۳۶

۱۔ نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی　　امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

فرماتے ہیں کہ اے دوست آپ تمام عمر ہماری وفا کا امتحان سو سو طریقوں سے لیتے رہے۔ لیکن آپ کی تسلی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اسی امتحان میں ہم نے جان بھی دے دی اگر اس پر بھی آپ کی تشفی نہیں ہوئی اور آپ سمجھتے ہیں کہ اور بھی کچھ امتحان باقی رہ گئے ہیں۔ تو اچھا یوں ہی سہی۔ اس آخری امتحان کو بھی جانے دیجئے۔ اب جو امتحان باقی رہ گئے ہیں میری نعش پر کر لیجئے۔

۲۔ خارخارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے　　شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

خارخارِ الم حسرتِ دیدار: حسرت دیدار کی تکلیف۔ گلچین گلستان تسلی۔ تسلی کو باغ فرض کیا ہے اس لئے مطلب ہوا تسلی کے پھول چننے والا یعنی جسکو تسلی حاصل ہو۔ فرماتے ہیں کہ اگر ہمارے شوق دیدار کو تسلی نہیں ہوئی یعنی دوست کے دیدار سے وہ لطف اندوز نہ ہوسکا تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ حسرت دیدار کا غم تو ہے۔ یہ کھٹک اس کے تصور اور اس کی یاد کے لئے کافی ہے ع گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ اس مصرعہ میں جو خیال ہے اسی کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔

۳۔ مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے　　ایکدن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

یعنے شراب عام طور پر ساغر میں بھر بھر کر ساقی دیا کرتا ہے۔ اگر کسی روز اتفاق سے ساقی نہ آئے تو کیا مے نوشی بھی ملتوی رہے۔ مے پرستوں سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مے پرستوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ آئیں کوزہ و ساغر کو چھوڑ کر خم سے کو ہی منہ سے لگالیں اور ڈگڈ گا کر خم کا خم پی ڈالیں۔ بزم میں ساقی نہ ہو تو کیا ہرج ہے۔ اس کا نہ ہونا ہی ہمارے لئے سود مند ہے کہ جی بھر کر پی لیں گے۔ ساقی ہوتا تو ساغر سے ناپ ناپ کر تھوڑی سی شراب دیتا۔

۴۔ نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا گر نہیں شمعِ سیاہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

فرماتے ہیں کہ قیس کے نفس شعلہ بار سے بیابان کا بیابان روشن اور آباد ہے یعنی فیض نفس پورے صحرا پر محیط ہے۔ اگر قیس لیلیٰ کے خیمے میں رہتا تو صرف چند گز زمین منور ہو سکتی تھی لہٰذا اگر قیس لیلے کے سیاہ خیمہ میں نہیں ہے تو اس میں کوئی نقصان نہیں اس کے دم سے چند گز زمین کے بجائے پورا صحرا فیض یاب ہو رہا ہے۔

۵۔ ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

فرماتے ہیں کہ گھر کی آبادی اور رونق لوگوں کے جمع ہونے پر ہے خواہ تقریب خوشی ہو خواہ غم کے موقع پر ان دونوں صورتوں میں دھوم دھام رہتی ہے۔ ہم کو تو غرض اسی دھوم دھام کی رونق سے ہے لہٰذا اگر خوشی کا نغمہ نہیں سن سکتے مضایقہ نہیں ماتم کا شور ہی سہی۔ اس میں کیا قباحت ہے اصل مدعا تو حاصل ہو جاتا ہے۔

۶۔ نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ستایش: تعریف۔ صلہ: معاوضہ انعام۔ یہ شعر ان معاصرین کا جواب ہے جو حضرت غالب کے ادق اشعار سے دق ہو کر بعض وقت مہمل کہہ دیا کرتے تھے۔ کسی قدر ناراض ہو کر فرماتے ہیں کہ: میں کسی سے اپنے کلام کی داد چاہتا ہوں نہ کسی قسم کا صلہ اگر میرے اشعار مہمل ہیں ہوا کریں اوروں کو اس سے کیا مطلب بلا وجہ کیوں نام رکھیں۔ ہاں اگر میں ان سے اپنے کلام کی داد چاہتا تو ان کا اعتراض کرنا حق بجانب ہوتا۔

۷۔ عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو ‏ ‏ نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

طبیعی: طبعی، فطری، سرشتی عمر کا طبیعی ہونا: انسان کا فطری طور پر معمولاً ایک خاص عمر کو پہنچنا۔

اس شعر میں استاد نے بڑی سی رندانہ شوخی رکھی ہے۔ یعنی نوجوانی میں اگر انسان عیاشی سے احتراز کرے اور با احتیاط زندگی گذارے تو عمر طبیعی کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس بے احتیاطی اور عاقبت اندیشی سے اپنی توانائیاں زائل کرتا رہے تو موت قبل از وقت آجاتی ہے۔ یعنی طبیعی عمر کو پہنچنے سے پہلے مرجاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی صحبت کا لطف، درازی عمر کے مزے سے زیادہ ہے جو بھی وقت ان کی صحبت اور عیش کوشی میں گزرے اسی کو غنیمت سمجھو۔ اس کی وجہ اگر عمر طبیعی نہ ہو اور قبل از وقت مرجائیں تو کوئی ہرج نہیں۔ (لیکن یہ ہدایت صرف غالبؔ کیلئے ہے اوروں کے لئے نہیں)

غزل نمبر ۱۴۷

۱۔ عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے ‏ ‏ کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نشاط: خوشی۔ فرماتے ہیں کہ سر کٹانے کا شوق اس درجہ ہے کہ مقتل کو جلاد سے آگے دوڑے جاتے ہیں اور خوشی کا یہ عالم ہے کہ سر کا سایہ پاؤں سے دو قدم آگے ہے۔

یا

یہ کہ جاتے ہوئے سورج سامنے ہے اور سایہ پیچھے پڑ رہا ہے اس صورت میں بھی سر پاؤں اور قد کے سایہ سے دو قدم آگے ہی رہتا ہے۔

۲۔ قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت ‏ ‏ فقط خراب لکھا بس چل سکا قلم آگے

قضا: حکم خدا، وہ حکم جو روز ازل جملہ کائنات کے لئے لکھ دیا گیا ہے، مشیت ایزدی۔

فرماتے ہیں کہ میرے متعلق مشیت ایزدی تو یہ تھی کہ شراب محبت سے سرشار رہوں لیکن روز ازل جب سرنوشت لکھی گئی دست قضا نے صرف لفظ "خراب" لکھا تھا کہ قلم رک گیا "بادہ الفت" نہ لکھا جا سکا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقدر میں صرف خرابی ہی خرابی ہے۔ بادہ الفت کی مسرت نصیب نہیں۔

۳۔ غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی — وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

جھاڑی : دور کردی ۔ لذتِ الم : لذتِ عشق یا انتظارِ معشوق ۔ فرماتے ہیں کہ جبتک غمِ روزگار سے آزاد تھے یعنی گھر بار کی ذمہ داریاں نہ پڑی تھیں، فکرِ معاش سے بے نیاز تھے عشق بازی کا مشغلہ تھا اور اسی نشاط میں مست رہتے تھے لیکن غمِ روزگار نے یہ مستی سر سے اتار دی ۔ اب نشاطِ عشق ہے اور نہ لذتِ انتظارِ معشوق ہے صرف دنیا کا جنجال ہی جنجال ہے ۔

۴۔ خدا کے واسطے داد اس جنونِ عشق کی دینا — کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

فرماتے ہیں کہ ہمارے جنونِ عشق کو دیکھئے کہ نامہ بر کو خط حوالہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے جواب کا انتظار بے چین کر دیتا ہے ۔ اور اس خیال سے گھر سے نکل پڑتے ہیں کہ راستہ ہی میں نامہ بر سے جواب حاصل کرلیں ۔ اس بے اختیاری کی حالت میں نامہ بر کا رستہ دیکھتے دیکھتے معشوق کے در پر نامہ بر سے پہلے پہنچ جاتے ہیں ۔ دیوانگی اور جنون کی اس سے بڑھکر اور کوئی مثال نہ ہوگی ۔

۵۔ یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے — تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

تمہارے آگے آئیو : تم کو بھی ایسی پریشانیاں لاحق ہوں ۔ طرہ ہائے خم بہ خم ۔ زلفہائے پیچ در پیچ ۔

استاد نے اس شعر میں بھی غضب کی شوخی برتی ہے ۔ بجائے معشوق کے اس کے زلفوں کو مخاطب فرماتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق نے ہمکو جتنا پریشان کیا ہے لوگ بھی اس کو ایسا ہی ستائیں اور چھیڑیں کہ ہاتھا پائی میں گیسوؤں کے شکن کھل کر بال پریشان ہو جائیں ۔

۶۔ دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے — ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

زعم : گمان، خیال ۔ فرماتے ہیں کہ جو خون کی موج دل و جگر میں متحرک تھی غلطی سے ہم نے اسی کو دم سمجھ رکھا تھا ۔ مطلب یہ ہے کہ نفس (دم) موجبِ انبساط و فرحت اور ممدِ حیات ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے برعکس ہمارا دم باعثِ حزن و ملال اور جان لیوا ثابت ہوا ۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ جس کو ہم نے دم خیال کیا تھا ۔ وہ درحقیقت دل و جگر کے موجِ خون کی پرافشانی ہے ۔ ہمارے غم و اندوہ کا یہی سبب ہے ۔

۷۔ قسم جنازہ پہ آنےکی مرے کھاتے ہیں غالبؔ — ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو پہلے خلوص و محبت کا دعویٰ کرتے تھے اور بات بات پر میری جان کی قسم کھاتے تھے اب میرے جنازہ پر آنا بھی پسند نہیں کرتے۔ زمانہ اور اہل زمانہ کی بے وفائی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

غزل نمبر ۸۴

۱۔ شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے — یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلا ہوتا ہے

پہلا مصرعہ ایک مستقل شکوہ ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ تو یہ بھی مت کہہ اس لئے کہ یہ بھی ایک گلہ ہی تو ہے۔

۲۔ پر ہوں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

چھیڑنا: تاروں کو حرکت دینا، چھیڑ خانی کرنا۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح باجے میں راگ پوشیدہ ہوتے ہیں اور تاروں کو چھیڑنے سے نکلنے لگتے ہیں۔ میرے سینہ میں بھی صدہا شکوے بھرے ہیں اگر کوئی مجھ کو ذرا سا چھیڑ دے تو پھر شکوہ شکایت کا ایک ہنگامہ برپا ہو جائیگا۔

۳۔ گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو — شکوہ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

حسنِ تلافی: اچھی پاداش، نیک صلہ۔ اس شعر میں اس لفظ کے دو مفہوم رکھے ہیں۔ ایک تو طنز دوسرے طرب۔ طنز اس لئے کہ معشوق سے شکوہ جور کرتے ہیں تو اور بھی ظلم کرتا ہے۔ کیا اچھی تلافی ہے؟ طرب کا پہلو یہ ہے کہ ہم شکوہ جور محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور زیادہ کرے ہمارے اس منشا کو نہیں سمجھتا اور ظلم کئے جاتا ہے۔ ہم کو اس کے ظلم میں لطف آتا ہے ہمارے حق میں یہی حسن تلافی ہے۔

۴۔ عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال — سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

چرخ مکوکب: تاروں بھرا آسمان۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے معاملوں میں دن کے وقت آسمان جلد جلد گردش کرتا ہے اس لئے وقت جلد اور آسانی سے گزر جاتا ہے لیکن عشق کی راہ میں رات کے وقت اس کی چال بڑی سست ہو جاتی ہے۔ تارے گویا اس کے پاؤں کے آبلے بن جاتے ہیں

اس لئے شبِ ہجر کاٹے نہیں کٹتی ۔

۵۔ کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم — آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہدف : نشانہ ۔ ناوک بیداد : تیر ستم ۔ فرماتے ہیں کہ معشوق اگر ہماری طرف توجہ کرے اور غصہ سے ہمکو گھور کر نہ دیکھے تو ہم خود ایسے اسباب پیدا کرتے ہیں کہ وہ تند و تیز نظر سے دیکھے ۔ یعنی اس کو چھیڑ کر عتاب مول لیتے ہیں ۔

۶۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

خوب تھا : اچھا تھا ۔ بدخواہ : برا چاہنے والا ۔ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے متعلق جس قدر بھلائی چاہتے ہیں اتنی ہی برائی درپیش آتی ہے گویا ہماری چاہت اور خواہش کا اثر الٹا ہے اگر یہ بات پہلے ہی معلوم ہو جاتی تو اچھا ہوتا تاکہ ہم اپنی برائی چاہتے اور نتیجہ بھلائی ہوتا ۔

۷۔ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

فرماتے ہیں کہ پہلے وہ دم خم اور تاب و تواں تھا کہ نالہ کی پرواز عرش سے بھی پرے ہوتی تھی یا اب اضمحلال اور نقاہت کا یہ عالم ہے کہ آہ بڑی مشکل سے لبوں تک آتی ہے ورنہ سینے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے ۔

قطعہ

۸۔ خامہ میرا کہ ہے بار بد بزم سخن — شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

۹۔ اے شہنشاہ کواکب سپاہ و مہر علم — تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

۱۰۔ سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

۱۱۔ ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

۱۲۔ میں جو گستاخ ہوں آئین غزلخوانی میں — یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

اوپر کے پانچ شعر قطعہ بند بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے گئے ہیں ۔ ان میں کوئی ترکیب یا خیال مشکل نہیں ہے اس لئے ہم صرف مشکل الفاظ کے معانی اور قطعہ کا خلاصہ مختصراً درج کرتے ہیں ۔

باربد : ایک باکمال مشہور گویے کا نام جو خسرو پرویز کا مقرب تھا۔ کواکب سپاہ : ایسا بادشاہ جس کے پاس اتنی فوج ہو جتنی کہ آسمان پر تارے یعنی بے شمار۔ مہر علم : جس کا پرچم سورج کی طرح تابناک ہو۔ اکرام بخشش حاصل : مالگزاری۔ نعل بہا : فوج کے گھوڑوں کی نعلبندی کا خرچ۔ ناصیہ ساہونا : پیشانی رگڑنا۔ گستاخ : بیباک۔ ذوق فزا : محرک، شوق بڑھانے والا۔ فرماتے ہیں کہ اب میرا قلم بادشاہ کی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ۔ اے شہنشاہ تیری فوج تاروں کی طرح ان گنت، تیرا علم سورج کی مانند درخشاں ہے، تیری بخشش و عطا بے پایاں ہے جس کا کوئی حق ادا نہیں کر سکتا۔ ساری دنیا کے ملکوں کا محاصل بھی اگر اکٹھا کیا جائے تو تیری فوج کے گھوڑوں کی نعلبندی میں صرف ہو جائے۔ بدر گھٹتے گھٹتے جو ہلال ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے آستان پر پیشانی گھستا ہے۔ گھستے گھستے ہلال ہو جاتا ہے۔ میں جو غزل کے آئین کے خلاف اس سے قصیدہ کا کام لے رہا ہوں یہ ایک قسم کی غلطی و گستاخی ہے مگر اس گستاخی پر اکسانے والا تیرا لطف و کرم ہی ہے۔ ورنہ میری کیا مجال جو اس بارگاہ فلک پایہ گاہ میں زبان کھول سکوں۔

۱۳۔ رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ~~درد نوائی~~   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

تلخ نوائی : شیریں بیانی کی ضد یعنی ایسی آواز یا راگ جس میں تلخی ہو۔ سوا : زیادہ۔ قاعدہ ہے کہ انسان کا دل اگر خوش رہے اس کے بیان میں بھی خوشی اور شیرینی ہوگی۔ اس کے برخلاف تکلیف و بے چینی ہو۔ بیان میں بھی اس کا اثر ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ اے غالب آج اگر میرے بیان میں تلخی اور بے لطفی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں زیادہ درد ہو رہا ہے ورنہ فطرۃً میں تلخ نوا نہیں ہوں اس لئے اس تلخی سے درگزر کر۔

(نوٹ) عود ہندی میں حضرت غالب کا ایک خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ اسی شعر سے شروع ہوتا ہے مگر مصرعہ اولیٰ یوں ہے کہ۔ رکھیو غالب مجھے اس درد نوائی میں معاف۔

غزل نمبر ۴۹

۱۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

شعر صاف ہے۔ کوئی لفظ اسمیں مشکل نہیں معشوق سے مخاطب ہیں اور اپنے متعلق اس سے کچھ عرض کر رہے ہیں۔ وہ تندخو ان کی بات خاطر میں نہیں لاتا اور جھنجھلا کر کہتا ہے کہ "تو کیا ہے" یعنی تیری حقیقت کیا ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک وقت یا ایک بات پر نہیں بلکہ ہر وقت معشوق کا انداز تکلم یہی ہے اس پر کچھ ناراض سے ہو کر کہتے ہیں کہ تبلائے آپ کی گفتگو کا یہ کیا طریقہ ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ہم تو مودبانہ عرض معروض کرتے ہیں مگر آپ تہذیب و شائستگی سے ہٹ کر ہماری تذلیل کیا کرتے ہیں جو مناسب نہیں

۲۔ نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا ۔۔۔ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے

اس شعر کا تعلق بھی پہلے شعر سے ہے معشوق بجائے اس کے کہ ان کے سوال کا جواب دے برہم ہو کر ناز و ادا سے رخ پھیر لیتا ہے۔ اس پر حاضرین محفل کو مخاطب کرکے بے بسی اور حیرت کے لہجہ میں فرماتے ہیں کہ یہ کیا انداز ہے کوئی معقول جواب دینے کی بجائے تندی و تیزی اور بے رخی کا اظہار فرمایا جارہا ہے۔ نہ شعلہ میں ایسی تندی اور نہ برق میں ایسی تیزی۔ نہ شعلہ کہہ سکتے ہیں نہ برق۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کو آخر کہیں تو کیا کہیں اب آپ ہی تبلائے کہ وہ شوخ بدمزاج ہے کیا چیز۔

۳۔ یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۔۔۔ وگرنہ خوف بدآموزی عدو کیا ہے

بدآموزی: سکھانا، بجھانا، بہکانا۔ فرماتے ہیں کہ رقیب پر میرے جلنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ تم کو بہکائے گا یا میری چغلی کھائے گا۔ کیونکہ جب تم کو مجھ جیسے سچے عاشق کی بات کا اعتبار نہیں تو اس جھوٹے کی بات کا کیوں یقین کرنے چلے۔ لہٰذا اس کی لگائی بجھائی کا ڈر نہیں البتہ اس کا تم سے ہمکلام ہونا غضب ہے۔ یہ ہم سے دیکھا نہیں جاسکتا اور جل کر کباب ہوئے جاتے ہیں۔

۴۔ چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۔۔۔ ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

فرماتے ہیں کہ جوش جنوں میں ہم نے گریباں چاک کر لیا تھا اس کے بعد لونڈوں نے سنگ باری کی جس کی وجہ سر زخمی ہو گیا اور اتنا خون بہا کہ پیراہن تر ہو کر جسم سے چپک گیا چلو اچھا ہی ہوا اب چاک شدہ گریبان کو رفو کی حاجت باقی نہیں رہی۔

۵۔ جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۔۔۔ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست عشق کی آگ سے میرا پورا وجود جل کر راکھ ہو گیا ہے غالباً جسم کے ساتھ دل بھی جل گیا ہوگا۔ اب تم راکھ کرید کرید کر کس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو؟ لفظ "ہوگا" سے عاشق کی اپنے دل سے بے خبری ظاہر ہوتی ہے یعنی اس کو شک ہے کہ جسم میں دل تھا بھی کہ نہیں بے خودی اور وارفتگی کی اس کے آگے کوئی حد نہیں۔

۶۔ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

یعنی ہر شخص کہتا ہے کہ ہمارے جسم میں خون ہے اور رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہم اس کے قائل نہیں تمہاری رگوں میں خون ہے۔ خون کی بجائے کوئی اور چیز ہوگی اگر خون ہوتا تو ہماری طرح آنکھوں سے ٹپکتا۔ جو لہو آنکھوں سے نہ ٹپکے وہ ہیچ ہے۔

۷۔ وہ چیز جس کیلئے ہمکو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

بادہ گلفام: سرخ رنگ کی شراب۔ فرماتے ہیں سنا جاتا ہے کہ جنت میں شراب طہور کے حوض کے حوض بھرے ہوں گے محض اس لئے ہم کو جنت عزیز ہے۔ اس کی دوسری دلفریبیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

۸۔ پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

خم: بڑا مٹکا۔ قدح: بڑا پیالہ۔ سبو: ٹھلیا۔ فرماتے ہیں کہ ہم بلا نوش ہیں ہماری پیاس تھوڑی سی شراب سے نہیں بجھتی۔ شیشہ و قدح و کوزہ وغیرہ کی حقیقت ہی کیا ہے اور ان میں کتنی شراب آئیگی ہاں دو چار خم ہوں تو نیت بھرے۔

۹۔ رہی نہ طاقت گفتار۔ اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

فرماتے ہیں کہ اول تو بات کرنے کی طاقت ہی نہیں جو اظہار آرزو کر سکیں۔ اور بفرض محال بات کرنے کی قوت ہو بھی تو اظہار آرزو سے کوئی فائدہ نہیں کس امید پر ہم کہیں کہ ہماری آرزو یہ ہے۔ ہاں آرزو بر آنے کی کچھ بھی توقع ہوتی تو اور بات تھی۔

۱۰۔ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

فرماتے ہیں کہ محض بادشاہ کی مصاحبت کی وجہ غالبؔ کو عزت نصیب ہوئی ورنہ اس سے

پہلے شہر میں اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اب بادشاہ کی مصاحبت پر ناز کرتا پھرتا ہے۔

غزل نمبر ۵۰

۱۔ میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مئے پئے ہوتے

چل نکلنا: حد سے بڑھ جانا۔ گستاخ ہونا چل پڑنا، چل کھڑا ہونا فرماتے ہیں کہ وہ شوخ تندخو جو بغیر کسی وجہ کے بات بات پر بگڑتا ہے تعجب ہے کہ میں اس کو چھیڑوں اور وہ خاموش رہے۔ خیر گزری کہ وہ شراب پئے ہوئے نہ تھے اگر پئے ہوتے تو غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے۔

۲۔ قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

مطلب یہ ہے کہ معشوق بہ اعتبار تندخوئی و بدمزاجی قہر و بلا ہی سہی۔ ہم اس کے جور و ستم بخوشی اٹھائیں گے۔ مگر ہم سے رشک کی تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی ہم کو یہ گوارا نہیں کہ اس کے قہر کا کوئی دوسرا بھی حصہ دار ہو۔ لہٰذا ہماری آرزو یہ ہے کہ وہ آفت کا ٹکڑا بس ہمارا ہی ہو رہے۔

۳۔ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دئے ہوتے

فرماتے ہیں کہ اے پروردگار جب آپ نے میری قسمت میں اس قدر زیادہ غم لکھ دئے ہیں تو اس کے ساتھ دل بھی ایک سے زیادہ دئے ہوتے اس لئے کہ ایک دل اتنے غموں کو تنہا برداشت نہیں کر سکتا

۴۔ آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

راہ پر آجانا: ٹھیک ہو جانا، ہمارے حسب مرضی ہو جانا۔ فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ تم نے مرنے میں جلدی کی اگر اور کچھ عرصہ زندہ رہتے تو توقع تھی کہ معشوق رفتہ رفتہ رستہ پر آجاتا۔ مایوس ہو کر جو تم نے اپنی جان دیدی کچھ اچھا نہ ہوا۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ جب تک زندہ رہے اس کے ملنے کی کسی نے امید نہیں دلائی۔ ورنہ مایوسی سے جان کیوں دیتے۔ مرنے کے بعد امید دلائی جا رہی ہے اب مر نے کا غم علاوہ ستا رہا ہے۔ کاش ہم نہ مرے ہوتے۔ یعنی مرنے پر بھی سکون نصیب نہیں۔

غزل نمبر ۵۱

۱۔ غیر لیں محفل میں بوسے جام کے　　　ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فرماتے ہیں کہ رقیب تو آپ کی بزم طرب میں ساغر پر ساغر چڑھائیں اور افسوس ہے کہ ہم کو اس کی اطلاع تک نہیں دی جاتی کہ ایسی کوئی محفل منعقد ہو رہی ہے۔

۲۔ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ　　　ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

خستگی: تباہی، شکستہ حالی، رنج۔ ہتھکنڈے: ہاتھ کی چالاکیاں، شعبدے، بازیگری۔ چرخ نیلی فام: نیلے رنگ کا آسمان۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست ہماری شکستہ حالی اور رنج و اندوہ کا تم سے گلہ نہیں یہ بھی آسمان کی بازیگری ہے کہ ستاتا تو وہ خود ہے اور ہمکو نظر آتا ہے تمہارا ہاتھ یہ بھی ایک شعبدہ ہے۔

۳۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو　　　ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مطلب: لفافہ کے اندر کا مضمون۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست ہم تم کو مسلسل خط لکھتے رہیں گے اگرچہ لفافہ کے اندر کوئی مضمون نہ ہو۔ آپ یہ اعتراض فرمائیں گے کہ بغیر مضمون کے خط کا کیا مطلب یہ تو ایک دیوانگی ہے۔ آپ کا یہ ارشاد بجا ہے لیکن ہمکو مطلب اور مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہم تو آپ کے نام کے عاشق ہیں لفافہ پر آپ کا نام لکھا اور ہمارا مطلب پورا ہو گیا۔ بغیر کسی مضمون کے صرف عنوان پر آپ کا نام لکھ لکھکر خط بھیجا کریں گے۔

۴۔ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم　　　دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

استاد نے رندانہ شوخی سے کام لیا ہے۔ احرام باندھے ہوئے حج کو جا رہے ہیں۔ احرام باندھنے کے بعد کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب ظاہر ہے کہ بہت بری بات ہے اور پھر زمزم جیسے مقدس چشمے کے پاس بیٹھکر بحالت احرام شراب پینا اور بھی سخت گناہ۔ اس کے علاوہ جامۂ احرام کا شراب کے دھبوں سے نجس ہونا ایک طرفہ گناہ اور پھر ان دھبوں کو آب زمزم سے دھونا قیامت کا گناہ۔ غرض اس شان سے زیارت خانہ کعبہ کو تشریف لیجا رہے ہیں یہ سب باتیں اس سادگی سے بیان فرماتے ہیں کہ گویا اس میں کوئی قباحت کا پہلو ہی نہیں ہے۔

۵۔ دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

فرماتے ہیں کہ ہماری آنکھیں بھی تمہارے ہی جال کے دو حلقے ہیں۔ اس لئے ان پر یہ گلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ہو کر ہم سے دغا کی اور دل کو پھنسا دیا۔ ان حلقہ ہائے دام کا کام یہی ہے کہ وہ تمہارے لئے شکار فراہم کریں۔

۶۔ شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر   دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

دن پھرنا: قسمت جاگنا۔ فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے شفا پائی اور اب ان کے غسل صحت کی خبر شہر میں گرم ہے۔ اب دیکھئے حمام کی قسمت کس دن جاگے کہ بادشاہ غسل کیلئے اس میں داخل ہو۔

۷۔ عشق نے غالبؔ نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

فرماتے ہیں کہ عشقبازی نے نکما کر دیا ہے۔ اور جب تک ہم نے عشقبازی نہیں کی تھی توانائی محفوظ تھی ہر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

غزل نمبر ۵۲

یہ پوری غزل ایک قطعہ ہے جو بادشاہ کے غسل صحت کی مسرت میں لکھا گیا ہے۔

۱۔ پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

فرماتے ہیں کہ بادشاہ کی شفایابی کی خوشی صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز مسرور ہے۔ قدرت نے بھی اس تقریب کے لئے سامان طرب فراہم کر دیئے ہیں چنانچہ بہار کا موسم جو جا چکا تھا غسل صحت کی خوشیوں کو دوبالا کرنے پھر اس شان سے عود کر آیا ہے کہ چاند اور سورج بھی اس کو حیرت سے دیکھکر یہ کہہ رہے ہیں کہ۔

۲۔ "دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک   اس کو کہتے ہیں عالم آرائی"

اے دنیا کے بسنے والو دیکھو دنیا کی آرایش و زیبایش اس کا نام ہے یعنی تم (ساکنان خطۂ خاک) جو خوشی کی تقاریب میں اپنے گھروں محلوں اور شہروں کو سجایا کرتے ہو وہ سب ہیچ ہے۔ اصل آرایش تو یہ ہے جو قدرت نے کی ہے کہ سارا عالم گلزار ہو گیا ہے۔

۳۔ "کہ زمین ہو گئی ہے سر تا سر   روکش سطح چرخِ مینائی"

جملہ روئے زمین سبزہ و گل سے ایسی معمور ہو گئی ہے کہ خوبصورتی میں تاروں بھرے نیلگوں آسمان کا مقابلہ کر رہی ہے۔

۴۔ "سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا روئے آب پر کائی"

(اور بھی تماشا دیکھو) سبزہ کی فراوانی کا یہ عالم ہے جب اس کو زمین پر جگہ نہیں ملی تو پانی کی سطح پر کائی بن کر تیرنے لگا۔

۵۔ "سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے   چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی"

اس خوشی کے موقع پر قدرت کا کرشمہ دیکھنے کے قابل ہیکہ اس نے سبزہ و گل کی بہار دیکھنے کیلئے نابینا کو بھی بینا بنادیا ہے۔ نرگس ایک نور آنکھ تھی اب اس کو بھی بینائی عطا فرمائی گئی ہے۔

۶۔ "ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادپیمائی"

(اے ساکنانِ خطہ خاک) مستی و سرور کیلئے اب شراب پینا ایک فعل عبث ہے اس لئے کہ ہوا میں خود شراب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بغیر شراب نوشی کے ہی ہر شخص خوشی سے بدمست مخمور و مسرور ہو رہا ہے۔

(نوٹ) شعر نمبر ۲ تا ۶ میں مہر دماہ کی زبان سے بہار کی کیفیت بیان کیگئی ہے۔

مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں، ۔ یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس میں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا اور بادپیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے" (از یادگار غالب)

۷۔ کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ　　شاہِ دیندار نے شفا پائی

فرماتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز میں جو مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی ہے اس کا موجب بادشاہ کی شفایابی ہے۔

غزل نمبر ۵۳

۱۔ تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے　　اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

فرماتے ہیں کہ میں لوگوں کے تغافل کو پسند کرتا ہوں اس لئے کہ باوصف خاکساری عالی دماغ بھی ہوں۔ میری خودداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی التفات کرے یا نہ کرے میں اس کے پاس بیٹھا رہوں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی بے التفاتی و پہلو تہی کی میں اپنی نشست چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کی مہربانی اور توجہ فرمائی کے احسان سے بچ گیا۔ گویا لوگوں کا التفات نہ کرنا اور مجھ سے غفلت برتنا ہی اچھا ہے میری عالی دماغی کسی کا بار منت اٹھانا پسند نہیں کرتی۔

۲۔ رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے　　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

"یہ خیال کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو۔ مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر دنیا میں اہل ہمت کا وجود ہوتا تو جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے۔ اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت معدوم ہیں۔" (از یادگار غالبؔ)

غزل نمبر ۵۴

۱۔ کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

فرماتے ہیں کہ معشوق میری محبت کی داستان اور میرے رنج و غم کی کہانی دوسروں سے سننا پسند نہیں کرتا چہ جائے کہ مجھ کو سنانے کا موقع دے۔

۲۔ خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ   دیکھ خونابہ فشانی میری

غمزہ: نیم نگاہی، ناز۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرے غمزۂ خونریز کی خلش مجھ سے کیا پوچھتا ہے جس نے دل وجگر کو چھید دیا ہے بیان کرنے کی تاب و طاقت مجھ میں نہیں۔ میں جو خون کے آنسو بہاتا ہوں اس کو دیکھ اور تیرے غمزہ کی خون ریزی کا اندازہ اسی سے کر لے۔

۳۔ کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار   مگر آشفتہ بیانی میری

انتہائی خاکساری سے فرماتے ہیں کہ مجھ میں کوئی ایسا وصف نہیں کہ میرے مرنے کے بعد احباب اس کا بیان کرکے روئیں۔ ہاں ایک شاعری ہے جس کا بیان کرکے رو سکتے ہیں۔ مگر شاعری بھی کیا ہے رنگین نوائی تو نہیں بلکہ آشفتہ بیانی ہے۔

۴۔ ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال   بھول جانا ہے نشانی میری

بیدائے خیال: دشتِ خیال۔ فرماتے ہیں کہ میں خیالات کے میدان میں ایسا کھو سے جاتا ہوں کہ خود مجھے اپنے وجود کی خبر بھی نہیں ہوتی پھر لوگوں کو میرا پتہ کیسے ملے۔ اس لئے مجھ کو بھول جانا ہی میرا پتہ ہے یعنی جو شخص تمہیں یاد نہ آئے وہ میں ہی ہوں۔

۵۔ متقابل ہے مقابل میرا   رک گیا دیکھ روانی میری

ایک خط موسومہ مولوی عبدالرزاق شاکر میں خود استاد نے اس شعر کی یوں تشریح فرمائی ہے۔ "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم لفظ متقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہیں جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادت ضد ہو گئے ہیں وہ میری روانی دیکھ کر رک گیا (ماخوذ از عود ہندی)

۶۔ قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو۔ اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے۔ یعنی ہوں تو گرانقدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرانی کس قدر ارزانی ہے" (از یادگار غالب)

۷۔ گردبادِ رہِ بیتابی ہوں صرصرِ شوق ہے بانی میری

گرد باد ۔ بگولا ۔ صرصر ۔ آندھی ، تند و تیز ہوا ۔ یعنے جس طرح باد صرصر بگولے اٹھاتی ہے اسی طرح میرا شوق مجھ کو کو بکو پھراتا ہے ۔ بگولے کی طرح نہایت بیقراری کے ساتھ رہ عشق میں دوڑتا پھرتا ہوں۔

۸۔ دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچ مدانی میری

فرماتے ہیں کہ میں معشوق کا دہن معلوم نہ کر سکا یعنی دہن معشوق کا پتہ نہ چلا سکا اس لئے میری ہیچمدانی اور بے علمی کا حال سب پر ظاہر ہو گیا (لطف یہ ہے کہ معشوق کے دہن کو بھی ہیچ کہتے ہیں اسکو نہ پانے والا ہیچمدان ہے ۔ اور ہیچمدان کے دوسرے معنی کم علم اور جاہل کے بھی ہوتے ہیں)

۹۔ کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ ننگِ پیری ہے جوانی میری

فرماتے ہیں کہ بزمانہ جوانی ہی کمزوری کی وجہ سے میں ایسا معذور ولاچار ہو گیا ہوں کہ پیری کو میری جوانی دیکھکر ننگ و عار ہو رہا ہے ۔

غزل نمبر ۵۵

۱۔ نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

نقش ، تصویر ۔ طناز ، شوخ ، طرار ۔ مانی ، ایک مشہور رومی نقاش کا نام ہے جو جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتا اور نقاشی اپنا معجزہ قرار دیکر لوگوں کو بہکاتا تھا کتاب ارژنگ اسی کی تصنیف ہے ۔

مطلب یہ ہیکہ معشوق یوں بھی غیر معمولی حسین ہے اور پھر نازکی حالت میں اس کے حسن و دلفریبی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ۔ اس کے برخلاف رقیب اتنا ہی زشت رو اور بے ڈول ہے ۔ جب یہ ضدین ایک جگہ جمع ہو جائیں یعنی معشوق رقیب کی آغوش میں ہو تو اس حالت کی تصویر کھینچنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ خوبی اور زشتی دونوں رعایتیں نقش کشی میں ملحوظ رہیں ۔ شاعر کہتا ہیکہ معشوق کا حسن اور اس کی نزاکت ، ناز و انداز اس بات کا متقاضی ہیکہ مانی سا نقاش ہو دوسرا کوئی نقاش اس کی خوبی کا حق ادا نہیں کر سکتا اسیطرح رقیب کی زشت روئی ظاہر کرنے کے لئے پائے طاؤس کو قلم بنانا چاہیئے جو زشتی اور بدوضعی میں معروف ہے ۔

۲۔ تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے　　غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تحیر یا حیرت کا تقاضہ سکون و سکوت ہے۔ آشفتہ بیانی : پریشان بیانی ۔ یعنے معشوق ایسا بدخو ہے کہ ہماری حیرانی اور خاموشی کو تماشا سمجھتا ہے اور پسند کرتا ہے جب معشوق کو ہماری خاموشی پسند ہے تو گویائی ضرور ناپسند ہوگی اور جب ہم کچھ کہیں تو وہ بدمزاج بگڑ بیٹھے گا۔ ایک طرف معشوق کا یہ انداز ہے اور دوسری طرف ہمارے غم کی داستان طولانی ہے۔ بغیر آشفتہ بیانی کے وہ سر نہیں ہوسکتی ۔عجب حالت کشمکش و گومگو میں پھنسے ہوئے ہیں ۔

۳۔ وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع　　شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

وہ تپِ عشق تمنا ہے : ایسی سوزشِ محبت کی آرزو ہے ۔ صورتِ شمع : موم بتی کی طرح ۔ نبضِ جگر : رگِ جگر، کلیجے کی رگ ۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح موم بتی کا تار اس کے جگر یعنی اندرونی حصے سے ہوکر گزرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کو جلا دیتا ہے ۔میرا شعلۂ عشق بھی یہی چاہتا ہے کہ عشق کی حرارت کا سلسلہ جگر تک پہنچ جائے تاکہ دائمی سوزِ عشق حاصل ہو۔ پھر کا لفظ یہ اثر پیدا کر رہا ہے کہ پہلے بھی ایسی واردات گزری ہے جس کا چسکہ لگ گیا ہے۔ اس لئے پھر وہی تمنا ہے ۔

غزل نمبر ۵۶

۱۔ گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے　　ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست گلشن میں تیرا آنا اسکو بہت پسند آیا تجھکو دیکھکر ہر ایک کلی خوش ہوکر بغلگیری کے لئے اپنے آغوش کھول رہی ہے۔ یعنی غنچوں کا کھِل کر گل بننا آغوش کشائی ہے

۲۔ واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر　　یاں نالہ کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

کنگرہ : قلعوں کی فصیل یا شہر پناہ کے کٹے ہوئے طاقچے جو خوبصورتی کے لئے فصیل کی چوٹی پر بنائے جاتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی بے نیازی اور لاپروائی کا کنگرہ ہر آن بلند ہوتا ہے یعنی اس کے استغناء میں زیادتی ہورہی ہے اور ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہمارا نالہ اس کے استغنا کی بلندی تک پہنچ رہا ہے ۔مطلب صرف اس قدر ہے کہ معشوق کی لاپروائی میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے

اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہماری آہ و زاری سے وہ مہربان ہو جائیگا ۔

۳۔ ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط انداز کے — جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

فرماتے ہیں کہ غم عشق ہمکو مختلف طریقوں سے ضبط کی تعلیم دیتا ہے جو داغہائے غم ہمارے سینے میں نظر آتے ہیں وہ بلا سبب نہیں ہیں۔ ہر داغ ایک آنکھ بنا ہوا چشم نمائی کر رہا ہے یعنے اشارہ کر رہا ہے کہ ضبط آہ کئے جاؤ ۔

غزل نمبر ۵۷

۱۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھدیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ مجھ کو ایسا کاری زخم دے کہ نہ اس کو ٹانکے لگائے جا سکیں اور نہ وہ کبھی مندمل ہو ہمیشہ تازہ رہے۔ البتہ میرے دشمن کی قسمت میں معمولی سے زخم لکھے جائیں جن کا علاج با آسانی ہو سکے۔ مطلب یہ ہیکہ ہمکو دائمی سوز محبت چاہیئے جو دل سے کبھی دور نہو اور دشمنوں کو یہ بات نصیب نہ ہو ۔

۲۔ اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور — دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

" لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں اس لئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اسکی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے" (از یادگار غالب)

۳۔ کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی ہے — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

" بے حوصلگی یعنی کم ظرفی ۔ یاں سے مراد دنیا ۔ معشوق سے فرماتے ہیں کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جور و ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کرینگے کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو یہاں کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا " (از یادگار غالب)

۴۔ دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو — خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

۵۔ صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب — حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

فرماتے ہیں کہ اے غالب اس ناکام محبت کی حالت پر صد افسوس ہے جس کے جگر کی خبر گری دشنہ نے اور گلو کی مزاج پرسی خنجر نے نہ کی ہو اور جودت سے ایک عربدہ جو معشوق کی آرزو میں مر رہا ہو۔ مطلب اس قدر ہے کہ ایسے عاشق کی حالت پر افسوس ہے جو اک عمر گزر نے پر بھی معشوق کی مہربانی اور التفات سے محروم ہے۔

غزل نمبر ۵۸

۱۔ سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم   حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

سیماب: پارہ۔ پشت گرمی: اعانت۔ ایک طرف پارہ آئینہ کی اعانت کر کے اس میں جلا اور سکون پیدا کر دیتا ہے اور دوسری طرف اسی پارہ (دلِ بیقرار) نے ہمکو حیران و پریشان کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل جو سیماب صفت ہے بجائے سکون و جلا بخشنے کے حیرانی اور پریشانی کا موجب ہوا ہے۔

۲۔ آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے   اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

فرماتے ہیں کہ موسم بہار میں گلوں کا کھلنا درحقیقت بلبل سے گلے ملنے کے لئے آغوش کشائی ہے۔ یعنی گل بلبل سے رخصت ہونے کے لئے آغوش کھول رہا ہے کہ گلے مل لو اس کے بعد ہم کو یہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ بہار یا مسرت کا زمانہ بہت مختصر ہے۔ بہار آئی اور گذر گئی البتہ خزاں یا کلفت کو دوام حاصل ہے۔

غزل نمبر ۵۹

۱۔ ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں   معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

تمکین: شان و شوکت، قدر و منزلت + ضبط: خود داری، تکلف۔ مطلب یہ ہے وصل کی حالت میں بھی معشوق اپنے عز و وقار کا خیال رکھے اور عاشق تکلف و جھجک سے کام لے تو وصل کا کوئی لطف نہیں۔ ہجر کی طرح بے مزہ ہے۔ بوصل کا لطف تو اس وقت ہے کہ معشوق شوخ و چلبلا ہو اور عاشق وفورِ محبت میں دیوانہ و بے حجاب۔

۲۔ اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

فضول۔ حد سے زیادہ ۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کے لبوں کا بوسہ کبھی نہ کبھی ضرور مل جائیگا مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ عاشق کا شوق حد سے تجاوز کر جائے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شرم لحاظ کو بالائے طاق رکھکر رندوں کی سی جرأت پیدا کرے ۔ پھر تو بوسہ ملنا یقینی ہے ۔

غزل نمبر ۶۰

۱۔ چاہئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

چاہیئے : محبت کیجئے ۔ اچھوں کو ۔ خوبرویوں کو ۔ جتنا چاہیئے : جس قدر تم سے ہو سکے ۔ پھر کیا چاہیئے : پھر کس چیز کی ضرورت ہے ۔ فرماتے ہیں کہ تم سے جس قدر ہو سکے صرف معشوقوں سے محبت کئے جاؤ ۔ اگر تمہاری اس محبت کے نتیجے کے طور پر وہ بھی چاہنے لگیں تو پھر دنیا کی جملہ نعمتیں ہیچ ہیں کوئی دولت ان کی چاہت کے برابر نہیں ۔

۲۔ صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

رند : میخوار ۔ واجب ہے حذر : پرہیز کرنا ضروری ہے ۔ جائے مے : میخانہ شراب کی جگہ بجائے شراب کے ۔ زاہد سے فرماتے ہیں کہ رند بڑے بے ادب و گستاخ ہوتے ہیں ان کی صحبت میں نہ جانا ہی مناسب ہے ۔ ان کی صحبت میں شراب پینے کی بجائے اپنے کو ان سے دور رکھنا چاہیئے (یا یہ کہ جس جگہ رند جمع ہو کر شراب پیا کرتے ہیں یعنی مئے خانہ سو مے خانہ چھوڑ دیں اور گھر ہی میں شراب پیا کریں) مصرعِ ثانی میں جائے مے ذو معنین ہے ۔

۳۔ چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تیرا چاہنا کوئی معمولی بات نہیں لیکن دل نے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا اور نادانی سے تجھکو چاہنے لگا ۔ لہٰذا اس غلطی کا اس کو خمیازہ اٹھانا چاہیئے اب اس کو کافی سزا ملنی چاہیئے ۔ چنانچہ اس کی تمام عمر رنج و غم میں کٹیگی ۔

۴۔ چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

" پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے۔ پس جبتک پھول اپنا گریباں چاک نہ کرے تو ہمی گریباں چاک مت کر اسمیں لطف یہ ہیکہ جنون کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔" (از یادگار غالب)

۵۔ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے۔

فرماتے ہیں کہ حسن کو لگاؤ اور محبت ہوتی ہے وہی بیگانگی کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس کی محبت عاشق سے چھپی رہے۔ جب ہم نے اس بھید کو پا لیا اور آپ کی بیگانگی نے آپ کی دوستی کو ظاہر کر دیا پھر منہ چھپانے سے کیا فائدہ۔ اب شوق سے ہمارے سامنے آئیے۔

۶۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو   کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے۔

فرماتے ہیں کہ رقیب کے سینے میں میری دشمنی اور حسد کی آگ بھڑک رہی ہے جس کی وجہ وہ خود تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے حسد نے اس کو جلا دیا۔ دیکھیئے کس قدر دشمنی ہوئی کہ باوصف اپنی بربادی کے دشمنی سے باز نہیں آتا۔ مصرعِ ثانی میں دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ احمق خود اپنا کتنا دشمن ہے۔

۷۔ اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی   یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

ہنگامہ آرا۔ لڑاکا، تندخو، بدمزاج۔ فرماتے ہیں کہ رسوا ہونے کے لئے محض ہماری اپنی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ دوست لڑاکا اور تندخو ہو تو ہماری رسوائی کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔ کبھی وقت بگڑ کر گالیاں دیدیں اور لوگ جمع ہو گئے۔ کبھی ایک دو چپت ہی رسید کئے اور دیکھنے والے ہنس رہے ہیں غرض دوست ہنگامہ آرائی کرتا رہے تو رسوائی ہو۔

۸۔ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

یعنی مایوسی کی آخری حد موت ہے۔ پس جو شخص یہ خیال کرتا ہو کہ صرف موت ہی اس کے رنج و غم کا علاج ہو سکتی ہے۔ تو اس کی مایوسی کا کوئی ٹھکانہ بھی ہے؟

۹۔ غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

۱۰ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

طلعت : رخ، صورت، مہ طلعت : مہ رخ، حسین۔ پہلے شعر میں ایک قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ حسینوں سے محبت کرنے والا بھی خوبصورت چاہئیے۔ تب ہی تو محبت و الفت کا مزہ ہے دوسرے شعر میں اس قاعدہ کی خلاف ورزی خود فرماتے ہیں یعنی باوصف خوبرو نہ ہونے کے خوبرویوں سے محبت کرتے ہیں اسدؔ یہ تمہاری غفلت ہے۔

غزل نمبر ۶۱

۱۔ ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

شاعری میں عاشقِ وحشی کی رفتار کے مقابلے میں برق و باد کی رفتار بھی سست مانی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بیاباں میں میں تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں اسی تیز رفتاری سے بیاباں میرے آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ منزل مقصود پہلے جتنی دور تھی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد بھی اتنی ہی دور ہے۔ اگر بیاباں کی رفتار کچھ سست ہوتی تو اس کا امکان تھا کہ منزل مقصود قریب تر ہوتی جاتی۔ حاصل شعر یہ ہے کہ حصول مقصد کی جس قدر سعی کی جاتی ہے اور موانعات کو دور کیا جاتا ہے دوسری نئی نئی مشکلات سدِ راہ ہو جاتی ہیں اس لئے منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔

۲۔ درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

عنوان۔ مضمون۔ تماشا : دیکھنا۔ نظر کرنا۔ رشتہ شیرازہ : وہ ڈوری جو پراگندہ اوراق کو یکجا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق عاشقوں پر نظر ڈالنے کی مشق کر رہا ہے یعنی کس کس انداز سے عشاق کو تیر نظر سے گھائل کیا جائے۔ یہ بھی ایک مستقل فن ہے اور تاوقتیکہ اس کے ابتدائی اسباق کی کامل مشق نہ ہو وہ اس فن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کئی تجربوں کے بعد معشوق کو معلوم ہوا کہ سب سے موثر انداز نیم نگاہی یا تغافل ہے۔ اس لئے وہ مجھ کو آنکھیں بند کر کے دیکھتا ہے گویا اس کا تار نظر نیچے اور اوپر کی پلکوں کو ملا کر جوڑ دیتا ہے جس کی وجہ

آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ خلاصہ شعر کا یہ ہے کہ معشوق ہکو بے التفاتی سے دیکھتا ہے اور اس کا یہی انداز بھلا معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں　　صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

فرماتے ہیں کہ شبِ فراق میں دل کی آگ اس درجہ تیز ہو جاتی ہے کہ جو کوئی میرے پاس ہو اس حرارت کی تاب نہیں لا سکتا اور متوحش ہو کر بھاگ جاتا ہے اور تو اور میرا سایہ بھی میرے پاس نہیں ٹھہرتا جس طرح آگ سے دھواں بھاگ جاتا ہے۔ سایہ بھی مجھ سے گریزاں ہوتا ہے۔ بلطف یہ ہیکہ رات کے وقت سایہ نہیں ہوتا۔ شاعرانہ توجیہ یہ ہے کہ آتشِ دل کا دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔

۴۔ غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں　　کس قدر خانۂ آئنہ ہے ویراں مجھ سے

سادگی آموز: سادگی سکھانے والا۔ خانہ آئنہ: آئنہ اس لئے کہ آئنہ ظرف اور عکس مظروف ہے پس آئنہ ظرف مکان ہوا اور خانہ بھی ظرف مکان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مرنے کی وجہ معشوق نے بناؤ سنگھار ترک کر دیا۔ کبھی آئنہ میں اپنی صورت نہیں دیکھتا گویا آئنہ بیکار اور ویران ہو گیا اگر جملہ معشوق عشاق کے سوگ میں اسی طرح سادگی اختیار کر لیں تو پھر دنیا میں کوئی جاذبیت اور خوبصورتی باقی نہیں رہیگی! اس لئے دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے غمِ عشاق سادگی آموزِ بتاں نہ ہو تا کہ دنیا ویرانی سے محفوظ رہے۔

۵۔ اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں　　صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

جادہ: پگڈنڈی۔ اثر: نشان۔ علامت، نقش۔ گوہر: موتی۔ چراغاں: روشن۔

فرماتے ہیں کہ صحرائے جنوں میں دوڑتے دوڑتے پاؤں میں آبلے آ گئے ہیں۔ اس آبلہ پائی کے ساتھ صحرائے جنوں کی بیابان پر چلتا ہوں تو آبلوں کے نقش پگڈنڈی پر اترتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے رشتہ میں موتی پرو دیئے ہیں۔ گویا جادہ رشتۂ گوہر بن جاتا ہے چونکہ پاؤں کے آبلے عشق کا نتیجہ ہیں اس لئے ان آبلوں کے نقوش میں بھی آتشِ عشق کا اثر

اور جادہ رشتۂ گوہر کی طرح روشن اور منور ہے۔

۶۔ بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو   پر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

تمہید: آغاز، عنوان، ہو جو: ہو جیو، شبستان: سیاہ خانہ۔ فرماتے ہیں کہ شب ہجر میں ایسا بے چین و بیقرار ہوتا ہوں کہ کسی ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ بیقراری کی وجہ سے پورے گھر میں ٹہلتا ہوں۔ مکان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں تڑپ کر میں نہ جاتا ہوں جس طرح گھر کے ہر حصہ میں تاریکی ہے میں بھی تاریکی کے ساتھ موجود رہوں۔ تڑپتے تڑپتے اب کچھ بے خودی کی سی حالت طاری ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ بیخودی اطمینان و چین کی تمہید ہو جائے۔ اور میں اسی بستر پر آرام کر سکوں۔

۷۔ شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے   ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے

فرماتے ہیں کہ اے دوست بحالت اشتیاق دیدار اگر تو میرا سر اڑا دے تو بجائے اس کے کہ شوق دیدار زائل ہو جائے اور زیادہ ہو جائے گا۔ جس طرح گل شمع کو کترنے سے شمع کی روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ میرا سر جدا ہو جانے کے بعد نگاہیں تیرے دیدار کے شوق میں اور بھی زیادہ پھیل جائینگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بحالت شوق دیدار اگر گردن ماری جائے تو شوق دیدار اور زیادہ ہو جائیگا۔

۸۔ بیکسی ہائے شب ہجر کی وحشت ہے ہے   سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

شاعر نے اسی خیال کو جو شعر نمبر (۳) میں ہے دوسرے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شب ہجر میں تنہائی و بیکسی سے جو وحشت ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے اس بیکسی کے عالم میں میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ سایہ بھی خورشید قیامت میں پناہ گزیں ہو گیا ہے یعنی جب آفتاب قیامت طلوع ہوگا یہ شب ہجر ختم ہوگی اور تب میرا سایہ واپس آئیگا۔ قیامت تک نہ شب ہجر ختم ہوگی اور نہ سایہ کی صورت نظر آئے گی۔

۹۔ گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے   آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

معشوق کے جلوہ کو ساغر سے اس لئے کہا کہ دونوں سے سرور حاصل ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ

اے دوست ہر وقت تو ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گویا تیرا جلوہ ساغر کی گردش ہے۔ جس طرح وقفہ وقفہ سے ساغر سرور کرتا ہے تیرا جلوۂ رنگین بھی مسحور کرتا ہے۔ اور میں تیرے ان جلوؤں کو دیکھکر حیران ہوتا ہوں اور میرا دیدۂ حیراں آئینہ داری کا کام کرتا ہے۔

۱۰۔ نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

خس و خاشاک: معمولی لوگ۔ گلستاں: دنیا۔ فرماتے ہیں کہ اے اسدؔ جس طرح میرا نفس شرربار ہے میری نگاہیں بھی شعلہ ریز ہیں جس پر نظر پڑ گئی اس کا کھوٹ جلاکر کامل عیار بنا دیا۔ خس و خاشاک جیسی حقیر چیز کو روشن کرکے ان سے دنیا کو منور کر دیا۔

مطلب یہ ہیکہ عشق کی آگ نے مجھ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ جس پر نظر ڈالوں اپنی طرح اس کو بھی روشن اور منور کر دوں۔

غزل نمبر ۶۲

۱۔ نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نکتہ چیں: اعتراض کرنے والا۔ بنا: کثیر المعانی لفظ ہے موقع محل کے لحاظ سے معنی بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس شعر میں اس کے معنی ممکن ہونا ہیں۔ بات بنا: کامیاب ہونا۔ مراد ہے آتا ہے 'بات بنانا'۔ سخن سازی کرنا، جھوٹ بولنا، تابرد پیدا کرنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق بڑا نکتہ چین ہے۔ بات بات پر اعتراض کر بیٹھتا ہے! ایسے شخص کے سامنے اپنے غم کی کہانی سنانی ممکن نہیں۔ پھر جہاں سخن سازی اور جھوٹ موٹ کا فریب ہی نہ چل سکے وہاں کامیابی کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

۲۔ میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

بن جائے: بیت جائے، گزرے۔ فرماتے ہیں کہ میں اس کو بلاتا تو ہوں مگر اس کے آنے میں شک ہے البتہ میرا جذبۂ دل کچھ مدد کرے اور اس کو بے چین کر دے تو کچھ امید ہو سکتی ہے۔ لہٰذا دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے کہ جذبۂ دل کا اثر اس پر ایسا ہو کہ تڑپ کر نکل آئے۔

اور بغیر آئے اس کو چین نہ پڑے

۳۔ کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

یعنی معشوق ہم کو ستانا کھیل سمجھا ہے۔ اس کی دل بہلائی اس میں ہوتی ہے مگر کمسن اور بھولا ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کھیل کو بھول کر نہ چھوڑ دے۔ بچے عموماً کھیلتے کھیلتے اکتا کر دوسرے کھیل میں لگ جاتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ بغیر مجھ کو ستائے اس کو چین نہ آئے اور یہ کھیل وہ بھول نہ سکے۔

۴۔ غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

مطلب یہ ہے کہ رقیب کم حوصلہ ہے۔ معشوق کے خط کو اپنے نام و نمود اور عزت و توقیر کا ذریعہ بنائے پھرتا ہے۔ خط اس انداز سے اپنے پاس رکھتا ہے کہ لوگوں کی نظر آئے تاکہ وہ پوچھیں کہ یہ کیا ہے۔ اور جب پوچھیں تب اس کو چھپانے کی بناوٹی کوشش کرتا ہے مگر چھپا نہیں سکتا بظاہر مجبور ہو کر معشوق سے اپنی دوستی کا حال بیان کر دیتا ہے سفلہ پن اور خود غرضی تو دیکھئے کہ دوست کی عزت رسوا ہوگی اس کو خیال نہیں آتا اس طرح اس کو بدنام کئے پھرتا ہے۔

۵۔ اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ہاتھ آنا: حاصل ہونا، ملنا۔ فرماتے ہیں کہ اگر معشوق خوش مزاج اور نیک ہے ہماری بات مان بھی لیتا ہے اور جب بلائیں آجاتا ہے اتنی سہولتوں کے بعد بھی ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس بلا کا نازک ہے کہ چھوتے ہی کملا جائے یا بیہوش ہو جائے اس لئے ہاتھ بھی تو نہیں لگا سکتے۔ شعر میں معشوق کی انتہائی نزاکت اور اپنی حرمان نصیبی بیان کی ہے

۶۔ کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

وہ، ایسا۔ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کے ذرہ سے لیکر آفتاب تک جملہ موجودات میں اسی کی جلوہ گری ہے۔ لیکن تعینات کے ایسے زبردست پردے اس نے چھوڑ رکھے ہیں کہ

ان پردوں کو اٹھایا نہیں جاسکتا۔ پردے اٹھیں تو وہ نظر آئے۔

۷۔ موت کی راہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے　　　　تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

مصرعۂ ثانی میں کہ کے بعد لفظ "بلاؤں" مقدر ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست موت بھی جان لینے والی ہے اور تمہاری ادائیں بھی جان لیوا ہیں اس اعتبار سے تم میں اور موت میں کوئی فرق نہیں البتہ ستانے اور ایذا رسانی میں تم موت سے بہت بار ہو۔ اس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں اس کے برعکس اے دوست آپ کا یہ حال ہے کہ ہم آپ کی تمنا کریں اور چاہیں کہ آپ ہمارے پاس آئیں مگر آپ تشریف نہیں لاتے اور اس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ نہ آئیں تو تم کو بلا بھی نہیں سکتے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ معشوق سے موت اچھی ہے کہ بغیر بلائے آجاتی ہے اس کے خلاف معشوق نہ خود آئے نہ اس کو بلایا جاسکے۔

۸۔ بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے　　　　کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

سنا گیا کہ اس شعر پر بعض معصروں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جو بوجھ ایک مرتبہ اٹھایا جاسکا دوبارہ اس کے اٹھانے میں کون امر مانع ہے۔ مرزا صاحب سے کسی نے اس اعتراض کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اعتراض کرنے والے شعر کیا جانیں ان سے کہو کہ اگر تیلی کے سر سے تیل کا گھڑا گر جائے تو کیا دوبارہ اس بوجھ کو سر پر اٹھا سکتا ہے؟ اس واقعہ سے اور مرزا صاحب کی توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ بوجھ سے مراد کوئی گرانقدر متاع ہے۔ جس کے ضایع ہونے کا افسوس اور دوبارہ حاصل ہونے کی تمنا ہے۔ مگر یہ کس بات کی طرف اشارہ ہے الفاظ رہبری نہیں کرتے۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں کام کی نوعیت ظاہر نہیں کی جاسکتی کہ کونسا کام ایسا ہے جو بنائے نہیں بن رہا ہے۔ یوں تو شعر بالکل صاف سیدھا ہے کوئی لفظ اور ترکیب مشکل نہیں۔ اس کے باوصف ہم اظہار عجز کرتے ہیں۔

۹۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آگ لگانا اور آگ بجھانا دونوں محاورے بڑی خوبی سے مصرعۂ ثانی میں جمع کئے ہیں فرماتے ہیں کہ عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا یعنی محبت اختیاری فعل نہیں کہ جب اور جس سے چاہیں محبت کریں

اور جب چاہیں ترکِ محبت کریں۔ یہ بالکل غیر اختیاری ہے کوئی محبت نہ بھی کرنا چاہے تو وہ محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح ترکِ الفت بھی اختیار میں نہیں۔ پس اس کی مثال اس آگ کی سی ہے جو کسی کے لگانے سے نہیں لگتی اور نہ بجھانے سے بجھ سکتی ہے۔

غزل نمبر ۶۳

۱۔ چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

بعریانی: بحالت عریانی۔ گریبانی کرے: گریبان بن جائے گریبان کا بدل ہو جائے۔
مطلب یہ ہے کہ جسم پر قمیص یا کرتا ہو اور وحشت چاکِ گریباں کی خواہش کرے تو گریباں چاک کر کے وحشت کی تشفی اور اس کی خواہش کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ لیکن جب جسم پر کوئی لباس ہی نہ ہو اور بحالت عریانی وحشت چاک گریباں کا تقاضا کرے تو سینے کو چاک کرنا پڑے گا۔ سینہ چاک ہو جائے تو داغ دل چمکنے لگے گا جس طرح آفتاب گریبانِ صبح کو چاک کر کے نمودار ہوتا ہے! اس شعر میں دل سے مراد سینہ یا گریباں کا وہ حصہ ہے جہاں دل ہوتا ہے جس کے چاک اور زخمی ہونے کو گریبانِ صبح کے چاک ہونے سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

جلوہ: حسن۔ زیارت گاہ: ملاقات کی جگہ۔ دیدۂ دل: تصور۔ یعنی معشوق کا حسن ایسا سحر آفریں ہے کہ اس کا دیکھنا تو بڑی بات ہے۔ اگر کوئی دل میں بھی اس کا تصور کرے تو ششدر و حیران رہ جائے۔ شعر حقیقت کا ہے جلوہ سے مراد تجلیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجھ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اگر کوئی تیری ذات کا تصور کرنا چاہے تو خود تصور مقامِ حیرانی بن جائے۔ یعنی تصور پر بھی تحیر کا عالم طاری ہو جائے۔

۳۔ ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

شکستن: دل توڑنا۔ رنجیدہ کرنا۔ آبگینہ: آئنہ، دل سے استعارہ کیا ہے۔ کوہ: پہاڑ، پتھر یعنی مراد سنگدل معشوق۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی مہربانی کی توقع پہلے ہی منقطع ہو چکی تھی۔ اس سے مایوس ہو کر ہم نے اس کے جور و جفا کی تمنا کی کہ کم از کم ظلم کر کے ہمارا دل توڑ دے۔ ایسا کرنا تو اس کیلئے

آسان تھا مگر وہ ظالم ظلم کرنے پر بھی آمادہ نہیں۔ اس نے دل توڑنے کی جو امید تھی وہ بھی جاتی رہی آخر کبتک ہمارا دل اس سنگدل سے اپنی تکلیف کا اظہار کرے۔

۴۔ میکدہ گر چشم مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

اس شعر میں میکدہ کی مستی اور معشوق کی آنکھ کی مستی کا مقابلہ ہے۔ میکدہ میں شراب کے خم کے خم بھرے رہتے ہیں اور میخوار شراب پی کر مست و بیخود ہوجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جہاں اس کثرت سے شراب ہو وہاں مستی کی کیا کمی۔ لیکن معشوق کی مخمور اور نیم باز آنکھیں عشاق کو شراب سے زیادہ وارفتہ کر دیتی ہیں۔ اس لئے چشم ناز کی مستی میخانہ کی مستی سے زیادہ ہے۔ اگر ان دونوں کا مقابلہ ہو تو یقیناً میکدہ چشم معشوق سے شکست کھا جائیگا۔ اور شراب کے شیشے چٹخ جائیں گے۔ چٹخنے سے جو بال شیشوں میں آئیں وہ دیدۂ ساغر کے مژگان بن جائیں گے۔ ساغر اس شکست سے شرما کر پلکیں نیچی کرے گا۔

۵۔ خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

خط عارض، سبزۂ رخسار، وہ سیاہی جو آغاز جوانی میں رخساروں پر نمودار ہوتی ہے۔

یعنے الفت نے زلف کو ایک اقرار نامہ لکھ کر حوالہ کیا ہے اور یہ اقرارنامہ رخسار دوست کی سیاہی سے لکھا گیا ہے۔ اقرار یہ ہے کہ زلف کی پریشانی عشاق پہ جو ظلم کرے وہ سر بسر منظور ہیں یعنی زلف کے رخسار معشوق پر بکھرنے سے جو کیفیت پیدا ہوگی اس کو دیکھکر صدہا عشاق اپنی جان کھو بیٹھیں گے مگر اس کی ذمہ داری زلف پر نہ ہوگی اس لئے کہ عہدنامہ لکھدیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ زلف کا معشوق کے چہرہ پر پریشان ہونا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

غزل نمبر ۶۴

۱۔ وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

اضطراب: بیقراری۔ تپش، سوزش۔ مجال: فرصت۔ فرماتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ معشوق میرے پاس آکر میری بیقراری دور کرے۔ البتہ ایسا خواب میں ممکن ہے کہ وہ خواب میں آکر تسکین دے

لیکن ایسی صورت میں ہوسکتا ہے جب نیند آئے ۔ یہاں تو سوزش دل آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دیتی ۔ نتیجہ یہ کہ رات اور دن اضطراب ہی اضطراب ہے ۔

۲۔ کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگاوٹ : معشوق کا خوش اختلاطی اور محبت آمیز باتوں سے عاشق کو اپنی طرف مائل کرنے کا انداز ۔ میل خاطر ۔ آب دینا : تلوار کو باڑھ دینا ۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست اختلاط کے وقت نئے نئے انداز سے تو مجھ کو گھائل کرتا ہے کبھی محبت کی باتیں ہیں ۔ کبھی گلہ شکوہ ہوتا ہے ۔ کبھی آنکھوں میں پانی بھر لاتا ہے ۔ غرض تیری یہ ادائیں مجھ کو مار ڈالتی ہیں خصوصاً تیرا آبدیدہ ہونا تو ستم ہے ۔ کوئی نہیں جو تیری طرح تیغ نگہ کو آبدار بنائے ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کا بوقت اختلاط محبت آمیز گلہ کرتے ہوئے رونا غضب ڈھاتا ہے ۔

۳۔ دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو — نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

فرماتے ہیں کہ اے دوست ہم بوسہ کے طالب ہیں اگر بوسہ مل جائے تو جان بخشی ہوگی اگر بوسہ دے کر جان نوازی نہیں کرتا تو کم از کم انکاری جواب تو دے کر جان ستانی کر ۔ تیرے لب کی جنبش میرا کام تمام کر دے گی اور ہمیشہ کے لئے مجھ کو غم سے نجات مل جائے گی ۔ لیکن تیرا سکوت تو موت سے بھی بدتر ہے ۔ تو نے عجیب کشمکش کی حالت میں رکھا ہے نہ بوسہ دیتا ہے نہ جواب ۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ جنبش لب کو عموماً جان بخش سمجھا جاتا ہے مگر شاعر نے یہاں اس کو جان لینے والا بنا دیا ہے ۔

۴۔ پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اوک : ایک ہاتھ یا دونوں ہاتھ منہ کو لگا کر پانی پینا ۔ عموماً اعلیٰ ذات کے ہندو پست اقوام کے کسی آدمی کو چھوتے نہیں اور نہ اپنا باسن ان کو چھونے دیتے ہیں پانی پلانا ہو تو لٹیا سے ڈالتے ہیں اور وہ غریب ہاتھ منہ کو لگا کر پیتا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ اے ساقی اگر تجھکو مجھ سے نفرت ہے اور شراب نوشی کے لئے پیالہ نہیں دیتا تو اس میں کوئی ہرج نہیں ۔ کیا بغیر پیالہ کے شراب نہیں پی جاتی ۔ پیالے سے نہ سہی

اوک ہی سے پلادے۔ مگر پلا ضرور۔ ایسا نہ ہو کہ نفرت کو بہانہ بنا کر شراب ہی سے محروم کردے۔ شاعر نے اوک سے پینے کی اس لئے بھی خواہش کی ہے کہ بے اندازہ جی بھر کر شراب مل جائے پیالہ سے ناپ کر شراب دی جائے تو سیری کیسے ہو؟

۵۔ اس خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

خوشی سے ہاتھ پاؤں پھولنا، خوشی کے مارے بدحواس ہو جانا۔ فرماتے ہیں کہ معشوق نے اپنے پاؤں دابنے کا جو حکم دیا تو اس سے مجھ کو انتہائی خوشی حاصل ہوئی اس لئے کہ اس سے زیادہ ہماری خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے۔

غزل نمبر ٦٥

۱۔ تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے — مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

تپش: گرمی، جلن، اضطراب، تڑپ۔ وقفِ کشمکش ہے: تکلیف میں مبتلا ہے۔ بالین: سرہانا یہاں مراد اس سے تکیہ۔ فرماتے ہیں کہ عشق کی حرارت سے بیقرار ہو کر میں بستر پر تڑپتا اور کروٹیں بدلتا ہوں میرے جسم کی تپش سے بستر کا ہر تار تکلیف میں مبتلا ہے۔ تکیہ پر جو سر رکھتا ہوں تو تکیہ جلنے لگتا ہے بستر پر دراز ہوتا ہوں تو میرا جسم بستر کے لئے وبال ہو جاتا ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ جس تپش کے صدمے سے اثر کی بے جان چیزیں بھی تاب نہ لا سکیں وہ کس درجہ کی ہوگی۔ ہم اس کو سہے جا رہے ہیں۔

۲۔ سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے — دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

سرشک: آنسو۔ سر بصحرا دادہ: آوارہ، وہ آنسو جو اپنے مسکن یعنی چشم کو چھوڑ کر نکل پڑے۔ نور العین: آنکھوں کا نور، عزیز، عموماً فرزند کے لئے یہ لقب لکھا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے حد عزیز۔ بے دست و پا: مجبور، معذور۔ برخوردار: فرزند، نورِ چشم، اقبال مند یہاں اس سے مراد عزیز۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دامن کو آنسوؤں سے اُنس ہو گیا ہے۔ جنون کے آنسو میں بہاتا ہوں دامن نور العین سمجھ کر ان کو جھیل لیتا ہے نیچے گرنے نہیں دیتا اور دلِ مجبور و رنجور کو بستر عزیز رکھتا ہے اسکو اپنے سے جدا ہونے نہیں دیتا اس لئے وہ ہمیشہ بستر پر پڑا رہتا ہے۔ خلاصہ شعر کا یہ ہے کہ ہر وقت آنسوؤں سے

دامن تر رہتا ہے۔ بیمارِ عشق ہیں جسم میں تاب و تواں نام کو نہیں اس لئے بستر پر پڑے رہتے ہیں۔

۳۔ خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو   فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

خوشا: کلمہ تحسین و مسرّت۔ اقبالِ رنجوری: بیماری کی خوش نصیبی۔ عیادت: مزاج پرسی۔ فروغ: روشنی۔ طالعِ بیدار: خوش قسمتی۔ فرماتے ہیں کہ میری علالت کی خبر پاکر دوست میری عیادت کو آیا ہے کیا خوش اقبال ہے میری بیماری کہ دوست کو میرے پاس لے آئی۔ دوست کے آنے سے بستر علالت کے قسمت جاگ اٹھے گویا شمعِ بالین کی روشنی طالعِ بیدار کی روشنی بن گئی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ بیماری جو بدبختی کی علامت ہے میرے حق میں انتہائی اقبال مندی اور خوش نصیبی ثابت ہوئی اس لئے کہ دوست عیادت کے لئے آیا ہے۔

۴۔ یہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی   شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

طوفاں گاہ: شامِ تنہائی کے جوشِ اضطراب کو طوفاں گاہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں شبِ تنہائی میں دریائے اضطراب جوش میں ہے۔ شبِ ہجر کی تاریکی اور بیقراری نے میرے گھر کو طوفاں گاہ یعنی محشرستان بنا رکھا ہے۔ محشر کے لئے آفتاب کا ہونا ضروری ہے بغیر آفتاب قیامت محشر برپا نہیں ہوسکتا۔ پھر شبِ غم کی تاریکی میں محشر کیسے تو فرماتے ہیں کہ میرے بستر کا ہر سفید تار سوزِ دل کے اثر سے گرم اور شدت تاریکی کی وجہ روشن مثل شعاعِ آفتابِ قیامت ہے۔ گویا تار بستر ثبوت ہیں محشرستانِ بیقراری کا۔ (استاد نے شبِ غم میں قیامت بھی برپا کردی اور آفتاب بھی طلوع کردیا)

۵۔ ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی   ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

فرماتے ہیں کہ حضرت زلیخا نے اپنے محبوب حضرت یوسفؑ کو خواب میں دیکھا اور ہم نے اپنے معشوق کو اپنے پہلو میں بستر پر پایا چنانچہ جانے کے بعد بھی زلفِ مشکیں کی خوشبو بستر سے آرہی ہے یعنی ابھی ابھی ہم کو شادکام کرکے گیا ہے یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ اس لئے ہماری نظر میں خوابِ زلیخا یعنی حضرت یوسف کا دیدار اس کے بستر کے لئے موجبِ ننگ و عار ہے۔

اس طرح کوئی محبوب آئے تو کیا اور نہ آئے تو کیا اس کے برعکس ہمارے معشوق کا آنا شب باشی کرنا اور بستر پر اپنا اثر چھوڑ جانا ہمارے بستر کے لئے موجب فخر و ناز ہے ۔

۶۔ کہوں کیا دلکی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالبؔ — کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

فرماتے ہیں معشوق کے ہجر میں بیقرار ہوں نیند نہیں آتی ۔ گویا بستر کا ہر تار خار بستر بنگیا ہے پھر کانٹوں پر نیند کیسے آئے اور قرار کہاں نصیب ہو ؟

غزل نمبر ۶۶

۱۔ خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہو جائے — غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

رشتۂ الفت : دوستی ۔ محبت کا تعلق ۔ رگ گردن : علامت غرور و تکبر ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کی دوستی معمولی بات تو ہے نہیں کہ انسان اس پر مغرور نہ ہو جائے ۔ اس سے کم درجہ کی دولت روپیہ، پیسہ، عہدہ وغیرہ اگر مل جاتی ہے تو انسان گھمنڈی ہو جاتا ہے اب جبکہ معشوق کے ساتھ ہمارا رشتہ محبت استوار ہو گیا ہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں ہم اس پر مغرور نہ ہو جائیں ۔ غرور اور تکبر کا نتیجہ منافرت اور دشمنی ہوتا ہے اس لئے خوف ہے کہ ہماری دوستی دشمنی میں مبدل نہ ہو جائے ۔ اس شعر میں شاعر نے جو خیال پوشیدہ رکھا ہے یہ ہے کہ عاشق کو کسی حالت میں اطمینان و سکون نصیب نہیں ہوتا ۔ معشوق سے دوستی نہ ہو تو دوستی ہونے تک ایک کرب و بے چینی کی کیفیت رہتی ہے ۔ اور جب دوستی ہو گئی تو نئی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے ۔

۲۔ سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالبؔ — اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہو جائے

اس فصل میں : موسم بہار میں ۔ کوتاہی : قصور ۔ نشو و نما : بالیدگی ۔ فرماتے ہیں کہ موسم بہار کی جاں نوازی گلشن کے ہر پودے کو بالیدگی اور تازگی بخشتی ہے ۔ اس فصل کی تاثیر میں کسی کو کلام نہیں ۔ اگر اس فصل میں گلاب کے درخت بڑھتے بڑھتے سرو کے درختوں پر نہ چھا جائیں تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ درخت گل کی نشو و نما کی کوتاہی ہے ۔ فصل بہار کا قصور نہیں ۔

~~~
~~~

غزل نمبر ۶۷

۱۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

لے : موزوں آواز، سُر لحن ۔ نے : بانسری ۔ مصرعہ ثانی سے بعد "اس لئے رویا کرتے ہیں" مقدر ہے

مطلب یہ ہے کہ گانے میں چند پابندیاں ہیں سب سے پہلے خوش الحانی چاہئے اس کے بعد علم موسیقی سے واقفیت ضروری ہے اور پھر نے وچنگ ورباب بھی درکار ہیں لیکن رونے کے لئے کوئی قید نہیں، فطری طور پر خود آجاتا ہے ۔ اسی سہولت کے پیش نظر ہم ہر وقت نالہ و فریاد کیا کرتے ہیں اور نغمۂ مسرت کی دشواریوں کے مد نظر اس سے اجتناب ۔ روتے رہنے کی کیا خوب توجیہ ہے ۔

۲۔ کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے گر باغ گدائے مے نہیں ہے

تونبا : کڑوا کدو جس کو اندر سے خالی کر کے اس سے کشکول گدائی ' ستار وغیرہ بناتے ہیں اور اس میں شراب بھی بھر کر رکھتے ہیں ۔ گویا تونبا کشکول گدائی بھی ہے اور ظرف مے بھی ۔ فرماتے ہیں کہ باغباں تونبے اس لئے بوتے ہیں کہ باغ گدائے مے ہے ۔ گدا کیلئے کشکول گدائی چاہیئے ۔ تونبوں سے وہ کشکول کا کام لیتا ہے اور بھیک مانگ کر شراب اس میں بھر لیتا ہے ۔ باغ پکا شرابی ہے ۔ اسی وجہ سے باغ کی فضا میں کیفیت اور مستی ہے ۔

۳۔ ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے پر تجھ سی تو کوئی شئے نہیں ہے

ہر دو مصرعہ دراصل قرآن کی دو آیتوں کا ترجمہ ہیں ۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ (اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیءٍ مُحِیط) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہیں اور دوسری جگہ فرماتے ہیں (لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیءٌ) اس کے مانند کوئی شئے نہیں ہے بشعر تصوف کا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں اس کا وجود ہے لیکن اس کی حقیقت اور ماہیت کو انسان کے حواس ظاہری نہیں پا سکتے ۔

۴۔ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے ۔ نہیں ہے

یہ شعر بھی تصوف کا ہے فرماتے ہیں کہ انسان کا اپنے متعلق یہ گمان رکھنا کہ "میں ہوں"

دھوکہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہستی یا وجود صرف ایک ہے اس کے سوا جو بھی علیحدہ وجود نظر آئے دھوکہ ہے۔ پس لوگ خواہ کتنا ہی یقین تجھکو اپنی ہستی کا دلائیں کہ تیری ہستی ہے تو تو باور مت کر اور یہی سمجھ کہ نہیں ہے۔ ہستی سے مراد جملہ کائنات کی ہستی بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں بھی مطلب یہی ہوگا کہ لوگ خواہ کتنا ہی یقین دلائیں کہ ہے لیکن تو سمجھ کہ نہیں ہے۔

۵ . شادی سے گزر کہ غم نہووے اردی نہ ہو تو دے نہیں ہے

گزر = چھوڑ دے، ترک کر دے۔ اردی = اردی بہشت، پارسی مہینے کا نام جو اوائل بہار میں آتا ہے۔ دے = یہ بھی ایک پارسی مہینہ کا نام ہو آغاز خزاں میں آتا ہے۔ یہ شعر فقراء کے مسلک کے بموجب ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو مصرعوں اور نہایت سادہ الفاظ میں فقر و قناعت اور دانش و حکمت کی اعلیٰ تعلیم دی جا رہی ہے۔ جس خوبی سے اس بلیغ مفہوم کو بیان کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کے رنج و غم کی اصل خواہشات اور خوشی کی آرزو ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ انسان کی جملہ خواہشات پوری ہوں اور خوشی ہر وقت حاصل رہے لہٰذا نتیجہ غم ہے۔ اگر خواہشات ہی ترک کر دے اور خوشی کا طالب نہ رہے تو غم کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہو۔ دوسرے مصرعہ میں بہار و خزاں سے اس کی تمثیل کی ہے۔ یعنی بہار کی خوشیوں کے سبب ہی خزاں کی تکلیف ہے اگر بہار ہی نہ ہو تو خزاں کی صورت بھی محسوس نہیں ہوگی۔

۶ . کیوں رد قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

"مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔" (از یادگار غالب)

رد کرنا = انکار کرنا، لوٹا دینا، کسی چیز کو قبول نہ کرنا۔ قدح = پیالہ۔ شاعر نے زاہد پر طنز کیا ہے کہ تو شراب کو قابل نفرت کہتا ہے مگر در اصل قابل نفرت تو وہ چیز ہے جسکو تو پسند کرتا ہے

۷۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ غالبؔ — آخر تو کیا ہے اے "نہیں ہے"

ہستی : وجود۔ عدم کی ضد۔ نہیں ہے : نیست کا ترجمہ ہے۔ مراد اس سے غالبؔ شاعر خود کو ایک دوسرا شخص فرض کرکے مخاطب کر رہا ہے کہ اے غالب تو اپنے کو "نیست" کہتا ہے یعنی تو کہتا ہے کہ میں نہیں ہوں۔ لیکن تیرا یہ بیان ہم کو اس لئے باور نہیں آتا کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ تو موجود ہے۔ پس ہم تجھکو عدم نہیں سمجھتے اور تو اپنے آپ کو ہست نہیں جانتا اے غالب : (نیست : نہیں ہے) جب تو نہ معدوم ہے نہ موجود تو بتلا کہ آخر پھر کیا چیز ہے؟

غزل نمبر ۶۸

۱۔ نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

ریزہ الماس : ہیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو زخموں کو اور کشادہ کرتے ہیں۔ جراحت : زخم جزو اعظم : نسخہ کی دواؤں میں سب سے اہم جز۔ فرماتے ہیں کہ زخم دل کے لئے جو مرہم تیار کیا جاتا ہے اس کا نسخہ عجیب دلکشا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے مرہم زخم کو تنگ کرکے مندمل کر دیتے ہیں۔ اگر زخم دل پر بھی ایسا ہی کوئی مرہم لگایا جائے تو دل تنگ ہو جائے گا۔ اس لئے زخم دل کے مرہم میں ریزہ الماس شریک کیا جاتا ہے تاکہ زخم زیادہ سے زیادہ کشادہ ہو اور دل کو فرحت بخشے۔

۲۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں کہ غمزہ و عشوہ ایسی چیز نہیں کہ آسانی سے بغیر مشق کے حاصل ہو جائے۔ معشوق ایک عرصہ سے تغافل یا نیم نگاہی کی مشق کر رہا تھا۔ برسوں کی کوشش اور مشق کے بعد کہیں جا کر اس کے تغافل نے غمزہ کی صورت اختیار کی ہے اس کی یہی کم نگاہی جو بظاہر کامل التفات سے کم ہے جگر کے پار ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کا التفات سے دیکھنا اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ تغافل کی کم نگاہی مسحور کرتی ہے۔ استاد نے شعر میں یہ صنعت رکھی ہے کہ تغافل کیلئے نگہ اور التفات کیلئے نگاہ لایا ہے جبکہ میں بمقابلہ نگاہ ایک الف کم ہے۔

غزل نمبر ۶۹

۱۔ ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں و لے ان کی تمنا نہیں کرتے

فرماتے ہیں کہ ہم معشوق پر جان تو دیتے ہیں لیکن اس کے ملنے کی آرزو اس لئے نہیں کرتے کہ ہم کو اپنی ذات پر بھی رشک آتا ہے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ شوخ ہم سے ملے۔ ہم آرزو تک نہیں کرتے۔ رشک کو حضرت غالب نے مختلف انداز سے بکثرت باندھا ہے۔ رشک کی یہ آخری حد ہے۔

۲۔ در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

ربط نہانی: پوشیدہ تعلق۔ اس شعر میں فطرت انسانی کے دو پہلو ظاہر کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس کے دل میں چور ہوتا ہے وہ چھپ چھپ کر کام کرتا ہے۔ دوسرے جس کا دل پاک ہوتا ہے وہ کسی بات کو نہیں چھپاتا۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق کے پوشیدہ تعلقات رقیب کے ساتھ ہیں وہ چھپ چھپ کر اس سے ملاکرتا ہے اور لوگوں پر اپنی پاکبازی اور بے لوثی ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے کہ وہ کوئی بات چھپاتا نہیں جو کچھ ہوتا ہے صاف صاف بیان کر دیتا ہے اس کی یہ صفائی پیش کرنا بتلاتا ہے کہ وہ کسی راز پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

بعض نسخوں میں اس شعر کا مصرعہ ثانی اس طرح ہے "ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے" اس صورت میں شعر کا مطلب بہت واضح ہے یعنی معشوق کو در پردہ رقیب سے محبت ہے۔ لیکن بظاہر لوگوں کو بنانے رقیب کے ساتھ لا پروائی سے پیش آتا ہے۔

۳۔ یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تمہاری گرم بازاری رقیبوں کی وجہ ہے۔ ان کو مایوس مت کرو ورنہ دوکان بے رونق ہو جائے گی۔ اہل ہوس غرض کے بندے ہوتے ہیں اور کچھ آس لگائے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر تم غالب کو برا بھلا کہوگے تو وہ اس خیال سے مایوس ہو جائیں گے کہ جب غالب جیسے سچے اور وفادار عاشق کی یہ گت بن رہی ہے تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ پھر وہ آنا چھوڑ دینگے۔ استاد نے کس خوبی سے معشوق کا منہ بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل نمبر ۷

۱۔ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

فروغ : روشنی، نور، رونق ۔ کسب کرنا : حاصل کرنا ۔ خطِ پیالہ : پیالہ کا حلقہ نما نشان جو شراب کی مقدار بتلاتا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست شراب پینے کے بعد تیرا چہرہ گلاب سا سرخ اور با رونق ہو جاتا ہے ۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شراب کا اثر ہے لیکن حقیقت میں یہ تیرے لبوں کی سرخی اور فروغ ہے ۔ جو شراب کے ذریعہ چہرہ پر نمایاں ہو گیا ہے ۔ شراب پیتے وقت تیرے گلاب سے رخسار کا عکس پیالہ میں پڑتا ہے تو حلقہ ساغر بالکل چشم گلچیں بن جاتا ہے ۔ یعنی جس طرح سے پھول چنتے وقت چشم گلچیں میں پھولوں کا عکس پڑتا ہے ۔ اسی طرح تیرے رخ کا عکس حلقۂ ساغر میں پڑتا ہے

۲۔ کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

شوریدہ : دیوانہ ۔ دل شوریدہ : مراد عاشق آشفتہ سر ۔ فرماتے ہیں کہ ہم دیوانہ اور مجنون ہیں ۔ دیوانوں کو بوجہ شوریدہ سری نیند نہیں آتی اس لئے ایک عرصہ دراز سے سر تکیہ پر رکھنے کی آرزو ہے جو پوری نہیں ہو رہی ہے ۔ اور یہ ساری آفت معشوق کی ناانصافی اور بے التفاتی کے سبب ہے لہٰذا اگر وہ توجہ فرمائے تو نیند آجائے گی ۔

یا

بوجہ دیوانگی ایک عرصۂ دراز سے نیند نہیں آتی ۔ بالین کی حسرت ہی حسرت ہے ۔ خدا وہ وقت لائے کہ اس ظالم کا ہم بالین ہونا نصیب ہو ۔ تاکہ سرِ حسرت پرست بالین کی داد مل جائے ۔

۳۔ بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

گل کی کان سے تشبیہ عام ہے ۔ پنبہ آگیں : روئی بھرا ہوا ۔ فرماتے ہیں کہ گل کا کان شبنم سے اس طرح بھر گیا ہے جیسے کسی نے کان میں روئی ٹھونس لی ہو ۔ ایسی صورت میں وہ بلبل زار کی آہ و فریاد نہ سن سکے تو بجا ہے ۔ اس کو تغافل کا الزام نہیں دیا جا سکتا ۔

۴۔ اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

شعر صاف ہے فرماتے ہیں کہ اے بے وفا معشوق تیرا عاشق اسوقت نزع کے عالم میں ہے۔ بکم از کم اس آخری وقت مہربانی کر اور اس کے پاس چل یہ وقت حجاب کرنے یا اپنے عز و وقار کو بیچ میں لانے کا نہیں ہے۔ حجاب اور تمکیں چھوڑ اور میرے ساتھ ہولے۔

غزل نمبر ۷۱

۱۔ کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو   یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

شعرا حسینوں کی آنکھ کو نرگس بیمار یا چشم بیمار باندھا کرتے ہیں۔ بیمار کے لئے پرہیز ضروری ہے لہٰذا چشم بتاں کو نظارہ سے پرہیز ہے اس لئے حسین اپنے عاشقوں کے ساتھ تغافل برتتے ہیں یعنی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ شاعر نے معشوقوں کی بے التفاتی کی شاعرانہ توجیہہ فرمائی ہے۔

۲۔ مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی   وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

مطلب یہ ہیکہ ایسے بدنصیب ہیں کہ مرتے وقت بھی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ ارمان یہ ہے کہ خنجر رک رک کر چلے تاکہ معشوق کو جی بھر کر دیکھ سکیں۔ اگر اس ظالم کا خنجر کند ہوتا تو دیر سے جان نکلتی اور یہ ارمان نکلتا مگر افسوس کہ اس کا خنجر تیز ہے۔ گلے پر رکھتے ہی سر تن سے جدا ہو جائے پھر اس کو جی بھر کر دیکھنے کا ارمان کیسے نکلے۔

۳۔ عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ   جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

عارض: رخسار۔ فرماتے ہیں موسم بہار میں گلوں کو دیکھکر معشوق یاد آجاتا ہے اس لئے کہ اس کے رخسار بھی گل کی طرح خوبصورت اور سرخ ہیں۔ گویا بہار کا جوش ہمارے دل میں جوشِ اشتیاق کا باعث ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یوں تو ہر وقت معشوق کے دیدار کا اشتیاق رہتا ہے لیکن موسم بہار میں اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بغیر معشوق و بادہ و ساغر چین نہیں آتا۔

غزل نمبر ۷۲

۱۔ دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے   ہوا رقیب تو ہے نامہ بر کیا کہیئے

دل۔ دینا: عاشق ہونا۔ فرماتے ہیں کہ اگر ہمارا نامہ بر معشوق کے حسن کو دیکھکر عاشق

ہوگیا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے آخر وہ بھی تو ہماری طرح ایک انسان ہے۔ اس کو بھی اللہ نے دل او وجاہت دی ہے۔ اس کا عاشق ہونا ایک فطری بات ہے۔ اسکا کوئی قصور نہیں۔ ایسی صورت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

۲۔ یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں کہ موت کا آنا تو یقینی ہے کبھی نہ کبھی وقت ضرور آئیگی ہم کہہ رہے ہیں کہ تیرا آنا ضروری ہے تو آج ہی کیوں نہ آجائے۔ آ اور ہمکو اس فراق یار کی مصیبت سے نجات دے مگر اس کو یہ ضد ہے کہ آج تو نہ آئیگی معلوم ہوا کہ وہ بھی ہم کو ستانا چاہتی ہے اس پر ہم جس قدر گلہ کریں واجبی ہے

۳۔ رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیئے

گہ و بیگہ: ہر وقت۔ فرماتے ہیں کہ ہم جب دیکھتے ہیں رقیب، کوئے یار میں منڈلاتا نظر آتا ہے گویا اس نے یہاں اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ پھر ہم کوئے یار کو دشمن کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں۔

۴۔ زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیئے

زہے: حرف تحسین ہے۔ کرشمہ: مجازاً کرامات، اعجاز (لغوی معنی آنکھ و ابرو کا اشارہ غمزہ)

فرماتے ہیں کیا ہی اعجاز ہے اس کا کہ ہم آج تک اس کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔ جب کبھی ہم اس کو حال دل سنانا چاہتے ہیں تو کہتا ہے کہ "تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں تمہارے دل کا حال سب ہم پر منکشف ہے" اسکے اس بیان کو ہم روشن ضمیری پر محمول کر کے خاموش ہو جاتے ہیں

۵۔ سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں کہ معشوق بڑا ہی ستم ظریف ہے وہ طرح طرح سے ہم کو ستاتا ہے جب ہم اس کے گھر اپنا حال بیان کرنے جاتے ہیں تو کہنے نہیں دیتا۔ اور یہ کہکر خاموش کر دیتا ہے کہ "چپ رہو تمہارا سب حال ہمکو معلوم ہے"۔ وہ سمجھتا ہے کہ ذرا بھی موقعہ اس کو دیا جائے تو دماغ چاٹ جائیگا اس کے برخلاف جب بازار میں ملتا ہے تو خود پرسش حال کرتا ہے اس لئے کہ اس کو یقین ہے کہ سر بازار اس سے بات چیت کرنی ہماری وضعداری کے منافی ہے ہم ہرگز کچھ کہہ نہ سکیں گے۔

Scanned by CamScanner

نوٹ :۔ اس سے پہلے کا شعر اور یہ شعر ہر دو قطعہ بند ہیں۔

۶۔ تمہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہئے

یعنی معشوق کو بند مٹھی بتا کر پوچھتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز ضرور ہے۔ بھلا بتاؤ کہ وہ چیز کیا ہے۔ جب دوست یہ پہیلی نہ بوجھ سکا اور کچھ نہ بتا سکا تو خاموشی سے انداز میں خود بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں سر رشتۂ وفا ہے جس کو تم نے بھلا دیا۔ شاعر نے کس عمدگی سے اپنی وفاداری اور معشوق کی بے وفائی بیان کی ہے؟ انداز بیان قابل داد ہے۔

۷۔ انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہئے

زعم : خیال باطل وہم۔ فرماتے ہیں میں اگر معشوق سے کچھ پوچھتا ہوں تو وہ سمجھتا ہے کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اس لئے جواب نہیں دیتا اور تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ اس کو ہمارے جنون کا وہم نہیں ہے تب بھی اس مغرور سے جواب دینے کی توقع نہیں غرض ہر صورت میں جواب سے مایوسی ہے۔ پھر کہہ کر کیا فائدہ۔

۸۔ حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

فرماتے ہیں کہ کمال سخن کی سزا حسد ہے یہ ریت اب کی نہیں بلکہ قدیم سے یہ دطیرہ چلا آرہا ہے جہاں کوئی صاحب کمال شاعر پیدا ہوا دوسرے ہم فن اس پر حسد کرنے لگے۔ اگر تنہا میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو اور بات تھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر صاحب کمال کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے۔ اس لئے اس سزا کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی طرح ہنر کی قیمت ستم ہے صاحب ہنر پر ہر دور میں ظلم ہوا کئے ہیں۔ پھر اس عملی قاعدہ کے خلاف کیا کہئے؟۔ (نوٹ) اس شعر میں معاصرین پر چوٹ کی ہے۔

۹۔ کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

آشفتہ سر: دیوانہ، پریشان۔ فرماتے ہیں کہ کسی نے نہایت سچ کہا ہے کہ غالبؔ کچھ برا آدمی نہیں ہے۔ آدمی تو اچھا ہے مگر ایک عیب ضرور ہے وہ یہ کہ آشفتہ سر ہے۔

اس کے سوا اور کوئی برائی اس میں نہیں جو بیان کی جاسکے۔

غزل نمبر ۷۳

۱۔ دیکھکر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے　　کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

در پردہ: عدم میں۔ دامن افشانی: دامن جھاڑنا، آزاد و بے فکر ہونا۔ عریانی: ظہور میں آنا، پیدا ہونا۔ میں عالم امکان میں قدم رکھنے سے پہلے عدم میں ہر قسم کی قید و بند سے آزاد تھا۔ نہ جسم تھا اور نہ جسم سے متعلقہ عوارض تھے۔ ہر طرح آزاد و بے فکر تھا۔ عریانی کو یہ حالت پسند نہیں آئی اور جسم سے وابستہ کر کے اس دنیا میں لے آئی۔ لہٰذا جتنا آرام عدم میں ملا تھا وجود میں آکر اتنے ہی دکھ درد پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔

۲۔ بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں　　مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

سنگ فساں: وہ پتھر جس پر چھری چاقو تیز کئے جاتے ہیں۔ "مرحبا میں" کا تعلق مصرع اولیٰ سے ہے اس شعر کی نثر اس طرح ہو گی "مرحبا! میں تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں بن گیا۔ (اس لئے) گراں جانی مجھے کیا (بہت) مبارک ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ تیغ نگاہ یار سے کوئی زندہ بچ نہیں سکتا لیکن میں ایک ہی سخت جان عاشق ایسا ہوں جو اس تلوار سے گھائل ہونے کے باوصف زندہ ہوں۔ دوست میری اس سخت جانی کو بار بار حیرت سے دیکھتا ہے دوست کے اس بار بار التفات کی وجہ گراں جانی بجائے عذاب کے ایک مبارک چیز ہو گئی ہے۔

۳۔ کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے　　جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

اس کی خاطر جمع ہے: وہ مطمئن ہے۔ پرسشہائے پنہانی: تصور میں پرسش کرنی۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی خاطر جمع ہے یعنی وہ میری وفاداری سے مطمئن ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں ہر وقت اس کے تصور میں اور اس کی یاد میں محو ہوں۔ اسی اطمینان خاطر کا نتیجہ ہے کہ وہ مجھ سے بے التفاتی کرتا رہتا ہے۔

۴۔ میرے غمخانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی　　لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

فرماتے ہیں کہ جب اللہ میاں نے میرے گھر کی قسمت رقم فرمائی۔ اس میں بہت سے اسباب ویرانی کے تحریر فرمائے۔ کہ فلاں فلاں وجہ سے اس کا گھر ویران و برباد ہوگا۔ ان اسباب میں ایک سبب یہ بھی مرقوم تھا کہ خود میری بدبختی بھی گھر کو ویران کر دے گی۔ گویا میں بھی اپنے گھر کی بربادی کا ذمہ دار ہوں۔

۵۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

نوا: نالہ و نغمہ۔ مرغِ بستانی: مراد بلبل۔ فرماتے ہیں کہ مجھے بلبل کے نالے سننے کا شوق ہے۔ میری آہوں میں اور بلبل کے نالوں میں ہم آہنگی ہے۔ یعنی سوزِ عشق دونوں میں ہے۔ لیکن معشوق میرے باغ کو جانے کا دوسرا مطلب لیتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں گل و بلبل کی خاطر یا کسی اور حسین سے ملنے باغ کو جایا کرتا ہوں۔ کاش کے مجھ کو نوائے مرغِ بستانی کا شوق نہ ہوتا اور معشوق کیلئے بدگمانی کی کوئی وجہ پیدا نہ ہوتی۔

۶۔ واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے شور و شر سے تنگ آکر آرام پانے کے لئے میں قبر میں جا کر سو گیا تھا مگر وہاں بھی آرام نصیب نہیں ہوا۔ قبر میں جاتے ہی شورِ محشر شروع ہو گیا اب کیا نیند آتی؟

۷۔ وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

فرماتے ہیں کہ اے دوست آنے کا وعدہ وفا کیجئے۔ یہ آپکا کیا انداز ہے کہ وعدہ تو کرتے ہیں مگر آتے نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انتظار میں گھر چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ گویا ہم اپنے گھر کے دربان بن گئے ہیں۔ جناب حالی یادگار غالب میں اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں "وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔" (یادگار غالب)

۸۔ ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

سودائے غزل خوانی: غزل خوانی کا جنون۔ قاعدہ ہے موسم بہار میں جنون کے دورے شدید ہو جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ موسم بہار کی آمد کی خوشی ہے جس کے باعث جنون غزل خوانی تازہ ہوگیا ہے۔

۹۔ دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی　　میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب کے ایک چھوٹے بھائی میرزا یوسف خاں تھے جو عنفوان شباب میں مجنون ہوگئے اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ بعض خطوط میں حضرت غالبؔ نے ان کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کو مرزا یوسف سے بڑی محبت تھی۔ ایک وقت مرزا یوسف سخت بیمار ہونے کے بعد تندرست ہوئے تھے اس مقطع میں ان کی صحت یابی پر اظہار مسرت کیا گیا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میرزا یوسف کو میں دوسرا یوسف سمجھتا ہوں۔

غزل نمبر ۱۳۴

۱۔ یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے　　سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہنگامۂ یارب : یارب کا شور یا داویلا مراد یارب کی تسبیح پڑھنا۔ جب کوئی مصیبت یا بلا آتی ہے تو اس کے دفعیہ کیلئے سوا لاکھ مرتبہ یارب یارب پڑھا جاتا ہے اس کو یارب کی تسبیح کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک فریاد یا دعا ہے جو خدا سے کیجاتی ہے۔ خندہ زیرلب کی تشبیہ تسبیح پڑھنے سے دی گئی ہے۔ اس لئے کہ تسبیح بھی زیرلب پڑھی جاتی ہے اس کے علاوہ مسکراتے وقت دانت سبحہ کے دانوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ میری خوشی بھی تکلیف سے خالی نہیں۔ خوشی کے موقعوں پر بھی یارب یارب کی فریاد زبان پر جاری رہتی ہے۔ چنانچہ میرا مسکرانا بظاہر خوشی کی علامت ہے لیکن درحقیقت ثبوت فریاد ہے جس طرح زاہد مالا جپتے ہوئے زیرلب یارب یارب کہتا ہے میں بھی زیرلب فریاد کرتا ہوں لہٰذا میرا خندۂ زیرلب زاہد کی تسبیح کے مماثل ہے غرض یہ اپنے اپنے حوصلہ کی بات ہے۔ کوئی مصائب روتے جھینکتے اٹھاتا ہے کوئی خندہ پیشانی سے ہنستے ہوئے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔

۲۔ ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

اس شعر میں شاعر نے مدرسہ سے اپنی پریشانی و بیزاری اور شعر و سخن سے اپنے دلی لگاؤ و رغبت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جبتک مجھکو (خانہ مکتب) مدرسہ میں بٹھا کر الف بے جیم دال وغیرہ کے سبق دیئے گئے کوئی بات سمجھ میں نہ آئی اور نہ کسی وقت ان اسباق سے میرے دل کو فرحت حاصل ہوئی ہمیشہ میں مدرسہ سے پریشان اور بیزار رہا گویا مدرسہ میرے حق میں قفلِ ابجد کا گورکھ دھندا تھا نہ بات سمجھ میں آتی تھی اور نہ دل کا قفل کھلتا تھا البتہ لڑکپن سے ہی میرا دل شاعری کی طرف مائل تھا یعنی قدرت نے میرے دل کو شعر و سخن میں رہن کر دیا تھا۔ اس لئے میرا دل صرف شاعری میں لگتا ہے اور اسی سے مجھ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ غالب کی ابتدائی تعلیم آگرے میں شیخ معظم نامی معلم کے ہاں ہوئی اور سال دو سال ایک پارسی نژاد نو مسلم ملا عبد الصمد سے کچھ فارسی سیکھی۔ پھر کسی سے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ اکثر خطوط میں انہوں نے اسکا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں میرا کوئی استاد نہیں بجز مبدا فیاض کے مجھے کسی سے تلمذ حاصل نہیں رہا۔ اسی طرح اکثر رقعات میں لکھتے ہیں کہ دس بارہ سال کی عمر سے مشق سخن جاری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ پڑھنے سے بیزار اور شاعری میں محو رہے۔ الفاظ کی مناسبت کے علاوہ دو مختصر مصرعوں میں اپنے سوانح حیات کو بیان کرنا قابل داد ہے۔

۳۔ یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

آشفتگی: دیوانگی، پریشانی۔ لفظ اب اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پہلے زندان کی زندگی سے نفرت تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری اس دیوانگی کی داد کون دے کہ جبتک زندان میں رہے زنداں کی زندگی وبال تھی اور آوارہ گردی کا شوق ستاتا رہا۔ جب زنداں سے چھوٹ گئے اور صحرا میں آوارہ پھر رہے ہیں تو صحرانوردی کی صعوبتوں سے طبیعت بیزار ہو گئی اب پھر زنداں یاد آرہا ہے اور قیدیوں کی آسایش و آرام کی زندگی پر رشک آرہا ہے قیدیوں کی حالت پر رشک کرنا دیوانگی نہیں تو پھر کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

۴۔ طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں — آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

حسرت = شکستِ آرزو کا افسوس، ارمان نہ نکلنے کا رنج۔ قاعدہ ہے کہ آرزو کے نہ نکلنے سے رنج ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھ کو خوشی درکار نہیں میری طبیعت رنج کی لذتوں کی مشتاق ہے کسی نہ کسی طرح کوئی رنج چاہیے۔ ارمان نہ نکلنے اور امید بر نہ آنے سے انسان کو دکھ ہوتا ہے پس میں آرزو اس لئے کرتا ہوں کہ میری کوئی آرزو نہ نکلے اور اس رو سے مجھ کو لذتِ حسرت حاصل ہوتی رہے۔

۵۔ دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

شاعر اپنے آپ کو ایک دوسرا شخص فرض کر کے کہتا ہے کہ جناب میرزا صاحب آپ مجھ کو عشق و دیوانگی سے روکا کرتے تھے۔ مگر اب میں جو دیکھتا ہوں آپ بھی عاشق ہو کر مجھ جیسے دیوانہ و آوارہ ہو گئے ہیں۔ بتایئے آپ کی وہ نصیحتیں جو ہم کو کیا کرتے تھے کیا ہو گئیں۔

غزل نمبر ۷۵

۱۔ حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے — چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

خوش نوایانِ چمن = شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کے دربار کے شعراء۔ فرماتے ہیں کہ آج بادشاہ کی بزمِ سخن میں اہلِ سخن کے کمالِ سخنوری کا امتحان ہے گویا بادشاہ کی بزم ایک چمن ہے جس میں خوش بیان شاعر اپنی سحر بیانی اور خوش نوائی کے جوہر دکھائیں گے۔ کہتے ہیں کہ جس مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی گئی بادشاہ سلامت بھی تشریف فرما تھے۔

۲۔ قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

رسن = ڈوری۔ یہاں اس سے مراد پھانسی + دار = ایک لکڑی جس کو زمین میں گاڑ کر مجرم کی جان لی جاتی تھی مگر اب سولی اور پھانسی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ فرماتے ہیں کہ قیس و کوہکن لیلیٰ و شیریں کے عاشق تھے۔ مدارجِ عشق میں ان کی رسائی صرف تا لیلیٰ و تا شیریں تک ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ عشق مجازی میں گرفتار تھے اس سے آگے نہ بڑھ سکے اس لئے ان کی آزمائش مجازی معشوقوں کے

قد و گیسو کی حد تک ہوگی۔ لیکن ہم عشقِ مجازی سے آگے بڑھکر عشقِ حقیقی کی اس منزل تک
پہنچ گئے ہیں جہاں جنابِ منصور پہنچ گئے تھے اس مقام میں امتحان دار و رسن سے لیا جاتا ہے
پھر قیس و کوہکن کو ہمارے ساتھ کیا نسبت ہوسکتی ہے۔

۳۔ کرینگے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمایش ہے

خستہ: بیمارِ غم۔ نیروئے تن: جسمانی طاقت۔ فرماتے ہیں کہ فرہاد کے حوصلہ کا امتحان
بعد میں لیا جائیگا۔ فی الحال سنگتراشی کے کام پر لگا کر اس کی جسمانی توانائی کا امتحان لیا جاتا ہے
اس شعر میں فرہاد کی بے حوصلگی پر طعن کیا ہے۔ مصرعہ اولی میں تیشہ سے سر پھوڑ کر مرنے کی طرف اشارہ ہے

۴۔ نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمایش ہے

پیرِ کنعان: حضرت یعقوب علیہ السلام۔ اس شعر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے
حضرت یعقوب کی بینائی عود کر آنے کی تلمیح ہے۔ ہوا خواہی: دوستی، خیر خواہی۔ فرماتے ہیں کہ نسیمِ مصر
کو حضرت یعقوب علیہ السلام سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اس کو تو صرف پیرہنِ یوسف کی خوشبو کو
آزمانا تھا کہ اس کا کیا اثر یعقوبؑ پر ہوتا ہے اس لئے اس نے مصر سے کنعان تک خوشبو اڑا کر لگی

۵۔ وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

فرماتے ہیں وہ ہوش ربا معشوق اہلِ بزم کے صبر و شکیب کا امتحان لینے آرہا ہے۔ باخبر
ہو جائیے سنبھل کر بیٹھئے۔ بعد میں یہ نہ کہیں کہ بے خبری میں اس نے ہمارے ہوش و حواس
پر حملہ کر دیا۔ چونکہ اوپر کے شعر میں یوسف کا ذکر آگیا ہے۔ ساتھ ہی زنانِ مصر اور یوسف کا
واقعہ بھی یاد آگیا ہوگا غالباً اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

۶۔ رہے گر دل میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے

شست: انگوٹھا، چونکہ کمان کا چلہ انگوٹھے سے پکڑا جاتا ہے اس لئے زہ گیر کو بھی شست
کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ ہدف اور نشانہ کے معنی بھی آتے ہیں۔ ناوک فگن: تیر انداز۔ فرماتے ہیں کہ
معشوق کا تیر اگر دل میں اتر جائے تو بھی اچھا ہے اور اگر جگر کے پار ہو جائے تب بھی اچھا ہے

اصل میں اس کی تیر کے قابل یہی دو ہدف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس کو نشانہ بناتا ہے۔ دل کو یا جگر کو اور پھر تیر کس خوبی سے نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ بس ہم کو اسی کی آزمائش منظور ہے۔

۷. نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

گیرائی: گرفتگی، پکڑ۔ سبحہ و زنار کی ڈوریوں کو پھندے سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ زاہد کی سبحہ اور برہمن کی زنار میں عوام کے لئے کشش ہے وہ ان پھندوں میں آسانی سے گرفتار ہو کر ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم کو ان پھندوں سے نہیں پھانسا جا سکتا۔ ہم اس ظاہری زہد و تقویٰ کو نہیں مانتے۔ البتہ ہم یہ دیکھیں گے کہ شیخ و برہمن اپنے معبود کے کس حد تک وفادار ہیں۔ اس کی محبت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں کیا کیا قربانی انہوں نے دی ہے۔ جو بھی اس امتحان میں پورا اترے ہم اس کے ساتھ ہیں۔

۸. پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل — مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

وابستہ: بندھا ہوا۔ تاب: طاقت۔ مگر: شاید۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ عاشق کا دل معشوق کی زلفوں میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے شاعر اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے دل گرفتار تو جس حالت میں ہے اسی حالت میں بندھا ہوا پڑا رہ۔ تڑپنے پھڑکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تیرے تڑپنے سے یہ گمان ہو رہا ہے کہ شاید تو زلف پرشکن کی طاقت اور مضبوطی آزما رہا ہے۔ یہ تیرا دیوانہ پن ہے زلف کے پھندے بڑے مضبوط ہیں نہ تو ان کو توڑ سکیگا اور نہ رہائی پائیگا۔ الٹے تیرے بال و پر زخمی ہو جائیں گے۔

۹. رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو — ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

رگ و پے: رگ و ریشہ، پورا جسم۔ فرماتے ہیں کہ زہر غم ایسی چیز نہیں کہ ہر کس و ناکس اس کو کھا کر زندہ رہ سکے۔ اس زہر کو پچانا صرف ہم جیسے جوانمردوں کا کام ہے۔ ہمارا دیکھا دیکھی لوگوں نے بھی عشقبازی شروع کی ہے۔ اس کے زہر کی تلخی صرف ان کے کام و دہن تک پہنچ سکی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ رقیب اس کام و دہن کی تلخی کو بھی برداشت کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ زہر کا رگ و پے

میں پہنچنا بعد کی بات ہے۔ اس کی وہ کیا تاب لاسکیں گے۔

١٠۔ وہ آئینگے میرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں کہ دوست نے آنے کا جھوٹا وعدہ کیا ہے۔ اس کے وعدہ کا کیا بھروسہ یقیناً نہیں آئیگا۔ اس نے وعدہ اس لئے کیا ہے کہ چرخ کہن کا امتحان لے کہ کن کن طریقوں سے وہ ہم کو ستائیگا۔ اور انتظار و ہجر کی کن کن نئی تکالیف میں مبتلا کریگا۔

غزل نمبر ٧٦

١۔ کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں کہ معشوق اگر کسی وقت مہربانی پر بھی مائل ہوتا ہے اور میری طرف سے اس کے دل میں نیکی آجاتی ہے تو صرف اس قدر مہربانی کرتا ہے کہ اپنی پہلے کی جفائیں یاد کر کے شرما جاتا ہے مطلب یہ ہیکہ اس ظالم کے ستانے کے بیسیوں ڈھنگ ہیں ان کے منجملہ یہ بھی ایک انداز ہے۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح باندھا ہے ؎۔

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

مولانا حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں اس شعر کا مطلب یوں بیان فرمایا ہے: "یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں۔ اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اسکی کیا تلافی ہوسکتی ہے نیکی نہیں کرسکتا"

٢۔ خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

کھینچنا: گھسیٹنا' نزدیک کرنا۔ کھنچنا: کشیدہ ہونا، کنارہ کش ہونا' دور ہونا۔ فرماتے ہیں کہ اے خدا کیا جذبہ دل کا اثر الٹا ہے کہ میں معشوق کو جس قدر اپنے نزدیک کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ اسی قدر دور بھاگتا ہے۔

٣۔ وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں کہ معشوق بدمزاج ہے ایک آدھ بات بھی اچھی طرح نہیں سنتا۔ اور دوسری

طرف میری داستانِ عشق غیر معمولی طویل ہے۔ اس کی طوالت کو مختصر عبارت میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ سنتے سنتے قاصد بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر یہ ضدین کس طرح جمع ہو سکیں حاصل یہ کہ جس طویل داستان کو قاصد بھی پوری طرح نہ سن سکے وہ بدخو کیا سنے گا۔ اور بغیر سنے حالِ دل کا اس کو علم کیسے ہو۔ عجیب کشمکش ہے۔

۴۔ اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں کہ معشوق مجھ سے بدگمان اور متنفر ہے۔ بات بھی کرنی پسند نہیں کرتا اور اِدھر میری نقاہت کا یہ عالم ہے کہ منہ سے بات نہیں نکل سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ ہمارا حال ہی پوچھتا ہے نہ ہم بیان کر سکتے ہیں۔ پھر اس کو ہمارے دل کا حال کیسے معلوم ہو اور کس طرح اس کی بدگمانی اور تنفر دور ہو سکے۔ عجیب کشمکش ہے۔

۵۔ سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں کہ اے نا امیدی تیرا مجھ کو گرانا قیامت ہے کہ اس کی وجہ دوست کے تصور کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔ اس لئے مجھ کو سنبھلنے دے تاکہ خیالِ یار کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ مطلب یہ ہے کہ مایوسی جب انتہا کو پہنچ جائے گی تو اندیشہ ہے کہ دوست کا خیال بھی دل سے مٹ جائیگا۔ دوست کا خیال دل سے دور ہونا ہمارے لئے قیامت ہے۔

۶۔ تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

نظارگی: دیدہ بازی، دیکھنا مجازاً دیکھنے والا، نظارہ کرنے والا۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے دل کی بات ڈھکی چھپی رکھنا نہیں چاہتا۔ صاف صاف، بلا تکلف بتلائے دیتا ہوں کہ معشوق پر کسی کا نظر ڈالنا مجھ کو گوارا نہیں۔ خواہ نظارگیوں میں میں خود بھی شامل کیوں نہ رہوں۔

رشکِ غالب کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ رشک کی انتہا یہ ہے کہ غیروں کے علاوہ عاشق کو خود اپنی ذات پر بھی رشک آتا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۷۔ ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی   نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

نبرد: لڑائی ۔ لڑنے کا انحصار پاؤں پر ہے ۔ جب پاؤں ہی زخمی ہو جائیں تو انسان نہ لڑ سکتا ہے اور نہ میدان سے بھاگ سکتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ابتدائے عشق ہی میں کچھ ناکارہ سے ہو گئے ہیں : عاشقی کرنے کی توانائی ہے اور نہ دل اس کو چھوڑنا چاہتا ۔ مولانا حالی نے اس شعر کی تشریح اس طرح فرمائی ہے :۔ " اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی ابتدائے عشق میں انہیں کو صدمہ پہنچا ہے بس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے " (یادگار غالب)

۸۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

رشک کا ایک آخری درجہ باقی رہ گیا تھا اس شعر میں پورا ہو گیا ۔ یعنی خدا سے رشک فرماتے ہیں رشک کے سبب تو وداع کے وقت بھی میں نے اپنے معشوق کو یہ نہیں کہا میں تجھ کو خدا کو سونپتا ہوں یا خدا کے حوالے کرتا ہوں ۔ یہاں تو رشک کا یہ حال ہے اور وہ کافر رقیب کے ساتھ سفر کرے ہمارے لئے اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے ۔ بس یہ سمجھو کہ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے ۔

غزل نمبر ۷۷

۱۔ زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے   کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

مشق تماشا : دیکھنے کی عادت ۔ جنون علامت ، جنون کی علامت ، علامت جنون

فرماتے ہیں کہ دنیا اور مرغوبات دنیا کو کثرت سے دیکھنا یا اس میں محو ہو جانا جنوں کی علامت ہے اس لئے کہ دیوانے بھی گھومتے ہوئے ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتے ہیں ۔ دیوانگی کی سزا سیلی ہے ۔ دیوانہ جدھر جاتا ہے بچے دھول دھپے سے اس کی تواضع کرتے ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ دنیا کی مرغوبات کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں ان کو بھی ساتھ ہی سزا ملتی ہے مگر وہ غور نہیں کرتے ۔ آنکھوں کی بست و کشاد ان کے لئے سیلیٔ ندامت ہے مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا سے جس قدر وابستہ رہیگا اسیقدر اسکو ذلت و رسوائی اٹھانی پڑیگی

حسبِ ضرورت دنیا سے تعلق رکھے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے اپنے مالک کی یاد میں سارا وقت گزار دے۔

۲۔ نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ورطہ: مقامِ ہلاکت، گردابِ بھنور۔ آئینہ: مراد اس سے آئینہ کی آب، جلا، ہے۔

فرماتے ہیں کہ معشوق بد عہدی کے الزام کا دھبا اپنے سے دور کرنا چاہتا ہے۔ دھبہ دھونے کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ آبِ آئینہ سے ان دھبوں کو دھوتا ہے۔ مگر آبِ آئینہ بجائے اس کے کہ بد عہدی کے داغ ہٹائے معشوق کے حق میں ورطۂ ملامت بن جاتا ہے۔ شاعر نے معشوق کے آئینہ میں صورت دیکھنے کو آبِ آئینہ سے منہ دھونے سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق بناؤ سنگار کر کے آئینہ میں صورت دیکھتا ہے تو اس کو اپنا عہد جو ہمارے ساتھ کیا گیا تھا یاد آجاتا ہے اور اس کو ندامت ہوتی ہے کہ میں نے عہد کس سے کیا تھا اور کہاں جانے کی تیاری

۳۔ بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

سلکِ عافیت: امن کی ڈوری + عجز: مسکینی، ناچاری مجازاً قناعت + سرِ رشتہ: ڈوری کا سرا

قاعدہ ہے کہ تاگے کو اگر زیادہ بل دیا جائے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حرص و ہوا کی پیچ و تاب سے سلکِ عافیت ٹوٹ جاتی ہے۔ یعنی ہوا و ہوس سے انسان کا امن و چین غارت ہو جاتا ہے۔ جتنی دولت زیادہ ہوگی اسی قدر حرص بھی زیادہ ہوگی حرص و ہوس میں مبتلا ہونے کے بعد سکون و چین کہاں۔ اس لئے نصیحت فرماتے ہیں حرص و ہوس کے پیچ و تاب میں پڑ کر اپنا سکون مت کھو۔ اس کے برعکس سلامتی قناعت اور مسکینی میں ہے۔ اس لئے نگاہِ عجز پیدا کرتا کہ سلامتی نصیب ہو۔ تارِ نگہ اور رشتہ میں تشبیہ ہے اس لئے نگاہِ عجز کو سرِ رشتۂ سلامت کہا۔

۴۔ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

فرماتے ہیں کہ رقیب کا دعوائے عشق بے بنیاد اور جھوٹا ہے مگر قیامت تو یہ ہے کہ دوست اسی کو سچا عشق سمجھ کر اس سے وفا کرتا ہے مصنوعی اور جھوٹے عشق کے مقابلے میں وفا ایسی ہی بے محل ہے جیسے جنونِ ساختہ یعنی بناوٹی دیوانگی کے مقابلے میں موسمِ بہار بے محل ہے۔

یا

یہ کہ اگر معشوق بیوفا ہو تو اس صورت میں عشق کا دعویٰ باطل ہے اس لئے کہ دعویٔ عشق صرف بے وفائی کے مقابلہ میں درست ہے۔ اگر کوئی معشوق کی وفاداری کی حالت میں عشق کا بے بنیاد دعوےٰ کرے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص فصل گل میں جنون کا جھوٹا ڈھونگ رچائے۔ معشوق کی وفاداری کو فصل گل اور دعوئے عشق کو جنون ساختہ سے استعارہ کیا ہے۔

غزل نمبر ۷۸

۱۔ لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو اپنی رسوائی کے خیال سے اپنی محفل میں آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اگر مجھے اجازت دے تب بھی تیری رسوائی نہ ہوگی۔ کیوں کہ میں اتنا لاغر و نحیف ہوں کہ کسی کو نظر تک نہیں آتا۔ اگر کوئی مجھ کو دیکھ سکے اور اس رو سے تجھ پر کوئی حرف آئے تو اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں اتنا لاغر ہوں کہ کوئی کسی کی نظر مجھ پر پڑ نہیں سکتی فرش پر لیٹ جاؤں تو فرش ہی معلوم ہوں۔

۲۔ کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے

حیلہ: تدبیر فرماتے ہیں کہ میری حالت اس درجہ خستہ اور نازک ہے کہ جو بھی دیکھے ترس کھائے اس لئے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ شوخ بھی اگر میری اس حالت کو دیکھے تو اس کو رحم آجائے مگر وہاں جانے کا یارا نہیں اس لئے اے دوستو خدا واسطے کسی نہ کسی تدبیر سے مجھ کو معشوق کے پاس پہنچا دو

۳۔ منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا۔ پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

آنکھیں دکھلانا یا دکھانا: قہر کی نظر سے دیکھنا، خفا ہونا۔ یعنی منہ دکھانا مہربانی کی علامت ہے مگر معشوق سے مہربانی کی توقع نہیں۔ البتہ قہر و عتاب اس کی عادت ہے اس لئے قہر و عتاب کرنے میں اس کو کوئی تامل نہ ہوگا۔ عاشق کو تو صرف دیدار منظور ہے خواہ وہ باندازِ

عتاب ہو یا بطریق لطف و کرم۔ ان ہر دو صورتوں میں اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے اس لئے معشوق کو دھوکہ دیا جا رہا ہے کہ مہربانی نہ سہی عتاب ہی سہی۔ بمنہ اگر نہیں کھلا چاہتا نہ دکھلا۔ پردہ اٹھا کر آنکھیں تو دکھلا دے خیال تھا کہ قہر و عتاب کی بہت دشوار نہ ہوگی۔

۴۔ یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف اگر بن جاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

فرماتے ہیں کہ میں زلف یار میں گرفتار ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس قید و بند سے رہائی پاؤں لیکن وہ ظالم میری گرفتاری سے خوش ہے۔ رہا ہونے نہیں دیتا۔ اگر کسی طرح آزاد ہو جاؤں جیسا کہ اس کی زلف آزاد ہے تو پھر بھی وہ مجھے کسی دوسرے طریقے سے گرفتار کرے گا جس طرح زلف کو شانہ میں الجھا دیا جاتا ہے اور اس کی آزادی باقی نہیں رہتی۔

غزل نمبر ۷۹

۱۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یعنی بچوں کے کھیل میں استقلال و پائیداری نہیں۔ ایک چیز بناتے ہیں تھوڑی دیر اس سے کھیلتے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں میری نظر میں دنیا کی یہی مثال ہے جو چیزیں بنتی ہیں کچھ عرصہ بعد فنا ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہو کہ دنیا ایک ناٹک ہے جس میں ہر شخص اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ تماشے یہ ڈرامے رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اورنگ: تخت۔ بات: معمولی بات، غیر اہم بات۔ فرماتے ہیں کہ تخت سلیمان کا ہوا میں اڑنا اور دم عیسیٰ سے مردہ کا زندہ ہونا عوام میں حیرت و استعجاب کا باعث ہے اور ان کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ تخت سلیمان ایک کھیل تھا جو بنا اور بگڑا اور اعجاز مسیحا ایک معمولی بات تھی جو منہ سے نکلی اور ہوا میں گم ہو گئی ثبات و قرار ان کو حاصل نہ ہو سکا۔

۳۔ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

فرماتے ہیں کہ عالم امکان کی صور و اشکال صرف نام ہیں ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں اسی طرح دنیا کی اشیاء کا وجود وہم ہی وہم ہے اس میں اصلیت نہیں مطلب ہے کہ اس عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے ان کا اپنا علٰحدہ کوئی وجود نہیں یہ سب ہستی مطلق کا ظہور ہے۔

۴۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے۔

نہاں : پوشیدہ۔ خاک پر جبیں گھسنا : اظہار عجز کرنا۔ فرماتے ہیں کہ میری صحرانوردی سے اور اپنی کرتا ہی وکم مائگی سے شرما کر صحرا اپنا منہ گرد میں چھپا لیتا ہے اور جب میں رونے پر آتا ہوں تو میرے سیلاب گریہ کو دیکھ کر دریا بھی اظہار عجز کرتا ہے۔

۵۔ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

رنگ : حال۔ فرماتے ہیں اے دوست تیرے غیاب میں میرے اضطراب و پریشانی کی حالت مجھ سے مت پوچھ۔ اس کا ایک ادنیٰ نمونہ تیری بے قراری دیکھنی ہے جب تو میرے پاس آتا ہے۔ یعنی میری موجودگی میں تو جیسے مضطرب و پریشان رہتا ہے تیری عدم موجودگی میں میں بھی اسی طرح بے چین و بیقرار رہتا ہوں۔

۶۔ سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بت آئنہ سیما مرے آگے

خود بین : مغرور۔ خود آرا : خود نما۔ آئنہ سیما : حسین۔ رقیبوں کے طعن کا جواب ہے کہ تم جو مجھکو خود بین و خود آرا کہتے ہو سچ ہے۔ میں مغرور بھی ہو گیا ہوں اور خود نمائی بھی کرتا ہوں۔ میں مغرور کیوں نہ ہوں جب کہ دوست میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس خوش نصیبی پر میں جتنا بھی ناز کروں بجا ہے۔

۷۔ پھر دیکھیے انداز گل افشانیٔ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے۔

فرماتے ہیں کہ میرے سامنے شراب اور پیالہ لا کر رکھ دو اور پھر دیکھو کہ میرے منہ سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ یعنی عالم سرور کی خوش گفتاری اور خوش کلامی کا انداز قابل دید ہے

بعض رقعوں سے جو احباب کے نام لکھے گئے ہیں پایا جاتا ہے عموماً رات کے وقت عالم بہردر میں فکر سخن فرماتے تھے ۔ اپنی اسی عادت کو اس شعر میں بیان فرماتے ہیں ۔

۸۔ نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

فرماتے ہیں کہ رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی معشوق کا نام بھی میرے سامنے لے اگر دوسرا شخص اس کا نام اپنی زبان پر لاتا ہے تو مجھے ناگواری ہوتی ہے ۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتا اگر لوگوں سے یہ کہوں کہ اس کا نام میرے سامنے مت لو تو اندیشہ ہے کہ معشوق رنجیدہ ہو جائے اور میرے اس منع کرنے کو نفرت پر محمول کرے ۔

۹۔ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مطلب یہ ہے کہ کفر کی آزادیاں مثلاً مے نوشی کی اجازت عشقبازی کی سہولتیں عبادات کی آسانیاں مجھ کو اپنی طرف مائل کر رہی ہیں ۔ اور بہ اعتبار اعمال و افعال یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں کفر کی جانب قدم بڑھا رہا ہوں اس لئے بظاہر میرا رخ کلیسا کی سمت ہے لیکن کعبہ یعنی قوت ایمانی مجھ کو کافر بننے سے روک رہی ہے چونکہ یہ قوت (کعبہ) پیچھے ہے اس لئے نظر نہیں آتی ۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ظاہری اعمال کی وجہ مائل بہ کفر نظر آتا ہوں لیکن اسلام کی صداقت اور اسلامی تصورات کا دل سے قائل ہوں یہ قوت ایسی زبردست ہے کہ مجھے گمراہ نہیں ہونے دیتی خود ہی فرماتے ہیں " آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں "

۱۰۔ عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرماتے ہیں کہ عاشقوں میں مجھ کو امتیاز حاصل ہے ۔ دوسرے عشاق معشوقوں پر مرتے ہیں مگر معشوق التفات نہیں کرتے اس کے برخلاف میری محبت و وفاداری و عالی حوصلگی کا سکہ بلکہ معشوقوں کے دل پر ایسا بیٹھا ہے کہ وہ اپنے اپنے عاشقوں کو حقیر سمجھتی ہیں ۔ چنانچہ لیلیٰ میرے مقابلہ میں مجنوں کو برا کہتی ہے ۔

۱۱۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شب ہجران کی تمنا مرے آگے

فرماتے ہیں کہ شب ہجر میں میں نے مرنے کی آرزو کی تھی مگر اس وقت موت نہیں آئی۔ قسمت کی خوبی تو دیکھئے شب وصل معشوق کے آنے کی خوشی میں شادی مرگ ہو گئے۔ گویا جو آرزو شب ہجر کی تھی شب وصل پوری ہو رہی ہے۔ وصل کی خوشی سب ہی کو ہوتی ہے لیکن ہماری طرح خوشی سے مر نہیں جاتے۔

۱۲۔ ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو　　　آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

قلزم خون: خون کا دریا۔ فرماتے ہیں کہ آنکھوں سے ایک خون کا دریا جاری ہے کاش اسی پر بلا ٹل جائے۔ معلوم نہیں کہ آئندہ اور کیا کیا مصیبتیں آنے والی ہیں۔

۱۳۔ گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نزع کی حالت میں فرماتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں کا دم نکل چکا ہے لیکن آنکھوں میں جان ہے اس لئے جب تک آنکھوں کا بھی دم نہ نکل جائے ساغر و مینا کو میرے سامنے سے مت اٹھاؤ۔ یعنی شراب پینے کی صلاحیت نہ ہو تو کیا۔ مرتے ہوئے شیشہ و ساغر کو دیکھ کر ہی ارمان نکال لیں۔

۱۴۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا　　　غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

فرماتے ہیں کہ غالب بھی میرا ہم پیشہ یعنی عاشق اور ہم مذہب و ہمراز ہے۔ بھلا اس کو میرے سامنے کیوں برا کہتے ہو ظاہر ہے کہ اس قدر دوستی و محبت کے بعد اسکی شکایت سے ہمکو تکلیف ہوگی

غزل نمبر ۸۰

۱۔ کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے　　　تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

مطلب یہ ہے کہ میں جب دوست سے عرض کرتا ہوں تو بیان کرنے نہیں دیتا۔ بیزاری کے انداز میں کہتا ہے کہ یہ داستاں ہم نہیں سننا چاہتے مختصراً اپنا مدعا بیان کرو۔ اس پر دوست کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ جب آپکی بیزاری کا یہ عالم ہے تو آپ ہی بتلائیے ہم کس توقع پر اظہار مدعا کریں۔ حالات و واقعات کو علم میں لائے بغیر مدعا کس طرح بیان کیا جائے۔

۲۔ نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں　　　مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

یعنی عاشق خوشامدی ہوتا ہے۔ جو بھی جا و بے جا معشوق کی زبان سے نکلے اس کی تعریف کی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ جہاں کوئی بات اس نے کہی کہ بجا ہے، سچ فرماتے ہو، سبحان اللہ، واہ واہ، کے الفاظ عاشق کی زبان سے نکل پڑے۔ ایسی صورت میں اگر معشوق طنزاً اپنے آپ کو ستمگر کہے اور عاشق، اپنی عادت سے مجبور، نادانستگی میں کہنے بیٹھے کہ "آپ بجا فرماتے ہیں" تو بڑی قباحت کی بات ہے اور گستاخی ہے۔

شاعر کا منشا یہ ہے کہ دوسری باتوں کے جواب میں ہم جو "بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو" کہتے ہیں یہ تو بطور خوشامد جھوٹی تعریف کرتے ہیں یعنی سمجھتے ہیں کہ معشوق غلط کہہ رہا ہے۔ پھر بھی تائید کئے جاتے ہیں۔ لیکن جب اس کے منہ سے یہ نکلے کہ ہم ستمگر ہیں اور ہم اس کی تائید میں کہیں کہ بجا فرماتے ہیں تو یہ ایک سچی بات کی تائید ہوگی اور وہاں حق بات پر زبان کٹتی ہے۔

۳۔ وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے ... نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

آشنا: دوست، محبوب، عزیز۔ فرماتے ہیں کہ دل میں وہی چیز اتر جاتی ہے جو عزیز اور محبوب ہوتی ہے چونکہ نگاہِ ناز بھی دل میں اتر جاتی ہے اس لئے وہ ہمکو محبوب اور عزیز ہے۔ اگرچہ کہ اس کا دل میں اترنا نیشتر کے چبھنے کے مانند ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں ... وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

جراحت، زخم۔ عود ہندی میں حضرت غالب کا خط مولوی عبدالرزاق صاحب کے نام ہے۔ اس خط میں نقش فریادی الخ۔ شوق ہر رنگ الخ۔ زخم نے داد نہ دی الخ ان تینوں شعروں کا مطلب خود شاعر نے لکھا ہے۔ تیسرے شعر کی تشریح کے ضمن میں اس شعر کا مطلب بھی بیان فرمایا ہے فرماتے ہیں:۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں شعر۔ نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکان ۔ وہ زخم تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہئے۔ یعنے زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے" اس کے بعد مزید تشریح غیر ضروری ہے۔

۵۔ جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے   جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

اس شعر میں حکیمانہ نصیحت اور اخلاقی تعلیم ہے۔ فرماتے ہیں جو شخص تمہارا مخالف ہو اس کی مخالفت یا اس سے عداوت تم مت کرو۔ اسی طرح اگر کوئی گالی دے سنکر خاموش ہو جاؤ پلٹ کر تم اس کو گالی مت دو۔ اس میں بڑی حکمت یہ ہے کہ مخالفت بڑھنے نہیں پاتی اور بات وہیں ختم ہو جاتی ہے۔

۶۔ کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیے   کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے   کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

جانکاہی: تکلیف ۔ رنج گراں نشیں: ایسی بیماری یا تکلیف جو جلد دور نہ ہو سکے۔ صبر گریز پا: صبر جس کو ثبات نہیں یا جو بھاگتے رہتا ہے۔ ہر دو شعر قطعہ بند ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عشق کی بیماری ہمارے لئے عذابِ جان ہو گئی ہے۔ کہیں اس مرض کی جانکاہی بیان کرنی پڑتی ہے۔ اور کہیں اس مرض کے علاج کی بے اثری کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔ بعض وقت اس گراں نشیں رنج کا رونا روتے ہیں اور کبھی اپنی بے صبری و بے قراری کی حکایت سناتے ہیں۔ غرض یہ کہ غم عشق میں اس کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔

۸۔ رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے   کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

خوں بہا: خون کی قیمت وہ رقم جو قاتل سے مقتول کے ورثا کو دلائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ عام قانون تو یہ ہے کہ قاتل سے بطور ہرجانہ خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کسی کو متقرر کرے تو اس کو سرزنش کی جاتی اور سزا دی جاتی ہے۔ لیکن دنیائے الفت کا قانون نرالا ہے۔ یہاں تو الٹے قاتل کو خوں بہا دینا پڑتا ہے۔ اور زبان کاٹنے والے کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو وہ عاشق ہی نہیں۔

۹۔ نہیں نگار کو الفت، نہ ہو نگار تو ہے   روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے
۱۰۔ نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو بہار تو ہے   طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

نگار : معشوق + روانی / روش : رفتار کی تیزی یا خوبی ۔ دونوں پہلے مصرعوں میں معشوق اور بہار کی ایسی دو صفتیں مذکور ہیں جو پسندیدہ نہیں ۔ ثانی مصرعوں میں ان کی ایسی صفات بیان کی ہیں جو مرغوب و محبوب ہیں ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر معشوق میں الفت نہیں ہے ۔ جانے بھی دو معشوق تو ہے اس کی چال کی روانی اور ناز و ادا کی مستی کی تعریف کیجئے ۔ اسی طرح اگر بہار کو پائیداری نہیں اس سے قطع نظر کرو ۔ اس کے باعث چمن میں تروتازگی اور ہوا میں جو خوبی پیدا ہو گئی ہے اس کا ذکر کیجئے ۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کے دو رخ ہیں ایک روشن اور دوسرا تاریک روشن رخ کو نظر انداز کر کے صرف تاریک رخ کو دیکھنا انسان کو تکلیف میں مبتلا رکھتا ہے اور ہمیشہ آدمی غمگین رہتا ہے ۔ اس کے برخلاف تاریک رخ سے قطع نظر کر کے صرف روشن پہلو پر نظر رکھی جائے تو انسان کی زندگی ہنسی خوشی میں گزر جاتی ہے ۔

۱۱ ۔ سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ ۔۔۔ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

سفینہ : کشتی + سفینہ کنارے سے آلگنا : عمر کا پایۂ تکمیل کو پہنچنا ۔ ناخدا : مراد زمانہ ۔

فرماتے ہیں کہ اب عمر کی کشتی اپنی منزل مقصود کو پہنچ چکی اور کنارے سے آلگی ہے ۔ یعنے مرنے کے دن آچکے ہیں ایسی حالت میں زمانہ کے ظلم و ستم کی شکایت خدا سے کیا کریں ۔ اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں ۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے زمانہ کا جور و ستم رک بھی جائے تو نتیجہ کیا مرنے کو تیار بیٹھے ہیں ۔ نقصان یہ ہے کہ تمام عمر ان مظالم کو مردانہ وار سہتے آئے مرتے ہوئے ان کا بیان کرنا کم حوصلگی ہے ۔

غزل نمبر ۸۱

۱ ۔ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ۔۔۔ دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا : بے شرم و بے باک ہونا ۔ پاک : آزاد یا شہدا + مطلب یہ ہے کہ جبتک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے

مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم اور بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے" (از یادگار غالب)

۲۔ صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

بہا: قیمت ۔ آلاتِ مے کشی: ساغر و مینا صراحی وغیرہ ۔ فرماتے ہیں کہ ہم بے ساز و سامان فقیر ہیں۔ بجز آلاتِ مے کشی اور کوئی سرمایہ و سامان ہمارے پاس نہیں تھا۔ شراب کی قیمت کی ادائی کے لئے ان آلاتِ میکشی کو بھی رہن یا فروخت کر دیا۔ شراب کی قیمت بھی ادا ہو گئی اور آلاتِ میکشی بھی باقی نہیں رہے اس طرح دونوں حساب پاک ہو گئے۔ اب بے فکر ہیں۔

۳۔ رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

رسوائے دہر: زمانہ میں بدنام ۔ طبیعتوں کے چالاک ہونا: تیز و طرار ہونا ۔ فرماتے ہیں کہ اے دوست آوارگی کی وجہ اس میں شک نہیں کہ تم دنیا میں رسوا اور بدنام ہو گئے لیکن ایک فائدہ تو ضرور ہوا وہ یہ کہ تم تجربہ کار شوخ اور طرار ہو گئے۔

۴۔ کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں کہ عاشق کی آہ و زاری کبھی بے اثر نہیں ہوتی۔ چنانچہ دیکھو کہ بلبل کے نالہ کی وجہ اس کے معشوق یعنی گل کا جگر چاک چاک ہو گیا ہے۔ گل میں تہ بہ تہ جو پنکھڑیاں ہیں اس کے جگر ہی کے تو ٹکڑے ہیں۔ پھر کون بلبل کے نالہ کو بے اثر کہہ سکتا ہے۔

۵۔ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہلِ شوق: عاشق ۔ فرماتے ہیں کہ عاشقان الٰہی ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ یہ ظاہر وہ موجود نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں آتشِ عشق میں فنا ہو چکے ہیں۔

۶۔ کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

"شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے ۔

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ ۔۔۔ دور تو و نزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جان از تو سلامت برد ۔۔۔ آں را بہ تغافل کشی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے ۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمکو فنا کر دیا ۔" (از یادگارِ غالب)

۷ اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش ۔۔۔ دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

رنگ : ٹھاٹھ، دھوم دھام ۔ غمناک ہو گئے : جل گئے ۔ فرماتے ہیں کہ دوست نے کل اس دھوم دھام سے اسدؔ کی نعش اٹھائی کہ شانِ جنازہ دیکھ کر سارے دشمن حسد سے جل گئے ۔ یا ۔ دوست نے اسدؔ کی نعش ایسے رنج و غم اور حزن و ملال سے اٹھائی کہ دشمن بھی غمناک ہو گئے

غزل نمبر ۸۲

۱۔ نشہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب ۔۔۔ شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

نشہ ہا : شراب یا شراب کے شیشے ۔ شاداب : ہرے بھرے، سیراب ۔ رنگ : لطف و سرور ۔ سازہا : باجے ۔ جوئبار : نہر، ندی ۔ شعر میں تشبیہات، استعارے اور لفظی رعائتیں ہیں اور صرف بزمِ طرب کی بہار دکھلائی گئی ہے ۔ یعنی بزمِ عیش و نشاط چار چیزوں سے مکمل ہوتی ہے ۔ شراب، نغمہ، چمن اور جوئبار۔ فرماتے ہیں کہ بزمِ عیش کے جملہ لوازم مہیا اور موجود ہیں شراب کے شیشے شاداب رنگ ہیں یعنے مے و سرور سے بھرے ہوئے ہیں ۔ اور باجے خوشی اور طرب سے معمور ۔ اب رہ گئے چمن و جوئبار سو شاعر کے تخیل نے ان دونوں کو بھی موجود کر دیا ہے ۔ شیشہ سر و نما اور سبز ہوتا ہے ۔ اس لئے اس کو سروِ چمن بنا دیا اور راگ کی مسلسل آواز جوئبار ۔ اس طرح بزمِ طرب کے جملہ عناصر مہیا اور موجود ہو گئے ۔

۲ ۔ ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست ۔۔۔ واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

یعنی رونے پیٹنے اور آہ وزاری سے بزم عیش برہم ہوتی ہے اس لئے بزم معشوق میں عاشق کو نالہ کناں دیکھکر ہمنشیں منع کر رہا ہے کہ اپنے نالہ سے معشوق کے عیش میں خلل مت ڈال۔ عاشق ہمنشیں کو جواب دے رہا ہے تو یہ مت کہہ میں اپنے نالوں سے بزم عیش کو برہم کر رہا ہوں۔ تو معشوق کی فطرت کیا جانے۔ میرے نالوں سے اس کو اسی طرح مسرت ہوتی ہے جیسے کہ نغمہ سے۔ اس لئے میرے نالے افزائش نشاط کا موجب ہیں اور میں نالے کر بھی رہا ہوں۔ اسی لئے کہ عیش و طرب میں اضافہ ہو۔

غزل نمبر ۳۰۳

۱۔ عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے ۔۔۔ دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

عرض: ظاہر کرنا۔ فرماتے ہیں کہ دانتوں کی خوبصورتی اور شوخی کو ظاہر کرنا اور اس پر اترانا مضحکہ خیز ہے (برائے خندہ ہے) اس لئے کہ یہ خوبصورتی پائیدار نہیں کچھ عرصہ بعد دانت گر جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ناز و شوخی بھی ختم ہو جائے گی۔ جس طرح دانتوں کی جمعیت کا کوئی بھروسہ نہیں بالکل اسی طرح احباب کی ہمیشہ یکجائی ممکن نہیں اگر کوئی جمعیت احباب کا دعویٰ کرے تو وہ بھی باطل اور مضحکہ خیز ہے۔

۲۔ ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ۔۔۔ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

عدم: غنچہ کی بالکل ابتدائی صورت جب کہ گل کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ یک جہاں: بہت زیادہ زانو تامل: رنج و غم۔ قفا: پیچھے۔ فرماتے ہیں کہ گل ابھی عدم میں ہے اور غنچہ انجام گل پر محوِ عبرت ہے۔ یعنی پھول کھلنے سے بیشتر غنچہ اس کے انجام پر رنج و افسوس کر رہا ہے۔ غنچے کی صدہا پنکھڑیاں ہنسنے (پھول بننے) سے پہلے زانوئے تامل پر سر جھکائے رہتی ہیں کہ گل کی ہنسی کا نتیجہ سوائے پراگندگی و پریشانی اور کچھ نہیں۔ اس شعر میں بھی بہ تبدیل تمثیل و استعارات وہی خیال ظاہر فرمایا گیا ہے جو اس سے پہلے شعر میں بیان ہوا ہے۔ کلی میں پنکھڑیوں کے تہ بہ تہ ہونے کو زانوئے تامل سے تمثیل کیا ہے اور ان کی پراگندگی کو خندہ سے۔

۳۔ کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

کلفت: رنج۔ افسردگی: غمگینی۔ دنداں بر جگر افشردن یا دندان در دل افشردن بمعنی جوکھوں میں ڈالنا، مہمات کو سر کرنے کی جرأت کرنا۔ افسردگی میں حرکت نہیں ہوتی اور بے تابی عین حرکت ہے۔ فرماتے ہیں کہ حرکت ہی میں برکت اور حقیقی خوشی ہے۔ جو لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے افسردہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ سعی و کوشش کی لذتوں اور اس کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ جان جوکھوں میں ڈالکر مہمات کو سر کرنے کی جرأت کرنا ہی سربلندیوں اور مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس شعر میں شاعر نے ایک بڑی حقیقت بیان کی ہے۔ ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں افراد و اقوام کی خوشحالی، ان کی اقبال مندی، اقران و امثال میں ان کی عزت کا راز صرف حرکت و سعی میں پوشیدہ ہے۔ جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔ بڑے سے بڑا خطرہ مول لیتے ہیں اور حصول مقصد کی سعی کئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مردہ قومیں آسودگی پسند اور افسردہ دل ہوتی ہیں مہمات سے جی چراتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ وہ عزت و خوشحالی کی اعلیٰ بلندیوں پر فائز ہیں اور یہ نکبت و ذلت کی انتہائی پستی میں پڑے ہوئے۔

۴۔ سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں کہ احباب ہماری اندرونی سوزش کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے اس کے منکر ہیں۔ البتہ ہونٹوں پر جو تبسم آتا ہے اس کو دیکھکر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم چین و آرام سے ہیں۔ ہمارے ظرف کو وہ کیا پا سکیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ غم و اندوہ سے دل دریائے خون ہے ہم اس کی پردہ پوشی کے لئے متبسم کئے جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۸۴

۱۔ حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

متاعِ جلوہ: متاعِ نظارہ۔ اختراع: نئی چیز ایجاد کرنا۔ اختراعِ جلوہ: نئے نئے طریقے اور نئے نئے اسلوب سے جلوہ گر ہونا، اپنے کو ظاہر کرنے کے نئے طریقے ایجاد کرنا۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کا حسن اگرچہ بے نیاز اور بے پروا ہے پھر بھی متاعِ نظارہ کا خریدار ہے یعنی اس کو شوقِ نمائش ہے۔ جس طرح ایک مخترع زانوئے فکر پر سر جھکائے مختلف اشیاء ایجاد کرتا ہے۔ معشوق آئینہ سامنے رکھکر خود نمائی اور خود آرائی کے بیسیوں انداز اختراع کرتا ہے اس لئے آئینہ معشوق کے حق میں زانوئے فکرِ اختراع ہے (شعر حقیقت و مجاز دونوں پر پوری طرح منطبق ہوسکتا ہے)

۲۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ وا گر دیدۂ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

آگہی: آگاہی۔ غفلت کی ضد۔ رنگ: یہ لفظ کثیر المعانی ہے فارسی میں اکثر معنوں میں آتا ہے اردو میں بھی اس سے زیادہ موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی میں اس لفظ کے ایسے بھی معنی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں جیسے لطف و سرور اور رنج و غم۔ باختن: کھیلنا۔

مطلب یہ ہے کہ آنکھ کا کھلا رہنا آگہی اور زندگی کی دلیل ہے۔ اور آنکھ کا بند ہو جانا غفلت اور موت کی علامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے غافل کب تک اس دنیا کے لطف و خوشی کے تماشے میں مصروف رہیگا۔ تیری آنکھ صرف اسی لئے کھلی ہے کہ دنیا کو وداع کرے۔ اب کوئی دم میں بند ہو جائے گی اور سب جلوے کافور ہو جائیں گے۔

غزل نمبر ۸۵

۱۔ جبتک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　　مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

راہِ سخن وا کرنا: بات چیت کا راستہ کھولنا، بات چیت کی بنا ڈالنا۔ فرماتے ہیں کہ دوست سے بات چیت کرنے کی راہ و رسم ڈالنے سے پہلے دل پر عشق و محبت کی چوٹ کھانی ضروری ہے جب دل میں زخمِ عشق پیدا ہو جائے تب معشوق سے بات کا آغاز اور محبت کی سلسلہ جنبانی ہو سکتی ہے۔ بغیر زخمِ دل کھائے زبان سے محبت کی ہزاروں باتیں کریں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور معشوق سے گفتگو کا راستہ نہیں کھلتا۔ حقیقت و مجاز دونوں پر حاوی ہے۔

۲۔ عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر　　کبتک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

یعنی دنیا درحقیقت وحشت و کلفت کا مقام ہے۔ اس کے ظاہری حسن سے کب تک دھوکہ کھاتے رہوگے۔ مجنوں کے غبارِ دشت کو طرۂ لیلی جیسا دلفریب اور حسین سمجھنا سخت غلطی ہے۔

۳۔ افسردگی نہیں طرب افزائے التفات ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ عاشق اگر افسردہ و ساکت رہے اور اپنے درد دل کی تڑپ بتائے معشوق کی التفات کی مسرت اس کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ البتہ جب وہ دردِ عشق سے تڑپنے لگے اس وقت وہ معشوق کے دل میں جگہ پیدا کرے گا اور دوست اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی اور جمود سے کوئی کام نہیں نکلتا اور نہ خوشی حاصل ہوتی ہے حرکت اور تڑپ سے مطلب برآری ہوتی ہے۔

۴۔ رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

ندیم: ساقی، دوست، عقدہ: گرہ فرماتے ہیں اے دوست مجھکو روتے ہوئے دیکھکر تو ملامت کر رہا ہے۔ تیرا ملامت کرنا اور رونے سے منع کرنا مناسب نہیں۔ میرا دل رنج وغم کی ایک پوٹ بن گیا ہے۔ آخر اس پوٹ کو میں کبتک نہ کھولوں کبھی تو کھولنے دے۔ مطلب یہ ہے کہ ضبط غم کی وجہ دل میں درد ہونے لگا ہے۔ رونے سے غم میں کچھ کمی ہو جائے گی اس لئے اے دوست رونے دے۔

۵۔ چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنا جگر چیر کر معشوق کے سامنے رکھدیا۔ مگر اس کے باوصف اس ظالم نے نہ تو التفات کی نہ تو پرسش حال۔ ایسی صورت میں گریباں کو چاک کر کے رسوا ہونے سے کیا فائدہ۔ جس بے رحم کو چاک جگر پر رحم نہ آیا چاک گریباں سے کیا متاثر ہوگا۔

۶۔ لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

لخت جگر: جگر کا ٹکڑا اگر یہاں اس سے مراد خون جگر ہے اس لئے کہ خون بھی جگر کا جزو ہے فرماتے ہیں کہ بحالت جنوں و وحشت صحرا نوردی کی وجہ صدہا کانٹے ہمارے جسم میں چبھے اور خون سے

ایسے رنگے گئے کہ کانٹوں کی ٹہنیاں شاخِ گل کی طرح سرخ ہو گئیں. گویا ہم نے صحرا کو اپنے خون سے گلستان بنا دیا ہے. جگر کا پورا خون صحرا کی باغبانی میں ختم ہو چکا ہے آخر کب تک صحرا کو اپنے خون سے سینچتے رہیں؟

۷۔ ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

یعنے نگاہ کی ناکامی کی وجہ برق کی چمک ہے۔ جس سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ نظر نہیں آتا پس اے دوست تیرا جلوہ بھی مانند برقِ نظارہ سوز ہے۔ تو تو روبرو ہے مگر ہم دیکھ نہیں سکتے۔

۸۔ ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

گوہر: موتی۔ گوہرِ شکست: سر پھوٹنے اور زخم آنے کی لذت یا فائدے کو موتی سے تشبیہ دی ہے۔ صدف۔ سیپی۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی جنون کا سودا کرے تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اس معاملے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ لڑکے جو پتھر اور اینٹ مجنون پر برسایا کرتے ہیں وہ مماثل سیپیوں کے ہیں اور جس طرح سیپی سے موتی نکلتے ہیں اسی طرح ان پتھروں سے گوہرِ شکست یعنی زخم پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اینٹ پتھر بھی اتنے ہی قیمتی ہیں جتنے کہ گوہر دار صدف۔ اور یہ فائدہ جنون کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ پھر جنون کا سودا کرنے میں کیا نقصان ہے؟

۹۔ سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

"یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر گئی۔ پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کیجاتی"

(از یادگارِ غالب)

۱۰۔ ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

اس شعر میں ایہام ہے۔ لفظ "یاس" کے دو معنی ہیں فارسی میں "یاسمن" کا مخفف اور عربی میں مایوسی و نا امیدی مگر اردو میں عموماً نا امیدی کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے شاعر نے اس قریب کے معنے کو چھوڑ کر یاسمن کے مفہوم میں باندھا ہے۔

وحشتِ طبیعتِ ایجاد : شاعری میں تخیل کی پرواز ۔ وحشت : پرواز، جولانی ۔ طبیعت ایجاد : مزاجِ شاعری یا تخلیق ۔ اب اس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ شاعری کا تخلیقی مزاج اپنی قوت تخیل کے ذریعہ پھول ہی پھول کھلاتا ہے ۔ پس شاعری ایسا فن نہیں کہ جس کی تمنا کوئی نہ کرے ۔ ہر شخص اس درد کا خواہاں ہے ۔ مگر یہ خدا کی دین ہے جس کو چاہا دیا ۔

۱۱ ۔ بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

یعنی دیوانہ آدمی بیکار ہی ہوتا ہے لیکن دیوانگی بیکار بیٹھنے نہیں دیتی اس نے ہمارے ذمہ سر پیٹنے کا شغل لگا دیا ہے اور ہم سر پیٹ رہے ہیں آخر کسی نہ کسی وقت سر پیٹتے پیٹتے ہاتھ بیکار ہو جائیں گے ۔ تب سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ کسی دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں ۔

۱۲ ۔ حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

گداختہ : پگھلا ہوا ۔ یعنی شمع پگھل کر فروغ پیدا کرتی ہے ۔ بغیر پگھلے نہ اس میں روشنی ہوتی ہے اور نہ خوبصورتی ۔ یہی حال شاعری کا ہے تاوقتیکہ شاعر کے دل میں سوز و گداز پیدا نہ ہو کلام میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ حسن کلام اور اس کا فروغ بعد کی بات ہے پہلے دل میں سوز و گداز تو پیدا کرو ۔

غزل نمبر ۸۶

۱ ۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ زمانہ میں درد دکھ کا علاج کرنے والا اگر کوئی عیسیٰ نفس معالج بھی ہو تو ہوا کرے ۔ مجھے اس سے کیا غرض ۔ میں تو اس کی حذاقت کا اس وقت قائل ہوں گا جب وہ میری بیماری کا علاج کرے ۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر دو مصرعوں میں کوئی کا اشارہ معشوق کی طرف ہو یعنی معشوق ابن مریم بنکر میرے دکھ کا علاج کرے ۔

۲۔ شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

آئین : قانون ۔ فرماتے ہیں ہم نے یہ مان لیا کہ دنیا کا انتظام شرع اور قانون کا پابند ہے۔ جس میں سب سے بڑا جرم کسی کو قتل کرنا ہے۔ لیکن ایسے قاتل کا جو صرف تیر نظر سے عشاق کو قتل کرے شرع و قانون بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

۳۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی؟

کڑی کمان : سخت کمان ۔ فرماتے ہیں کہ ہم سے اس کی وحشت کا یہ عالم ہے کہ دیکھتے ہی تیر کی تیزی سے فرار ہو جاتا ہے پھر ایسے ظالم کے دل میں کوئی کس طرح جگہ پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ معشوق کی بد دماغی کا یہ حال ہے کہ جہاں کسی نے اس کی بات کاٹی اور زبان کٹ گئی کسی کی مجال نہیں کہ اعتراض کر سکے۔ وہ جو کچھ فرمائیں خوشی سے سنے جائیں اور بس۔

۵۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ میں جنون میں ایسی ایسی راز کی باتیں کہے جاتا ہوں جن کا برملا کہنا مناسب نہیں۔ آخر دیوانہ ہوں نہ کہنے کی بات بھی کہہ دیتا ہوں۔ لیکن یہ باتیں ایسی حکیمانہ ہیں کہ ان کو عوام نہیں سمجھ سکتے اور ان کا نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔ بس خدا کرے کہ ان باتوں کو کوئی سمجھ نہ سکے۔

۶۔ نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی

۷۔ روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہر دو شعر صاف اور عام فہم ہیں۔ پند و نصائح سے ان کا تعلق ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی برا کہے تو تم سنی ان سنی کر دو۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے تو اس کا ذکر کسی سے مت کرو۔ اگر کوئی غلطی کر رہا ہے تو اس کو آگاہ کر دو اور اس کو بچاؤ۔ اگر کوئی تمہارا قصوروار ہو تو انتقام مت لو اس کو معاف کر دو۔ (شریفوں اور نیک لوگوں کے یہی آئین ہیں)

۸۔ کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ دنیا میں بے نوا فقیر سے لیکر بڑے سے بڑا بادشاہ بھی حاجتمند ہے۔ ایسی صورت میں ایک حاجتمند دوسرے کی کیا حاجت روائی کر سکتا ہے۔ سب کا ایک ہی حاجت روا ہے لہٰذا اسی سے رجوع کرنا مناسب ہے۔

۹۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

اس شعر میں سکندر کے آب حیواں تک پہنچنے اور محروم واپس لوٹنے کی تلمیح ہے فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام نے سکندر کی رہنمائی کی مگر سکندر کو سوائے ہلاکت اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جب ایسے تجربہ کار و جہاندیدہ بزرگ کی رہنمائی کچھ کام نہ دے سکی تو پھر اور کون ہے جس کو ہم اپنا رہنما بنائیں۔

۱۰۔ جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

فرماتے ہیں کہ گلہ شکوہ محبت اور دوستی کی علامت ہے دوست ہی ایک دوسرے کا گلہ کرتے ہیں اور اسکا منشا یہ ہوتا ہے کہ اگر آپس کی غلط فہمی سے کچھ شکر رنجی پیدا ہو گئی ہے تو وہ دور ہو جائے۔ لیکن جہاں دوستی اور محبت کی توقع ہی منقطع ہو چکی ہے تو گلہ شکوہ سے کیا حاصل۔

غزل نمبر ۸۷

۱۔ بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

فرماتے ہیں کہ میں نے یہ مانا کہ دنیا کا غم بہت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غم غلط کرنے والی چیز یعنی شراب بھی کم نہیں ہے۔ خوب شراب پئیں گے اور غم بھلائیں گے۔ اب رہی آخرت کی فکر اسکا بھی کوئی ڈر نہیں ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں۔ یہی میری نجات کے لئے کافی ہے۔

۲۔ تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

فرماتے ہیں کہ اے دوست تمہارے ستانے اور تکلیف دینے کے طریقوں سے ہم واقف ہیں۔ آپکا یہ دعویٰ کہ ہم تجھ پر ستم نہیں کر رہے ہیں غلط ہے۔ رقیب پر آپ کی مہربانی ہمارے

حق میں ستم نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ نے ہم پر ظلم کرنے کی ایک نئی طرز نکالی ہے۔

۳۔ کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے   کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

کٹنا: طے ہونا، اتمام کو پہنچنا۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی زلفِ پر خم درازی میں شبِ ہجر سے زیادہ دراز اور سیاہ ہے شبِ ہجر ہزاروں برس کی سہی مگر کٹ جاتی ہے لیکن زلف کی طوالت ختم ہی نہیں ہوتی۔ اگر زلف کی درازی بھی طے ہو سکتی تو اس کو ہم شبِ ہجر کہتے۔ یہ زہریلی بھی غضب کی ہے۔ ناگ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں سانپ کاٹ کر ہلاک کرتا ہے۔ اور یہ بغیر کاٹے دل و دماغ کو مسموم کرتی ہے۔ اگر سانپ کی طرح یہ بھی ڈستی تو ہم اس کو سانپ کہتے۔ لہٰذا نہ تو اس کو شبِ ہجر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور نہ ہم اس کو سانپ کہہ سکتے ہیں۔ خدا کے لئے بتلائے کہ اس زلفِ خم بہ خم کو آخر کہیں تو کیا کہیں۔

۴۔ لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود   کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

طالع: قسمت۔ مولود: بچہ، نوزائیدہ عموماً ہندوؤں میں بچہ پیدا ہوتے ہی نجومی پنڈت بلایا جاتا ہے جو علم نجوم کی رو سے زائچہ ڈال کر نومولود سے متعلق آئندہ کے واقعات قلم بند کرتا ہے اس کو جنم پتری کہتے ہیں۔ زائچہ سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ احکام ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی منجم اپنے اصولوں کے مطابق نومولود کے متعلق خواہ کچھ ہی لکھے وہ قابلِ اعتماد نہیں۔ قابلِ بھروسہ تو وہ تحریر ہے جو ازل میں دستِ قضا سے لکھی گئی ہے۔ مگر بجز خدا کے اور کسی کو کیا خبر کہ وہاں کیا لکھا گیا ہے۔ کوئی نجومی اس کو نہیں پا سکتا۔

۵۔ نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا   خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

حشر: اٹھنا۔ نشر: پراگندہ ہونا۔ حشر و نشر: قیامت۔ کیش: مذہب۔ ملت: میل جول، صحبت، جتھا، قوم۔ خدا کے واسطے: خدا کے واسطے بتاؤ۔ یعنی قسم اس شخص کی قابلِ بھروسہ ہوتی ہے جو خدا، حشر و نشر اور کسی مذہب کو ماننے والا ہو۔ لیکن جو ان باتوں کا قائل نہ ہو تو پھر ایسے بے دین کی قسم کا کیا اعتبار۔ ایسے کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔

۶۔ وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم   وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

گرانمایہ: قیمتی۔ مہر سلیمان: کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک مہر تھی جس پر اسم اعظم کا نقش کندہ تھا۔ اسی مہر کے اثر سے دیو، جن و پری آپ کے زیر فرمان تھے۔ مطلب یہ ہے کہ کامیاب حکومت کیلئے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سی داد و دہش اور جمشید کی سی اونچی نظر اور دور بینی ضروری ہے۔ اگر یہ صفات نہیں اور کسی کے پاس مہر سلیمان اور جام جم ہو بھی تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں۔

۷۔ سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی — یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

فرماتے ہیں کہ شعر و سخن میں غالب کی آتش بیانی کے ہم قائل ہیں لیکن اب اس میں شعر کہنے کی طاقت نہیں رہی۔

غزل نمبر ۸۸

۱۔ باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

خفقانی: مرض خفقان میں مبتلا، مالیخولیا یا جنون کا بیمار، جس کو اختلاج قلب کا عارضہ ہو۔ افعی: ایک نہایت زہریلا سیاہ سانپ جس کے کاٹے کی کوئی دوا نہیں۔ وحشت و اختلاج دور کرنے کے لئے جب میں بطور تفریح باغ میں جاتا ہوں تو میری اس حالت کو دیکھکر باغ کو بھی مذاق سوجھتا ہے اور مجھ کو اس طرح ڈراتا ہے کہ شاخ گل کا سایہ مجھے افعی نظر آتا ہے، قاعدہ ہے کہ خفقانی آدمیوں کو لوگ عموماً ڈرایا کرتے ہیں اور مجنوں پر پتھر پھینکا کرتے ہیں۔

۲۔ جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اگاتا ہے مجھے

جوہر تیغ، آب تیغ: تلوار کی وہ قدرتی ... لکیریں یا نقوش جس سے اس کی عمدگی ظاہر ہو۔ زہر آب: زہر ملا ہوا پانی۔ فرماتے ہیں کہ تلوار کو کسی پاک و صاف پانی سے آبدار نہیں کیا جاتا۔ زہر آب سے اس کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی حال دشمنوں اور حاسدوں کی زبان کا ہے۔ ان کی تیغ ہائے زبان بھی زہر آلود ہیں اور مجھ پر زہر آب برسایا کرتی ہیں۔ اسی زہر آب سے میری نمود ہے جس طرح پانی سے سبزہ کی نمود ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کی دشنام طرازیاں اور حاسدوں کے بے جا اعتراضات اپنے میری شہرت اور نام آوری کا باعث ہیں۔ اور میری خداداد صلاحیتیں عالم آشکارا ہورہی ہیں

۳۔ مدعا محو تماشائے شکست دل ہے آئنہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

یعنی میرا دل جو مثل آئنہ کے تھا ٹوٹ گیا ہے اور اس کے ٹکڑے منتشر ہو کر سینہ کو آئنہ خانہ بنا دیئے ہیں۔ مدعائے دل اسی آئنہ خانہ کے تماشہ میں محو ہے گویا کسی نے مجھکو آئنہ خانہ میں لئے جاتا ہے۔ جب اپنے شکستِ دل کے تماشہ میں محویت کا یہ عالم ہے تو مدعا سینے سے نکلکر زبان پر کیسے آئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے خوددار واقع ہوئے ہیں کہ اپنی کوئی غرض اور اپنا مدعا کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ دل شکستہ اپنی جگہ خاموش ہیں۔

۴۔ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں کہ اس آسمان و زمین کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ دنیا ایک مشتِ خاک اور ساری دنیا کا حاصل یا سرمایہ صرف رنج و غم ہے اور آسمان بھی میری نظر میں ایسا ہی حقیر ہے جیسا کہ بیضہ قمری بے بضاعت و بے قدر ہوتا ہے اور جسطرح بیضۂ قمری نالہ و فریاد کا سرمایہ دار ہے آسماں بھی رنج و غم کا منبع ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا اور اسباب دنیا قابل التفات نہیں جس نے اس دنیا میں دل رگایا اس کو سوائے رنج کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔

۵۔ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے ہیں دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

یعنی جبتک زندہ رہے دوست کی محفل میں بار نہیں ملا اور اگر بے حیا بن کر داخل ہو بھی گئے تو نکلوا دئے جاتے تھے۔ نہ اٹھائے جانے کی ایک ہی تدبیر تھی یعنی مرجانا چنانچہ مر گئے اب دیکھیں گے کہ ہم کو کون (اٹھا سکتا ہے) زندہ کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ مصرعہ ثانی کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھیں میری نعش کو کون اٹھا کر قبر تک لے جاتا ہے۔

غزل نمبر ۸۹

۱. روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی — اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی

کوکبہ: بادشاہ کی سواری کا جلوس۔ فرماتے ہیں، کہ راستہ سے بادشاہ کی سواری کا جلوس گزرا ہے۔ اس لئے راستہ کی خاک اپنے روندے جانے پر ناز کر کے سربلند ہو رہی ہے (بادشاہ کی سواری گزرنے سے جو گرد و غبار اٹھا اس کی توجیہ یہ ہے)

۲. جب اس کے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ — لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

فرماتے ہیں کہ لالہ زار کی شہرت اور عزت محض اس لئے ہے کہ بادشاہ اس کو دیکھنے آئے تھے ورنہ کیا لالہ زار اور کیا اس کی حقیقت۔

۳. بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے — کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

بھوکے نہیں ہیں: خواہشمند نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم کو سیر گلستاں کی خواہش نہیں ہے لیکن موسم بہار کی ہوا صحت افزا اور خوشگوار ہوتی ہے۔ اس لئے ہوا خوری کیلئے سیر گلستاں کیا کرتے ہیں۔ اس شعر میں بھوکے ہونا اور کھانا دو مصدروں کو جس انداز سے برتا ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔

غزل نمبر ۹۰

۱. ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

" خواہش پہ دم نکلنا اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنی۔ چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعہ میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" مقدر ماننے چاہئیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں " (از یادگار غالب)

مطلب یہ ہے کہ میرے ارمان یوں تو بہت نکلے لیکن ابھی ہزاروں ارمان نکلنے باقی ہیں جو ارماں اب دل میں باقی رہ گئے ہیں ان کے مقابلے میں نکلے ہوئے ارمان کم ہیں۔

۲۔ ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر — وہ خون جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

کیا رہیگا؟ : استفہام انکاری ہے یعنی نہیں رہیگا ۔

فرماتے ہیں کہ میرے جسم کا پورا خون عمر بھر کے رونے کی وجہ آنکھوں کی راہ بہ گیا اب جسم میں خون کہاں جو کسی کی گردن پر رہے ۔ اس لئے میرے قاتل کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ اگر وہ مجھ کو قتل کر دے تو اس پر کوئی وبال نہیں ۔ اس لئے میرے قتل سے ڈرنے کی اس کو کوئی وجہ نہیں ۔

۳: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے نکالا جانا ایک بہت پرانا قصہ ہے ۔ جو صرف سنتے آئے ہیں ۔ لیکن بے آبروئی کے ساتھ دوست کے کوچہ سے ہمارا نکالا جانا کل کا واقعہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا کوئے یار کی جنت سے نکالا جانا ایک حقیقی واقعہ اور کل کی بات ہے۔ اس کے برخلاف حضرت آدمؑ کا جنت سے نکلنا ایک پرانا واقعہ ہے ۔ دیکھا کسی نے نہیں ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔

۴۔ بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

معشوق کے حسن کی تعریف کا ایک نرالا ڈھنگ ہے ۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تو کشیدہ قامت اور سرو قد مشہور ہے لیکن درازی میں تیری زلفیں تیرے قامت سے بھی بڑی ہوئی ہیں ۔ اگر ان کے پیچ وخم کھل جائیں تو ان کے مقابلہ میں تیرا قد چھوٹا نظر آئیگا ۔ اور قد کی درازی کا اعتبار اٹھ جائے گا ۔ مطلب صرف معشوق کی قامت ، اور زلفوں کی درازی (خوبصورتی) بتلانا ہے

۵۔ اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

حضرت مرزا کے زمانے میں لکھے پڑھے لوگوں کی کمی تھی اس لئے بعض منشی اجرت پر خطوط و عرضیاں لکھا کرتے تھے ۔ شہر کے کسی آباد مقام پر دوات اور کاغذ سامنے اور قلم کان

پر رکھکر بیٹھا کرتے ۔ حاجتمند آتے اور خطوط یا عرضیاں لکھواتے ۔ کان پر قلم رکھنے کا متصدیوں اور منشیوں میں عام طریقہ تھا ۔

فرماتے ہیں کہ معشوق کو چاہنے والے صدہا ہیں جو اس کو نامہ و پیام بھیجتے رہتے ہیں ۔ اس لئے ہم ہر روز صبح کان پر قلم رکھکر نکلتے ہیں تاکہ اس کے عشاق ہم سے خط لکھوائیں کیونکہ ہم بھی عاشق ہیں ۔ معشوق کے آداب و القاب اور اظہار مدعا کے طریقوں سے واقف ہیں ۔ دوسرے منشی ان باریک نکات کو کیا جانیں ۔ اس شعر میں رقیبوں پر چوٹ بھی ہے ۔ یعنی دوسرے عشاق ان پڑھ جاہل چھٹو، نخو، نتھو، خیرو اس لئے دوسروں سے خط لکھوایا کرتے ہیں ۔ ان کم بختوں کو لکھنا تک نہیں آتا ۔

۶ ۔ ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی   پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

جام جم کی دوسری خصوصیت کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بہت بڑا تھا اور بجز جمشید کے دوسرا کوئی شخص اس جام بھر شراب نہیں پی سکتا تھا ۔

مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی جمشید کے زمانہ میں اس سے منسوب تھی ۔ لوگ کہتے تھے کہ جمشید جیسا مے نوش کوئی نہیں جمشید کے بعد سے آج تک پھر کوئی ایسا بلا نوش پیدا نہیں ہوا ۔ اس لئے بادہ نوشی کی نسبت کسی سے نہیں کی گئی اور جام جم بیکار و معطل پڑا رہا ۔ صدیوں بعد جم کا جانشین ملکہ پیر میں پیدا ہوا ہوں اس لئے بادہ نوشی اب مجھ سے منسوب ہو گئی اور جام جم کے بھاگ کھل گئے ۔ وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی جائے تعطل سے نکلکر میرے استعمال میں آئے ۔

۷ ۔ ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی   وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

خستگی کی داد پانا ۔ دکھ درد کا مداوا ہونا ۔

فرماتے ہیں کہ ہم نے جن احباب کے متعلق یہ خیال کیا تھا کہ وہ ہمارے رنج و غم کا کچھ علاج کریں گے ۔ جب کام پڑا اور تجربہ ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ ہم سے بھی زیادہ غم زدہ اور

زمانہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں۔ وہ ہماری کیا مدد کر سکیں گے۔

۸۔ محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا ــــ اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

دم نکلنا یا مرنا: کسی چیز کی انتہائی خواہش یا آرزو ہونا۔

فرماتے ہیں کہ محبت میں مرنا اور جینا دونوں ایک ہیں۔ یعنے جس پر مرتے ہیں اسی کو دیکھ کر جیتے بھی ہیں۔

۹۔ کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ ــــ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

فرماتے ہیں کہ میخانہ کی طرف واعظ کیوں جانے لگا۔ کہاں واعظ کا بلند مقام اور کہاں مے خانہ کی پستی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ جب ہم مے خانہ کے دروازہ سے نکل رہے تھے جناب واعظ اسی طرف جا رہے تھے۔ بس اتنا جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا اس کی ہم کو خبر نہیں۔ اگر شاعر یہ کہدیتا کہ واعظ مے خانہ میں داخل ہو رہا تھا تو شعر میں بلاغت نہ ہوتی۔ ابہام نے شعر میں حد درجہ لطف پیدا کر دیا ہے۔

غزل نمبر ۹۱

۱۔ کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے ــــ بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے

اے = جز+ ایک دوسری جگہ بھی استاد نے اس لفظ کو جز کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے ع

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے۔

اس مصرعہ میں اے کے معنی جز کے لئے ہیں۔ غالب کے علو مرتبہ کے لحاظ سے اس کو یہ حق تھا کہ کسی لفظ کو بمقتضائے مقام ایسے معنی دے جو کسی لغت میں نہیں ہیں۔ دوسری زبان خصوصاً انگریزی میں ایسی نظیریں ملتی ہیں۔ چنانچہ شیکسپیر اور بیکن اسپنسر وغیرہ نے بعض لفظوں کو ایسے معنوں میں استعمال کیا ہے جو عام طور پر دوسرے معنے رکھتے ہیں۔ اس شعر میں لفظ "اے" کے یہ معنی لئے بغیر شعر کا کوئی مطلب سمجھ میں آنا مشکل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کثافت موجب آزار ہے۔ جو چیز بھی ثقیل و کثیف ہوگی وہ لوگوں کے لئے بار خاطر ہے اس کے برعکس لطافت بے آزار چیز ہے۔ اس لئے ہم چاہتے تھے کہ لطافت میں ہوا سے گزر کر صدا بن جائیں۔ مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ صدا بھی پہاڑ اور گنبد کے لئے بار خاطر ہے۔ وہ اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے وہ یہ کہ پتھر سے جھڑی ہوئی چنگاری بن جائیں کہ پتھر سے نکلی اور آن واحد میں فنا ہو گئی بجز اس کے دوسری کوئی صورت نہیں کہ ہم کسی کے بار خاطر نہ ہوں۔

۲۔ بیضۂ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس　　　از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائے

بیضۂ آسا: انڈے کی مانند۔

فرماتے ہیں کہ میں اس جسم کے قفس میں اس طرح مقید و محبوس ہوں جس طرح چوزہ انڈے میں محبوس ہوتا ہے۔ مرغ کی زندگی کا آغاز انڈے کی قید سے رہائی کے بعد ہوتا ہے۔ اسی طرح جب میری روح اس قفس عنصری سے پرواز کر کے نکل جائے میری از سرِ نو زندگی کا آغاز ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی عارضی زندگی میری روح کی شایان نہیں البتہ مرنے کے بعد جو دوسری زندگی ہوگی وہ ابدی اور آزادی کی زندگی ہوگی۔

غزل نمبر ۹۲

۱۔ مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے　　　موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

فرماتے ہیں کہ معشوق کا انداز تغافل ویسا سحر آفریں ہے کہ اس کے شوق میں مستی بھی ہلاک ہے یعنی معشوق کی مخمور و نیم باز آنکھیں عاشقوں کے لئے ایسا سامان سرور و نشاط مہیا کر رہی ہیں جن کے مقابلہ میں شراب کی مستی ہیچ ہے۔ دوست کی خواب آلود ایک نظر موجِ شراب سے زیادہ پر کیف اور سرور آگین ہے۔

مطلب صرف اس قدر ہے کہ چشم ساقی کی مخموری شراب سے زیادہ

مستی پیدا کرتی ہے۔

۲۔ جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو　　جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جیب: کرتے یا قمیص کی وہ تھیلی جو گریبان یا دل کے مقام پر لگائی جاتی ہے۔ اور اس میں کوئی چیز رکھی جاتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آرزو کی بجائے زخمِ تیغِ ناز ہے۔ اور تھیلی (دل) کے زخمی یا چاک ہونے کی وجہ جتنی آرزوئیں تھیں سب گر کر خاک میں مل گئیں۔ اب جیبِ خیال (دل) چاک ہے اور اس میں کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔

۳۔ جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ　　صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

فرماتے ہیں کہ دیوانگی کی زیادتی کے باعث بوقت صحرا نوردی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ہم اس تیزی سے دوڑتے ہیں کہ صحرا گرد و غبار میں پوشیدہ ہو جاتا ہے اور جو دھول بلند ہوتی ہے ہماری آنکھ میں پڑتی ہے جس کی وجہ کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ یا۔ جوشِ جنوں کے مقابلے میں صحرا کی کوئی حقیقت نہیں ہماری نظر میں اسکی حیثیت صرف ایک مشتِ خاک کی ہے۔

غزل نمبر ۹۳

۱۔ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی　　قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

لبِ عیسیٰ کی جنبش: دمِ عیسیٰ۔ قیامت سنگین ہے: بہت گراں ہے۔ لعلِ بتاں: لبِ معشوق۔

فرماتے ہیں کہ عشاق جو معشوق کی جنبشِ لب کے کشتہ ہیں ایسی گہری نیند سو رہے ہیں کہ ان کو کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ آپ کی جنبشِ لب سے مردے زندہ ہو جاتے تھے۔ لیکن یہی جنبشِ لب کشتگانِ معشوق کے لئے لوری کا کام دیتی ہے اور ان کے خواب کو اور بھی گراں کر دیتی ہے۔

غزل نمبر ۹۴

۱۔ آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

مطلب یہ ہے کہ بارش اور سیلاب کی آمد سے نقش پا مٹ جاتے ہیں۔ اس لئے صدائے آب کے طوفاں سے ڈر کر نقش پا نے کان میں انگلی رکھ لی ہے تاکہ آمد سیلاب کی بھیانک آواز کان میں نہ آئے۔ اس شعر میں کوئی خاص خیال نہیں بجز اس کے کہ فنا ہونے سے ہر چیز ڈرتی ہے۔ حتیٰ کہ نقش پا نے بھی سیلاب کی آواز سے کان میں انگلی دے رکھی ہے نقش پا کی تشبیہ کان سے اور بٹیا کی انگلی سے دی گئی ہے۔

۲۔ بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

نبض پری ۔ پری جز پر کل کا اطلاق کیا ہے ۔ وحشت کدہ ۔ پاگل خانہ ۔

مطلب یہ ہے کہ بزم مے میں ہر شخص پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہے اور بزم وحشت کدہ بن گئی ہے۔ میخواروں کی یہ وارفتگی شراب کی مستی کا نتیجہ نہیں بلکہ ساقی کی چشم مست کے جادو کے اثر سے ہے۔ جب ساقی کی چشم فسوں گر سے سب میخوار بیخود و مدہوش ہو گئے ہیں۔ تو پھر شراب کی کیا ضرورت اس لئے موج بادہ پری بنکر شیشے میں بند ہو گئی ہے۔ گویا چشم ساقی کے سحر نے پری کو شیشے میں اتار دیا ہے۔

غزل نمبر ۹۵

۱۔ ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

فرماتے ہیں کہ میں تمنا اور آرزو کے طلسم کا تماشائی ہوں مجھے اس سے کچھ غرض نہیں کہ یہ طلسم کب ٹوٹتا ہے اور کب مطلب بر آتا ہے مطلب یہ ہے کہ میں آرزو اس لئے کرتا ہوں کہ اس طلسم کی دشواریوں اور پریشانیوں کو دیکھوں۔ آرزو پوری ہونے اور لطف اندوز ہونے کی غرض نہیں رکھتا۔

غزل نمبر ۹۶

۱۔ سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
میری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

فرماتے ہیں کہ میری سرنوشت میں شبہائے ہجران کا غم لکھا تو گیا ہے۔ مگر پڑھا نہیں جاتا نوشتۂ تقدیر کے ان مقامات پر جہاں شبِ غم کا ذکر ہے سیاہی کے دھبے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتبِ تحریر کے ہاتھ سے ان مقامات پر سیاہی گر پڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ شب ہائے ہجراں کی درازی کیا ہوگی اور غم ہجر سے کب نجات ملے گی۔

غزل نمبر ۹۷

۱۔ ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

ریشۂ نیستان = بانسری + خس بدنداں ہے: خس بدنداں گرفتن فارسی محاورہ ہے یعنی اظہار عجز کردن۔ اس شعر میں حیرت کے بعد لفظ "ہے" مقدر ہے۔ فرماتے ہیں کہ حیرت ہے۔ نالوں کا ہجوم سینے میں ہے لیکن ایک آہ بھرنے کا بھی مقدور نہیں دوسرے مصرعہ میں اس کی مثال دی ہے۔ یعنی منہ میں صدہا بانسریاں پکڑی ہیں لیکن یہ بانسریاں بجائے بجنے کے خموشی کے واسطے اظہار عجز کی علامت بن گئی ہیں مطلب یہ ہے کہ سینے میں صدہا نالے بھرے ہوئے ہیں مگر آہ نہیں بھر سکتے اور لبوں پر صدہا شکوے ہیں مگر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ہماری یہ مجبوری حیرت کی بات ہے۔

۲۔ تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے

جانستاں تر = زیادہ جان لیوا، بدخویاں = معشوق + نگاہِ بے حجاب = نظرِ التفات تیغِ عریاں = ننگی تلوار بمناسبت نگاہ بے حجاب۔

فرماتے ہیں کہ صاف بات تو یہ ہے کہ معشوقوں کی مہربانی ان کے ظلم سے زیادہ جان لیوا ہے اگر معشوقوں کی نگاہ کو تلوار فرض کر لیا جائے تو نگاہِ بے حجاب یعنی التفات کی نظر تیغِ عریاں کا کام کرے گی اس کے برخلاف تغافل کی نظر پر بے التفاتی کا غلاف

چڑھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی کاٹ تیغ عریاں کی طرح نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا لطف معشوقان زیادہ جانستاں ہوتا ہے۔ بہ نسبت ان کے تغافل کے۔

۳۔ ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

صبح بھی گریباں شب کو چاک کرکے نکلتی ہے۔ اور عاشق یا غمزدہ انسان بھی گریباں چاک کرتا ہے۔ عید مسرت و شادمانی کی نشانی ہے اور چاک گریباں غم و اندوہ کی۔ ان مبادی کو ذہن نشین کرنے کے بعد شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ غم کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ اگر تھوڑی بہت خوشی کے مواقع برس بھر میں ایک دو دفعہ آتے بھی ہیں تو وہ غم سے بدل جاتے ہیں لہٰذا صبح عید اوروں کے لئے تو شادمانی کا موجب ہوتی ہے مگر میرے لئے چاک گریباں سے بھی بدتر ہے یعنی رنج و غم کی علامت ہے۔

۴۔ دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

دستِ گرداں۔ تابع فعل، سرِ راہ بکتی ہوئی چیز، وہ چیز جو دوکان سے نہ خریدی جائے۔ ہاتھ ادھار، قرض، مستعار۔

فرماتے ہیں کہ ساغر معرفت ایسی متاع نہیں جو کسی دوکان میں روپیہ پیسہ دیکر خریدی جاسکے۔ جس طرح عام ساغر خریدے جاتے ہیں۔ یہ متاع صرف ساقی یعنی مرشد کامل ہی کے پاس ہے اور اس کی قیمت زر و مال نہیں بلکہ دل و دین ہے۔ دل و دین دیکر یہ متاع حاصل کرسکتے ہیں۔ دل دینے سے مراد عشقِ الٰہی ہے اور دین حوالے کرنے کے یہ معنی ہیں مذہب اور خدا سے متعلق ہمارے اپنے تصورات و معتقدات کو ترک کردیں اور جو بات پیر طریقت بتلائے اس پر یقین کامل رکھیں۔ اس شعر میں نقد بمعنی قیمت آیا ہے۔

۵۔ غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

مرجان: مونگا۔ قلزم: دریا۔ صرصر: تند و تیز ہوا۔

چراغ کو مرجان سے اور حوادث و مصائب کو قلزم صرصر سے تشبیہ دی گئی ہے۔
فرماتے ہیں کہ عاشق کی پرورش مصائب و مشکلات میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ مشکلات و
مصائب اس چراغ محبت کو خاموش نہیں کر سکتیں جو اس کے سینے میں روشن ہو چکا ہے۔
گویا عشق ایک چراغ روشن ہے جس کو باد صرصر خاموش کرنے کے بجائے اس کی حفاظت
کرتی اور ترقی دیتی ہے جس طرح قلزم مرجان کی پرورش کرتا ہے۔ مطلب یہ ہیکہ شدائد
و مصائب سے عشق اور بھی کامل ہو جاتا ہے۔

غزل نمبر ۹۸

۱۔ خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے ... نگاہ دل سے تیرے سرمہ سا نکلتی ہے

تماشا ادا: قابل تماشا ادا + سرمہ سا: سرمہ آلود۔

مطلب یہ ہے کہ زباں سے جو پرسش حال اور اظہار مہربانی ہوتا ہے اس میں وہ لطف اور
اثر نہیں ہوتا جو نگاہوں کی پرسش میں ہوتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں بحالت خاموشی
نگاہوں سے جو اظہار لطف و مہربانی ہو رہا ہے یہ ادا قابل دید ہے۔ چونکہ یہ نگاہ تیرے
دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لئے آنکھوں کی بجائے دل سے نکلتی ہے اور سرمگیں نگاہوں
کے مانند حسین و دلفریب ہوتی ہے۔

۲۔ فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ... صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فرماتے ہیں کہ صبا کبھی کبھار جو غنچہ کے پردے میں داخل ہوتی ہے تو غنچہ اس کو خلوت
میں پا کر اس بری طرح دبوچتا ہے کہ پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔ اسی پسینہ کا نام شبنم ہے۔

۳۔ نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ ... کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

فرماتے ہیں کہ معشوق کی تلوار کی کاٹ کا حال سینۂ عاشق سے کیا پوچھتا ہے۔
دریچہ کی طرح سینہ شق ہو گیا ہے اور ایسا کاری زخم آیا ہے کہ اس میں سے ہوا نکلتی ہے
لہٰذا دریچہ کو دیکھ لے اور اسی پر زخم سینہ کو قیاس کرے۔

غزل نمبر ۹۹

۱. جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

دشتِ تتار : چینی ترکستان کا وہ علاقہ جس میں مشہور شہر خطا و ختن واقع ہیں۔ جہاں کے ہرن مشک نافہ کے لئے مشہور رہیں۔

فرماتے ہیں جہاں جہاں نسیم زلف یار کی خوشبوے جاتی ہے وہ سرزمین مہک اٹھتی ہے۔ اور اس سرزمین کے بسنے والوں کے دماغ معطر ہو جاتے ہیں چنانچہ دشت تتار کے ہرنوں کے دماغ زلف یار سے خوشبو اخذ کر کے نافہ بن جاتے ہیں۔ یہ مشک نافے جو دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ ہرنوں کی ناف سے نہیں بلکہ دماغ سے نکلتے ہیں۔

۲. کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

سراغ: تلاش۔ جلوہ : دیدار ۔

فرماتے ہیں فرش شش جہت یعنی جملہ کائنات عالم حیرت میں آئینہ انتظار بنی ہوئی ہو معلوم نہیں کہ اس کو کس کے جلوہ کا کھوج و تلاش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز عالم حیرت میں حقیقت کی متلاشی ہے۔

۳. ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

یعنی ہمارے شوق کے مقابلے میں صحرا کی وسعت بہت کم ہے۔ ہماری تنگ و دو سے صحرا غبار بنکر ہوا میں اڑ اگیا۔ اور غبار کے ان ذرات نے صحرا کو اپنے اندر چھپا لیا ہے۔ اس لئے صحرا یا یں وسعت ہمارے غبار شوق کا شکار بن گیا ہے۔ گویا غبار کے ذرات دام ہیں اور صحرا شکار۔

۴. دل مدعی و دیدہ بنا مدعیٰ علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

یعنی دل نے دیدہ پہ دعوی دائر کر دیا ہے کہ دیدہ نے معشوق کا نظارہ کر کے

مجھ کو مبتلائے آلام کر دیا ہے۔ اگر دیدہ نے یہ قصور نہ کیا ہوتا تو میں گرفتار بلا نہ ہوتا۔
چنانچہ آج اس مقدمہ کی سماعت ہے۔

۵۔ چھڑکے ہے شبنم آئنہ برگ گل پہ آب اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

موسم بہار کے ختم پر جاڑوں کا آغاز ہوتا ہے اور شبنم جاڑوں میں گرتی ہے۔ لہٰذا شبنم کا گرنا اس بات کی علامت ہے کہ موسم بہار رخصت ہو رہا ہے۔ اس لئے بلبل کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ اب معشوق سے جدائی کا وقت آ گیا ہے۔

"اس شعر میں مرزا صاحب نے ایران کی رسم کو بیان کیا ہے۔ وہاں قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص سفر کرتا ہے تو مسافر کی پشت پر آئنہ رکھکر اس آئنہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحت وعافیت سے عزت و آبرو کے ساتھ واپس آنا نصیب ہو۔ فرماتے ہیں شبنم آئنہ برگ گل پر پانی چھڑک رہی ہے۔ وداع بہار کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔" (از مرأۃ الغالب)

۶۔ بچ آپڑی ہو وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہو

بچ آپڑی ہے۔ پاس و لحاظ کرنا ضروری ہے۔

فرماتے ہیں کہ معشوق نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میرا کام انتظار کرنا ہے۔ وہ وعدہ فراموش آئے یا نہ آئے مگر مجھے اس کے وعدہ کا پاس و لحاظ کرنا ضروری ہے۔

۷۔ بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر ہر ذرہ کی نقاب میں دل بیقرار ہے

فرماتے ہیں اے دوست وادی مجنوں کا ذرہ ذرہ اثر عشق سے دل بیقرار کیطرح معشوق پرست ہے۔ اگر اس وادی میں بے نقاب جائے گا تو تیرا حسن دیکھکر سب تجھ سے چمٹ جائیں گے۔

۸۔ اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

فرماتے ہیں کہ اے بلبل تھوڑے سے تنکے آشیاں کے لئے فراہم کرے۔ اس لئے کہ

فصل بہار کی آمد آمد کی خبر گرم ہے۔ جب فصل بہار آجائے گی تو تجھ کو آشیانہ کے لئے تنکے نہ مل سکیں گے۔ (مصرعہ اولیٰ میں آشیاں کے بعد فراہم کرلے مقدر ہے)

۹۔ دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی   اے بے دماغ آئنہ تمثال دار ہی

خبر: معرفت الٰہی، سیر: تفریح طبع۔

فرماتے ہیں کہ اے غافل دل بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کو ضایع مت کر۔ اگر راز معرفت کی اس کو خبر ہو جائے تو پھر اس دل کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ اور جو یہ چیز حاصل نہ ہو تب بھی اس کا وجود غنیمت ہے۔ یہ آئنہ تمثال دار ہے۔ یعنی اس پر معشوق مجازی کی تصویر بس یہی سیر و تفریح اور دل لگی بھی خالی از لطف نہیں۔

۱۰۔ غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط   اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہی

یعنی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ موت کو بھول کر عیش و نشاط میں محو ہو جاتے ہیں موت اچانک انہیں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب ایسا ہے تو میری عمر بھی غفلت اور نشاط (مےخواری) میں بسر ہو رہی ہے پھر کیوں موت نہیں آتی۔ اس کو اور کس بات کا انتظار ہے۔

غزل نمبر ۱۰۰

۱۔ آئنہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

آئنہ: یہاں اس سے مراد دوست کی تصویر جو آئنہ میں ہے، تماشا: انوکھی، نادر نایاب چیز۔

فرماتے ہیں کہ دوست لوگ مجھ سے تیرے حسن کی تعریف سن کر تیرا حسن دیکھنا چاہتے ہیں تو تو میرے پاس آتا نہیں کہ لوگ دیکھ کر میرے قول کی تصدیق کر سکیں۔ تجھ سا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں کہ اس کو لا کر پیش کر سکوں۔ البتہ ایک صورت یہ ہے کہ تیری تصویر ان کو دیدوں جس کو دیکھ کر وہ کہیں تماشا ہے۔ یعنی بے نظیر حسن ہے۔

۲. حسرت نے لا رکھا تیری بزمِ خیال میں　　گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

بزم خیال: عاشق کا دل + سویدا: دل کا سیاہ داغ۔

فرماتے ہیں کہ میرا دل تیری بزمِ خیال ہے۔ اس بزم کی آرائش کے لئے حسرتِ دیدار کا داغ جس کو سویدا کہا جاتا ہے۔ گلدستہ کا کام دے رہا ہے۔

۳. پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا　　افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

مطلب یہ ہے کہ کسی سے محبت ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہو جاتا ہے اور اسی انتظار کا نام تمنا یا آرزو ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو ہر عاشق مزاج کو پیش آتا ہے۔

۴. سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالئے　　وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

یعنی دردِ غریب الوطنی کا ہجوم ہے۔ اس درد و غم کو بھلانے کے لئے سر پہ خاک ڈالنی چاہیئے۔ مگر صحرا ہمارے غم کے مقابلہ میں ایک مشت خاک سے زیادہ نہیں۔ اگر صحرا کی پوری خاک بھی سر پر ڈال لی جائے تب بھی غم نہیں بھلایا جاسکتا۔ خاک بر سر کردن فارسی محاورہ ہے جس کے معنی بھلا دینے کے ہیں چنانچہ حضرت حافظ فرماتے ہیں

شعر۔ ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کن غمِ ایام را

۵. ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں　　شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

حسرتِ دیدار سے: حسرتِ دیدار کی وجہ سے۔ شوقِ عناں گسیختہ: شوق جو بے اختیار اور بے قابو ہوگیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چشم تر میں شوق گریہ جو بے قابو ہو چکا ہے۔ دریا کی شکل میں موجیں مار رہا ہے۔ یعنی اب ہم بے اختیار آنسو بہانے کو ہیں۔

۶. درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو　　صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

گلہائے بہار صبح بہار میں کھلتے ہیں۔ اسی طرح گل ہائے عیش کی شگفتگی کے لئے صبح عیش ضروری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ گلہائے عیش کی شگفتگی کی صبح پنبۂ مینا ہے۔

جوں ہی مینا کے منہ سے روئی کا ڈاٹ نکالا گیا اور میخوار شراب پینے لگے کہ گلہائے عیش کھلنے لگے۔ روئی کی سپیدی کو صبح کی سپیدی سے تشبیہ دی ہے۔

۷۔ غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

فرماتے ہیں اے غالب دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جس کو سب اچھا کہیں بڑے بڑے پیغمبروں اور اولیاءاللہ کو بھی برا کہنے والے ہیں پھر ہماری کیا حقیقت ہے۔ اگر واعظ تجھ کو برا کہے تو برا ماننے کی کوئی بات نہیں ع ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

غزل نمبر ۱۰۱

۱۔ شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

ادا: اشارہ۔

مطلب یہ ہے کہ اگر دل میں داغ سوزش کے باعث ہوں تو ایسے داغ دل کے لئے قابل فخر ہیں۔ اس کے برخلاف دل میں تو حرارت عشق نہیں اور صرف داغ ہی داغ ہوں تو وہ موجب شرم و عار ہیں۔ گل لالہ داغدار تو ہے۔ مگر اس میں سوز نہیں اس لئے وہ پشیمان ہے اور شبنم اس کی ندامت و پشیمانی کا اشارہ ہے۔ شاعر نے اس شعر میں اوس کے قطروں کو دو چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔ ایک تو عرقِ انفعال سے اور دوسرے دیدہ سے۔ دوسرے مصرعہ میں نظر گاہ حیا لانے سے مراد ہے کہ حیا داغہائے لالہ کی بے حیائی دیکھ رہی ہے۔ اور یہ شبنم کے قطرے اس کے دیدہ ہیں۔

۲۔ دلِ خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار آئنہ بدستِ بتِ بدستِ حنا ہے

فرماتے ہیں حسرتِ دیدار میں ہمارا خون شدہ دل بالکل اس آئنہ کے مانند ہے جو معشوق کے مہندی رچے ہوئے ہاتھوں میں ہے۔ اس شعر میں دلِ خون شدہ کی

تمثیل اس آئنہ سے کی ہے جو محبوب کے رنگین ہاتھوں میں ہے اس کے علاوہ دیدار کی حسرت دل کو بھی ہے اور آئنہ کو بھی۔ اس لحاظ سے دل خون شدہ اور آئنہ بدستِ معشوق بدستِ حنا میں کامل مشابہت ہے۔

۳۔ شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی   جی کسقدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

فرماتے ہیں کہ اگر شعلۂ عشق دل میں ہوتا تو اس کو جلا کر خاکستر کر دیتا اور ہم کو ہر قسم کے رنج اور افسردگی سے نجات مل جاتی۔ مگر دل میں شعلۂ عشق کی بجائے صرف عشق کی ہوس ہے۔ اس لئے دل ہمیشہ افسردہ و غمگین رہتا ہے۔ بس ہمارا جی اس بات پر جلتا ہے کہ ہوسِ عشق کی بجائے دل میں شعلۂ عشق کیوں نہیں جو دل کے ساتھ افسردگی کو بھی جلا دیتا۔ "شعلہ سے نہ ہوتی" یعنی افسردگی و تکلیف نہ ہوتی۔

۴۔ تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق   آئنہ بانداز گل آغوش کشا ہے

تمثال : فوٹو، تصویر۔

فرماتے ہیں کہ اے دوست تجھ میں تو شوخی ہے ہی لیکن تیری تصویر میں بھی بلا کی شوخی ہے اس لئے آئنہ نے پھول کی طرح آغوش کھول کر تیری تصویر کو اپنے سینے سے لگا لیا ہے۔ اس شعر میں کئی لفظی نزاکتیں ہیں۔ معشوق کی نزاکت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے لئے پھول جیسا نرم و نازک آغوش ہو۔ پنکھڑیوں کی تعداد کی مناسبت سے بصد ذوق کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ تمثال کے معنی اگر فوٹو کے لئے جائیں تو آئنہ سے مراد وہ آئنہ ہوگا جو فوٹو کی حفاظت کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اگر تمثال سے عکس معشوق مراد لیں آئنہ جس میں صورت دیکھی جاتی ہے۔

۵۔ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ   اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

کف خاکستر : مٹھی بھر راکھ + قفس رنگ = رنج و غم کا قفس۔

فرماتے ہیں کہ قمری آتشِ عشق میں جل کر ایک مٹھی راکھ کی رہ گئی ہے۔ اور بلبل کو بھی عشق نے رنج وغم کا ایک قفس بنا دیا ہے۔ اب ان دونوں کے پاس نہ دل ہے نہ جگر سب آتشِ عشق نے جلا دیا البتہ جگر سوختہ کا نشان نالہ کی صورت میں باقی رہ گیا ہے

(اس شعر میں " اے " کے معنی جز اور " رنگ " کے معنی رنج وغم کے ہیں)

مطلب یہ ہے کہ عاشقوں کا سرمایہ سوائے نالہ اور آہ وزاری اور کچھ نہیں۔

مولانا حالی فرماتے ہیں:۔ میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے جگر سوختہ یعنے عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ انہیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سنکر کہا کہ اگر وہ اے کی جگہ جز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرعہ اس طرح کہتے کہ۔ " اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے " تو مطلب صاف ہوجاتا۔ اس شخص کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہوجائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔" (از یادگار غالب)

۶۔ خوئے تیری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وحشتِ دل: دل کی بیقراری، جوشِ عشق + فرماتے ہیں کہ اے دوست اختلاط کے موقع پر تیری خاموشی و سنجیدگی کی عادت میرے دل کی تڑپ کو افسردہ کردیتی ہے۔ اس موقع پر تو معشوق کو بہت ہی شوخ اور چلبلا ہونا چاہیئے۔ معشوق ہوکر ایسی بے حوصلگی عاشق کے لئے ایک عجیب مصیبت ہے۔

۷۔ مجبوری و دعویٰ گرفتاریٔ الفت دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

دستِ تہِ سنگ آمدہ : پتھر کے نیچے کا ہاتھ مراد اس سے مجبور، لاچار ۔

مطلب یہ ہے کہ انسان بالارادہ گرفتارِ الفت نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں اس کی خواہش یا ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ جب محبت کا تیر دل کو چھیدتا ہے تو وہ گرفتارِ الفت ہونے پر مجبور ہے۔ اگر اس بلا سے وہ اپنے آپ کو آزاد کرانا بھی چاہے تو ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ ہم خود گرفتارِ الفت ہوئے ہیں غلط ہے۔ یہی حال پیمانِ وفا کا ہے۔ پیمانِ وفا بے بسی و لاچاری کا نام ہے یعنی عاشق وفا پر مجبور ہے۔

۸۔ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

فرماتے ہیں کہ تیغِ ستم ایک آئینہ ہے جس میں ان تمام لوگوں کی تصاویر ہیں جو اس تلوار سے شہید ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دوست کے ستم کو دیکھتے ہی ان عاشقوں کی شکلیں نظروں میں پھر جاتی ہیں جو ہماری طرح اس کا شکار ہو چکی ہیں۔

۹۔ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

"یہ خطاب ہے آفتابِ حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متہم بوجود ہے۔ اور فی الواقع اس کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اگر آفتابِ حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکہ جاتا رہے اور ہم فنا فی الشمس ہو جاویں۔ کیوں کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔"

(از یادگارِ غالب)

۱۰۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

شعر صاف ہے اور شوخی سے بھرا ہوا۔ فرماتے ہیں کہ جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں ان کی سزا تو مقرر ہے اور ہم قصوروار ہیں۔ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر جب انصاف ہی کرنا ٹھیرا تو جو ظلم ہم پر ہوا ہے اس کی بھی داد ملنی چاہیئے۔ یعنی جن گناہوں کا

ہم ارتکاب کرنا چاہتے تھے مگر ان کے کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ اور ہماری آرزو حسرت وافسوس میں مبدل ہو گئی۔ ایسی ہزاروں حسرتیں خونِ دل بنی ہوئی ہیں۔ آخر ان کا بھی کچھ لی ما ہونا چاہیئے۔ یعنے ثواب ملنا ضروری ہے۔ اگر اس طرح حساب لگایا جا تو ہم ہی فائدہ میں رہیں گے۔ اس لئے کہ کردہ گناہ تھوڑے ہیں اور ناکردہ گناہوں کی حسرت بہت زیادہ لہٰذا ثواب کی مقدار میں سے گناہوں کا عذاب منہا کر دیں تو ثواب کی بڑی مقدار ہمارے حق میں بچ رہے گی۔

۱۱۔ بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ — کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ تو لوگوں کی مخالفت سے کیوں رنجیدہ اور مایوس ہوتا ہے اگر دنیا میں تیرا ہمدرد کوئی نہیں ہے تو کیا ہرج خدا تو موجود ہے جو بیکسوں اور مظلوموں کی حمایت کرتا ہے۔

غزل نمبر ۱۰۲

۱۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

تجلی: تجلی باری تعالیٰ۔ ظہور: ظاہر ہونا۔ قد و رخ: ذات حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس شعر میں غالباً اس حدیث کی طرف اشارہ ہے (اَنَا مِنْ نُوْرِ اللہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنْ نُوْرِیْ) فرماتے ہیں اے محبوب خدا (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تجلی باری تعالیٰ کو اپنے نور کے لئے تیری ہی شکل منظور تھی۔ پس نور اس شکل میں جلوہ گر ہوا۔ گویا تیری ذات ظہور نور کا باعث ہوئی۔

۲۔ اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

"یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے:"

(از یادگار غالبؔ)

۳۔ واعظانہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

واعظ جنت اور وہاں کی شرابِ طہور کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ اس پر طنزاً فرماتے ہیں کہ واہ کیا بات ہے تمہاری شراب کی جس کو نہ تم خود پی سکو اور نہ کسی کو پلا سکو۔

۴۔ لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا   گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صور کی

فرماتے ہیں کہ روزِ حشر جب صور پھونکا گیا تو سب مُردوں کے ساتھ ہم بھی اٹھ بیٹھے ہمارے قاتل یعنی معشوق نے وہاں بھی اسی حاکمانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ شروع کردی کہ ہماری بغیر اجازت تو کیوں اٹھ بیٹھا۔ جناب کو خبر ہی نہیں کہ صورِ قیامت پھونکا جا چکا ہے۔ بے خبری و بے نیازی کی حد ہو گئی۔

۵۔ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج   اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

فرماتے ہیں کہ باغ میں بلبل اڑتی ہوئی چہک رہی ہے۔ اس کی یہ نغمہ سنجی بہار کی آمد کی خبر ہے لیکن ایسی اڑتی ہوئی خبر اور وہ بھی ایک طائر کی زبانی ہم کو بہار کی آمد کا یقین نہیں دلا سکتی۔ یقین تو جب آئے کہ بلبل کی طرح ہمارا دل بھی خوش ہو۔ اور سامانِ نشاط میسر ہوں۔ رنج و غم کی حالت میں بہار آئی تو کیا اور نہ آئی تو کیا۔

۶۔ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

فرماتے ہیں کہ اگرچہ اب بت خانۂ کعبہ میں نہیں ہیں لیکن کسی زمانہ میں ان کا مسکن خانۂ کعبہ ہی تھا۔ بعد میں نکال دیئے گئے۔ اس اعتبار سے بتوں کو بھی خانۂ کعبہ سے دور کا تعلق ہے۔

۷۔ کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

فرماتے ہیں کہ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح سب کو نفی میں جواب ملے۔ چلو ہم بھی کوہِ طور چل کر قسمت آزمائی کریں۔

۸۔ گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر   کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

فرماتے ہیں کہ انسان کو کبھی کبھار غصہ آجائے اور اس کے کلام میں تلخی پیدا ہو تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن دوست کی تلخ کلامی اور درشتی کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نالاں ہے. جو بات کرتا ہے شکایت کرتا ہے۔ اتنی تلخی بھی کس کام کی؟

۹۔ غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

"اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منت مانتے ہیں مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی وہ بیقدری" (از یادگار غالبؔ)

غزل نمبر ۱۰۳

۱۔ غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

گلفام: گل رنگ، سرخ۔ فرماتے ہیں ہمارا دل رنج و غم برداشت کرنے میں بہت کمزور ہے۔ دوسرے بڑے غم یہ کیا اٹھا سکیگا اس کے لئے تو شراب کا کم ہونا بھی ایک رنج گراں ہے۔

۲۔ کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دردِ تہ جام بہت ہے

"یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے۔ اس پر یہ ظاہر ہونے نہیں دیتا" (از یادگار غالبؔ)

۳۔ نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

"یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں" (از یادگار غالبؔ)

۴۔ کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ریائی: دکھاوے کا۔ پاداش: معاوضہ۔ طمعِ خام: بیہودہ لالچ۔ فرماتے ہیں کہ زہد ریائی کو تو کوئی نہیں مانتا سب اس کی برائی کرتے ہیں۔ البتہ زہد بے ریا کی سب عزت کرتے ہیں لیکن میں اس کو بھی نہیں مانتا اس لئے کہ زاہد جو عبادت کرتا ہے اس کے معاوضہ میں جنت کا طالب ہے۔ اور اسی لالچ میں عبادت کئے جاتا ہے

۵۔ ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اہلِ خرد: عقلمند۔ روشِ خاص: عقلا کی طرز جو جہال سے مختلف ہونی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ خردمند اور نادان کی زندگی اور طرز روش میں ضرور فرق ہونا چاہیئے۔ جو کام جہال کرتے ہیں اگر وہی کام خردمند بھی کریں تو پھر دونوں میں وجہ امتیاز کوئی چیز نہیں رہتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سب ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ جو راستہ جہال کا ہے اسی راستہ پر وہ لوگ بھی گامزن ہیں جو خردمند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جس کو دیکھئے رسم و رواج کا غلام بنا ہوا ہے۔ ان خردمندوں کی کوئی علٰحدہ روش نہیں پھر ہم کسی کو خردمند کیسے مانیں۔ حاصل یہ ہے کہ عقلمندی کے دعویدار تو بہت ہیں مگر حقیقی عقلمند کوئی نہیں یا اگر ہیں بھی تو الشاذ کالمعدوم۔

۶۔ زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

فرماتے ہیں کہ اے اہلِ قافلہ مجھے چاہِ زمزم پر ہی چھوڑ دو تاکہ میں جامۂ احرام کو جو مئے آلودہ ہو گیا ہے دھوتے رہوں۔ اس نجاست کی حالت میں طوفِ حرم سے مجھے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ بجائے ثواب کے الٹے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صاحبِ تقویٰ ہیں انکی عبادت البتہ کام کی ہے۔ مجھ جیسے آلودۂ عصیاں کی عبادت بے معنی ہے۔ نجات کی اسکے سوا کوئی دوسری صورت نہیں کہ بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہو کر اشکوں کا چشمہ بہاؤں اور داغ ہائے معصیت اس پانی سے دھوؤں۔

۷۔ ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

ابرام: استوار کرنا۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کو اپنے وعدہ سے انکار نہیں ہے۔ اور میں اس عہد کو استوار کئے جا رہا ہوں اس لئے اب تو بات بنی چاہیئے۔ اس کے باوصف اگر بات نہ بنے تو بڑی بدقسمتی ہے۔

۸۔ خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

فرماتے ہیں کہ اے مرگ تو آنے میں جلدی مت کر۔ اس لئے کہ میرا بہت سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اتنی مہلت دے کہ میں اپنا کام پورا کر لوں۔ میرے ذمہ یہ فرض عاید کیا گیا تھا کہ اپنے جگر کو خون کر کے آنکھوں سے بہا دوں لیکن پورا جگر ابھی آنکھوں سے نہیں ٹپکا ہے۔ یہ فرض جب پورا کر لوں تب تو شوق سے آنا۔

۹۔ ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے — شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

شعر میں تعلی ہے۔ فرماتے ہیں کہ غالبؔ کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ اقطاعِ عالم میں ہے۔ پھر کون ہے جو غالبؔ کو نہیں جانتا۔ وہ بڑا ہی باکمال شاعر ہے مگر ساتھ ہی اپنی ادق گوئی کی وجہ سے بدنام بھی بہت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صاحب نظر اور سخن سنج اس کے کمال کے معترف ہیں اور اس کو جانتے ہیں۔ کم سواد لوگ جو کلام نہیں سمجھ سکتے اس کو بدنام کرتے ہیں اس طرح وہ بھی جانتے ہیں گویا عالم اپنے طرز پر اور جاہل اپنے طور پر اس سے واقف ہیں۔

غزل نمبر ۱۰۴

۱۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

بلوریں ساغر میں سرخ رنگ کی شراب مثل چراغ کے ہے۔ جوش قدح: ساغروں کی کثرت اور ان کی گردش۔ فرماتے ہیں دوست کو مہمان کئے ہوئے اور بزم مئے پیالوں کی گردش سے روشن کئے ہوئے مدت ہو گئی ہے۔ اب بزم مئے کا اہتمام کر کے دوست کو بلانا چاہیئے۔

یا

معشوق کی یاد میں آنکھوں سے خون بہا کر ایک مدت ہو گئی ہے۔ اب پھر بزم خیال اور تصور معشوق میں آنکھوں سے خون بہا کر چراغاں کا سماں پیدا کر دیں گے۔

اس صورت میں بزم سے مراد بزم خیال ہے جوش قدح خونناب آنکھوں سے استعارہ ۔

۲ ۔ کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو ۔۔۔ عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ خون کے آنسو بہانے کے لئے جگر کی ضرورت ہے ۔ مگر جگر پارہ پارہ ہوکر پراگندہ ہے ۔ اس لئے اب جگر لخت لخت کو ایک جا جمع کر رہا ہوں تاکہ آنسوؤں کے ذریعہ مژگان کی دعوت کروں ۔

یا

اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس لئے جمع کر رہا ہوں کہ پھر دوست کے مژگاں کی دعوت دوں ۔ مژگان یار کی دعوت کئے ہوئے عرصہ ہوا ۔

۳ ۔ پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ۔۔۔ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ وحشت اور جنوں کو ضبط کرتے کرتے اب دم رکنے لگا ہے اس سے زیادہ ضبط و برداشت کی طاقت نہیں ہے ۔ وقت آگیا ہے کہ گریبان چاک کرکے سر بہ صحرا نکل جائیں ۔ گریباں چاک کئے ہوئے برسوں گزر گئے آخر کب تک صبر و ضبط کیا جائے ۔

۴ ۔ پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس ۔۔۔ مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ سیر چراغاں کا لطف اٹھائے بہت عرصہ ہوا ہے ۔ اس لئے اپنی شرر بار آہوں سے چراغاں کا سماں پیدا کر رہے ہیں ۔

۵ ۔ پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق ۔۔۔ سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک دوست اپنے کسی دوست کی مزاج پرسی کے لئے جاتا ہے اور جاتے ہوئے بیمار کے حسب حال کوئی چیز تحفتہً ساتھ لئے جاتا ہے اسی طرح عشق بھی ہمارے دل کی پرسش کو آرہا ہے اور چونکہ دل زخمی ہے اس لئے بطور تحفہ اس کے لئے لاکھوں نمکدان بھی ساتھ لئے ہوئے ہے ۔ مطلب صرف اس قدر ہے

کہ دلِ زخم خوردۂ محبت کو عشق پھر تڑپانے والا ہے۔

۶۔ پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
ساز چمن طرازی داماں کئے ہوئے

خامہ : وہ قلم جس سے نقاش یا مصور نقش کشی کرتا ہے۔ چمن طرازی : گل کاری

فرماتے ہیں کہ میں اپنے دامن پر گل کاری کرنے کے لئے خامہ مژگان کو خون دل سے بھر رہا ہوں۔ یعنی اب خوب رونا چاہتا ہوں۔

۷۔ باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ پھر دل و دیدہ آپس میں رقیب ہو گئے ہیں دل چاہتا ہے کہ معشوق کے تصور میں بیٹھا رہے اور شوق نظارہ کا متقاضی ہے کہ کوئے یار جاکر اس کے دیدار سے لطف اندوز ہو۔ غرض ان دو رقیبوں میں پھر کشمکش شروع ہو چکی ہے۔

۸ دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنمکدہ ویراں کئے ہوئے

پندار کا صنم کدہ ویران کرنا۔ خودداری و نخوت کو ترک کرنا۔

فرماتے ہیں کہ خودداری اور پاس عزت کو ترک کرکے دل کوئے معشوق کی طرف گالیاں کھانے جا رہا ہے۔

۹۔ پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

پھر شوقِ محبت معشوق کا طالب ہے تاکہ متاع عقل و دل و جان اسکی نذر کر دے۔

۱۰۔ دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

گل و لالہ : مراد حسین۔

فرماتے ہیں کہ گل و لالہ جیسے حسینوں کا تصور فردوس نظر بنا ہوا ہے۔

۱۱۔ پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

یعنی معشوق نے خط کے سرنامہ پر تلطف آمیز القاب لکھے ہیں اس لئے اسکی

دلفریبی پر جان قربان کرنے کے بعد نامۂ دلدار کھولنا چاہتا ہوں۔

۱۲۔ مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

یعنی پھر کسی معشوق کی طلب ہو رہی ہے۔ جو کوٹھے پر کھڑا ہو اور اس کی سیاہ

زلف رخ گلرنگ پر بکھری ہوئی ہو۔

۱۳۔ چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

دشنہ: خنجر۔

مطلب یہ ہے کہ پھر ایک حسین کی آرزو ہے جو آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا ہو۔

۱۴۔ اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ پھر ایک کمسن معشوق کو دل دیکھنا چاہتا ہے جو شراب پی کر چہرہ کو

گل کی طرح حسین بنائے ہوئے ہو۔

۱۵۔ پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں سر زیر بارِ منت درباں کئے ہوئے

معشوق کے در پر پڑے رہنے کی آرزو پھر ہو رہی ہے۔ مگر درباں وہاں کب

پڑے رہنے دیتا ہے۔ اس لئے اس کی منت و خوشامد بھی کرنی پڑے گی۔

۱۶۔ جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ پہلے جب کہ غم روزگار نہیں تھا فرصت ہی فرصت تھی

معشوق کے تصور میں گھنٹوں گزار دیتے تھے۔ اب پھر اسی فرصت اور اسی

تصور کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔

۱۷۔ غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں کہ ہم بھرے ہوئے بیٹھے ہیں جہاں کسی نے ذرا سا چھیڑا اور اشکوں کا

طوفان جاری ہو گیا۔ اس لئے اے غالبؔ تو اس وقت ہم کو مت چھیڑ ورنہ

سیلِ گریہ جاری ہو جائیگا۔

غزل نمبر ۱۰۵

۱۔ نوید امن ہے بیدادِ دوست جان کیلئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

نوید : خوشخبری۔

فرماتے ہیں کہ دوست کے مظالم ہمارے حق میں امن کی خوشخبری ہیں یعنی دوست نے بیداد کا کوئی شیوہ کوئی طریقہ کوئی انداز اور کوئی طرز ایسی نہیں چھوڑی ہے جس کو آسمان استعمال کرکے ہم کو ستا سکے۔ اس لئے اب آسمان کے ظلم سے نجات مل گئی

۲۔ بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کیلئے

فرماتے ہیں کہ اگر دوست کی مژہ اب بھی تشنۂ خون ہے میری بلا سے۔ اپنا بہت سا خون اس کو پلا چکا پھر بھی اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اب جو تھوڑا سا خون رہ گیا ہے وہ اپنی مژگاں خونچکاں کے لئے رکھ چھوڑتا ہوں۔

۳۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کیلئے

فرماتے ہیں کہ اے خضرؑ ایسی عمر جاوداں سے کیا حاصل۔ آپ کو دیکھو تو زندۂ جاوید ہیں مگر تنہائی اور روپوشی میں عمر گزر رہی ہے۔ نہ دوست ہیں نہ احباب ہیں نہ ملاقاتیں نہ محفلیں نہ تم کو کوئی دیکھ سکے نہ پہچانے۔ ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔ اس کے برعکس ہم کو دیکھئے۔ اگرچہ بہت تھوڑی سی عمر پائی ہے لیکن سب ہم کو جانتے پہچانتے ہیں۔ دوست احباب ہیں مجلسیں اور محفلیں ہیں۔ حقیقی زندگی تو یہی ہے۔

۴۔ رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فرماتے ہیں کہ معشوق کے ظلم کی بلا کیا کم ہے جو دوسری بلائیں مجھکو ستا رہی ہیں ایک بلا اس کے تغافل و ستم کی تھی اب اس پر رشک کی آفت کا اضافہ ہو رہا ہے

یعنی اس کا ستم صرف میرے لئے ہی مختص نہیں رہا بلکہ اک جہاں کے لئے بلائے جان بن گیا ہے۔ مجھ کو اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے ستم دوسرے کیوں اٹھائیں

۵۔ فلک دور رکھ اس سے مجھ کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کیلئے

درازدستی، ظلم۔

فرماتے ہیں کہ اے آسمان میں تنہا اس کا عاشق نہیں ہوں۔ اور دوسرے بھی بہت سے اس کے عاشق ہیں۔ معشوق عاشقوں پر اپنے ظلم کا امتحان کیا کرتا ہے۔ اس لئے مجھکو اس سے دور مت رکھ مجھ پر درازدستی کا امتحان ہونے دے۔ اگر تجھ کو ظلم سے بچانا ہی منظور ہے تو دوسرے کسی کو دور کر۔

۶۔ مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

"اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتی" (از یادگار غالب)

۷۔ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

" اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے۔ وہ بھی اس شعر کے انداز بیاں پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے۔ یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی ایک یہ کہ پاسباں نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسباں سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں۔ صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کیساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا

مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔" (از یادگار غالب)

"اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق سے فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا
(از یادگار غالب)

چنانچہ غزل سے گریز کرتے ہوئے اسی غزل میں پانچ شعر مدحیہ قصیدے کے کہے ہیں۔

۸۔ بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

فرماتے ہیں کہ غزل گوئی کا میدان چھوٹا ہے میرے شوق کی تشفی اس تنگ دائرہ میں نہیں ہوسکتی اس کے لئے بہت وسیع میدان چاہئیے جیسے مثنوی و قصیدہ اس گریز کے بعد مدح شروع فرماتے ہیں۔

۹۔ دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کیلئے

فرماتے ہیں عیش کی تخلیق تو محض تجمل حسین خاں کے لئے ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اوروں کو بھی عیش کی تھوڑی سی زکواۃ دے دی گئی ہے تاکہ ممدوح کو ان کی نظر بد نہ لگے اور دوسرے اس پر حسد نہ کریں۔

۱۰۔ زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ نطق نے مرے بوسے مری زباں کیلئے

بارخدایا: یاالہیٰ، نطق: گویائی۔

فرماتے ہیں کہ اے خدا میری زبان پر یہ کس ذی مرتبت اور عالی قدر کا نام آیا کہ قوت گویائی نے جھٹ سے میری زبان کے بوسے لے لئے۔

۱۱۔ نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک — بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کیلئے

نصیر: مددگار، معاون، معین: مددگار، معاون، چرخ: آسمان، بریں: بلند و برتر — فرماتے ہیں کہ تجمل حسین خاں سلطنت اور دین کا معاون اور ملک و قوم کا مددگار ہے، وہ اس درجہ عالی مرتبت ہے کہ آسمان اس کی آستان کے لئے بنا ہے۔

۱۲ ۔ زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش　　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے

فرماتے ہیں کہ اس کے عہد حکومت میں دنیا کی آرائش و زیبائش ہو رہی ہے۔ اس لئے آسمان کو زیادہ خوشنما بنانے کے لئے اور ستاروں کی ضرورت ہے۔ ممدوح کی خاطر اب بنائے جائیں گے۔

۱۳ ۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　　سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کیلئے

سفینہ: (۱) کشتی (۲) اشعار کی کتاب + بے کراں = ناپید اکنار۔

فرماتے ہیں کہ ممدوح کی مدح ایک بحر ناپید اکنار ہے۔ ان چند اشعار سے حق مدح پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو ایک بڑی کتاب کی ضرورت ہے۔

اس شعر میں صنعت ایہام سے کام لیا ہے۔ بحر کی مناسبت سے سفینہ کا لفظ تو رکھا مگر معنی اس کے بعید کے یعنی دفتر کے لئے۔

۱۴ ۔ ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا　　　صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

فرماتے ہیں کہ غزل سے قصیدہ کا کام لینا ایک خاص طرز ہے جو کہیں نہیں پائی جاتی۔ شاعرانِ نکتہ سنج کے لئے صلائے عام ہے کہ دیکھیں صاحبِ کمال اس طرح لکھتے ہیں۔

قصائد

قصیدہ نمبر (۱)
(درمنقبت)

۱۔ ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

ساز: سامان + فرماتے ہیں کہ فیض چمن سے چمن کا ذرہ ذرہ کار آمد ہوگیا ہے۔ جس جگہ پودے ہیں اس جگہ کی افادیت ظاہر ہے۔ مگر جہاں کچھ بھی نہیں صرف سایہ ہے وہ زمین بہ ظاہر بیکار سی معلوم ہوتی ہے لیکن شاعر کہتا ہے وہ بھی بے مصرف نہیں ہے۔ لالۂ بے داغ کا سایہ سویدائے بہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار میں درختوں کا سایہ بھی حسن بہار کو دوبالا کر دیتا ہے۔

"اگر لالہ کو داغدار کہا جاتا تو اس کا داغ سویدا سمجھا جاتا اس لیے لالہ بے داغ کہا ہے" (از مرآۃ الغالب)

اس شعر میں لفظ چمن بہار کے مفہوم میں آیا ہے۔ چمن بہار کا نتیجہ اور اس کا ایک جزو ہے لہذا شاعر نے جز پر کل کا اطلاق کیا ہے۔ قصیدہ کی تمہید میں موسم بہار کی تاثیر بتلائی گئی ہے لہذا "بمقتضائے مقام" "فیض چمن" کا مطلب فیض ہوا یا بہار ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ — ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

تیغ کوہ یا کہسار: پہاڑ کی چوٹی، قلۂ کوہ + ریزۂ شیشہ: شیشے کے ٹکڑے، شیشہ ٹوٹنے سے اس کی باریک کرچیں جو زمین پر پھیل جاتی ہیں ان کو سبزہ سے تشبیہ دی ہے۔ عرض وجوہر دو نوں فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں۔ جوہر کے اظہار کے لئے عرض اور عرض کی نمود کے لئے جوہر لازم وملزوم ہیں۔ سبزہ اور جوہر تیغ میں مشابہت ہے اس لئے سبزہ کو عرض اور اس کا جوہر، جوہر تیغ کو بنایا گیا۔ باد صبا کی مستی کو مے کی مستی سے تشبیہہ دی ہے۔ پھر پہاڑ کی اونچی چوٹی کو شیشۂ مے سے تمثیل کیا ہے۔ ان لفظی رعایتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد شعر کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ موسم بہار کی کیف پرور ونشاط آور ہوا کا یہ اثر ہے کہ پہاڑ کی چوٹی شیشۂ مے بن گئی ہے اور اس پر جو سبزہ اگا ہے۔ وہ اس شیشہ مے کی کرچیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ موسم بہار میں قلۂ کوہ اور اس کا سبزہ اتنا ہی نشاط انگیز ہے جتنی نشاط شیشۂ مے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

۳۔ سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ — تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

جام زمرد اور داغ پلنگ میں اور سبزے کے ریشوں اور شرار میں تشبیہہ موجود ہے۔

فرماتے ہیں کہ فیض ہوا سے چیتے کے داغ جام زمرد کی طرح سبز و خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح آگ کی چنگاریاں ریشۂ نارنج کے مانند تازہ اور شاداب ہوگئی ہیں۔ گویا موسم بہار نے آگ کی حرارت کو بھی دور کر دیا ہے۔ اور ہر چیز کو سر سبز و شاداب کر دیا ہے۔

۴۔ مستیٔ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

حسرت: افسوس، رنج۔ ابر کے چھانے کو آغوش سے استعارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ موسم بہار میں ابر کی مستی ہر چیز کو سرور و مست کر رہی ہے چنانچہ حسرت جو رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تھی اب نشاط کے پھول چن رہی ہے۔ یعنی رنج خوشی سے بدل گیا ہے۔ اس لئے کہ ابر ہی کے آغوش میں دونوں عالم کا فشار ممکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابر آسمان و زمین پر محیط ہے اس لئے دونوں عالم پر مستی چھا گئی ہے۔

۵۔ کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوق بلبل   راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

شوق: عشق۔ یعنی پہاڑ اور جنگل سب کے سب بلبل کے عشق و محبت کے نغموں سے معمور ہیں اور فصل خزاں میں چمن کی جن روشوں پر آمد و رفت بند تھی اب پھول کھلنے کے باعث روشیں آباد ہوگئی ہیں۔ سب لوگ پھولوں کی سیر یا پھول چننے کے لئے ان روشوں پر آتے جاتے ہیں۔ گویا جو راستہ سویا ہوا تھا خندۂ گل کی آواز سے بیدار ہوگیا۔

۶۔ سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم   سر نوشت دو جہاں ابر بیک سطر غبار

غبار: ایک قسم کا خط جو دو علیحدہ کاغذوں پر لکھا جاتا ہے۔ دونوں کاغذوں کی تحریر ملا کر پڑھیں تو پڑھی جا سکتی ہے ورنہ صرف ایک غبار سا معلوم ہوتا ہے۔ دوجہاں ابر: ابر کی مقدار جو دو جہاں کے برابر ہو۔ یعنی فیض ہوا کا یہ حال ہے کہ دو جہان ابر کی سر نوشت ایک سطر غبار میں درج کر دی ہے۔ یعنی ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی اس قدر پانی برساتا ہے جتنا کہ دو جہان ابر برسا سکے۔ موسم بہار کے اس ٹکڑۂ ابر کو خط غبار سے اور پھر خط غبار کو مژگان یتیم سے تشبیہ دی ہے۔ یتیم کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا طوفان پوشیدہ رہتا ہے اور پھر دونوں پلکیں مل کر خط غبار بن جاتی ہیں۔

۷۔ کاٹ کر پھینکئے ناخن تو باندازِ ہلال   قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

قوت نامیہ: وہ طبعی قوت جس کی وجہ پودوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں موسم بہار میں قوت نامیہ اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ اگر کٹا ہوا ناخن جو بشکل ہلال ہوتا ہے۔ زمین پر پھینک دیا جائے تو نمو کرنے لگے اور [illegible] بڑھتے بڑھتے ماہ کامل بن جائے۔

۸۔ کفِ ہر خاک بگردون شدہ قمری پرواز　　دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

قمری پرواز = قمری کی طرح پرواز کرنے والا۔ کہتے ہیں کہ ہوا کی تاثیر سے بے جان چیزوں میں بھی جان پڑ گئی ہے۔ چنانچہ ہر مشتِ خاک آسمان پر قمری کی طرح پرواز کر رہی ہے۔ اور ہر جلتا ہوا کاغذ دام بنکر مور کا شکار کر رہا ہے۔ یعنی جلتے ہوئے کاغذ پر جو ستارے چمکتے ہیں طاؤس کے پروں کے نقوش کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس طرح کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار بن گیا۔

۹۔ میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی　　بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

یعنی اگر ایک شراب کا پیالہ باغ کی دیوار پر رکھ کر بھول جائیں تو موسم کی تاثیر نمو سے اس کے صدہا پیالے بن جائیں گے۔ اور گلزار میکدہ ہو جائیگا۔ پس میکدہ میں شراب بھی پیو اور پھول بھی توڑو۔

۱۰۔ موجِ گل ڈھونڈھ بخلوتکدۂ غنچۂ باغ　　گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

فرماتے ہیں کہ اگر تو گوشۂ میخانہ میں دستار گم کر دے تو قوتِ نامیہ اس سے درختِ گل اگا دے اور میخانہ باغ بن جائے اس لئے اب دستار تجھ کو گل و غنچہ کی شکل میں نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ دستار کی تہیں غنچہ سے مشابہ ہوتی ہیں۔

۱۱۔ کھینچے گر مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر　　سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

مانی = ایک مشہور مصور کا نام + خطِ نوخیز = جوانی کے آغاز میں داڑھی اور مونچھ کا خط جو لڑکوں کے لب و رخسار پر پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر مانیٔ فکر ان دنوں چمن کی تصویر کھینچے تو تصویر کے جو خطوط وہ پرکار سے کھینچے گا وہ ایسے ہی خوبصورت اور سبز ہوں گے جیسے کہ سبزۂ نوخیز ہوتا ہے۔

۱۲۔ لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ　　طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

تشبیب کے بعد یہ شعر گریز کا ہے اس کے بعد مدح شروع ہوگی۔ طوطی کا رنگ سبز اور چونچ سرخ ہوتی ہے اس نے شاعر پہاڑ کے سبزہ کو طوطی اور اس کی چونچ کو لعل سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں سبزہ کی طوطی نے پہاڑ سے لعل نکال کر اپنی چونچ بنالی ہے۔ ایسے عالی مرتبہ بادشاہ کی تعریف کیلئے ایسی ہی منقار ضروری تھی۔

۱۳۔ وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا　　چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

پئے تعمیرِ سرا = مکان کی تعمیر کیلئے۔ قالبِ خشت = اینٹ کا سانچہ۔ مطلب صاف ہے۔ مزید توضیح جناب جبریل علیہ السلام کی اہانت ہوگی۔ سرا سے مراد اینٹ اور چونے کی عمارت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا مقام ہے۔

۱۴۔ فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور　　رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

طناب = ڈوری۔ فرماتے ہیں فلک العرش یعنی سب سے بلند آسمان مزدور کے دوش کے خم کا ہجوم بنا ہوا ہے

یعنی وہ تعمیر سرا کی مزدوری میں جھکا ہوا ہے۔ فیض ازل کی ڈوری معمار کی طناب ہے جس سے وہ دیواروں کا سیدھا پن دیکھتا ہے۔ اور معمار اس سرا کا خود خدا ہے۔

۱۵۔ سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام　　رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

نہ چمن: یہاں مراد اس سے نو آسمان۔ رفعت: بلندی، اوج: بلندی۔ حصار: دیوار۔ یعنی اوپر کے اشعار میں جو سرا تعمیر ہوئی ہے اس کے لب بام کا ایک خط تائے سبزے نو آسمانوں کی آرائش کے مساوی ہے۔ اور اس سرا کی حصار اتنی ہی بلند ہے جتنی کہ ایک سو عارفوں کی ہمت بلند ہوتی ہے۔

۱۶۔ واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ　　وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

مروحہ: پنکھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر میرے ممدوح کی سرا کی خاشاک کا ایک تنکا بھی کسی کو مل جائے تو وہ اس کو بالِ پری سے زیادہ عزیز رکھیگا۔

۱۷۔ خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا　　چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

نجف، نجف اشرف، ملک عرب کے ایک شہر کا نام جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک کے باعث بہت مشہور ہے اور بڑا مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ جوہر، لب لباب، خلاصہ۔ یعنی عارفوں کی سیر کا لب لباب یا حاصل صحرائے نجف کی خاک ہے اسی خاک کی خاطر وہ نجف اشرف کی زیارت کو جاتے ہیں۔ اثنائے سفرِ نجف میں زمین پر عارفوں کے جو نقشِ قدم پڑتے ہیں وہ آنکھ بن کر آئینہ میں اپنے بختِ بیدار کو دیکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو خوش نصیب ہیں وہی نجف اشرف کی زیارت کو جاتے ہیں۔

۱۸۔ ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز　　گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

فرماتے ہیں صحرائے نجف کا ایک ایک ذرہ آفتاب کے لئے آئینۂ ناز ہے جس میں آفتاب اترا اترا کر اپنا جمال دیکھتا ہے۔ اور اس دشت کی گرد امید کے لئے جامۂ احرام کا کام دیتی ہے۔ یعنی جس طرح خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے احرام باندھ کر جاتے ہیں نجف اشرف کی زیارت کے لئے امید اس دشت کی گرد کا لباس پہن کر جاتی ہے۔

۱۹۔ آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز　　عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

آفرینش: پیدائش، تخلیق۔ عرض، اظہار۔ ناز: نو رستگی، نمو، پیدا ہونا۔ یعنی آفرینش کو اس درگاہ سے اپنی پیدائش یا نمو کی خواہش ہے۔ گویا کائنات میں جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اس درگاہ عالی کا فیضان ہے چنانچہ دشتِ نجف کی ہر موجِ غبار خمیازۂ ایجاد کو ظاہر کرتی ہے مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جتنی نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ اسی غبار کی موج سے بنتی ہیں۔

مطلعِ ثانی

۲۰۔ فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغان، پرِ بلبل گلزار

شمعِ شبستانِ بہار: حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ۔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح تیرے فیض سے دلِ پروانہ منور مثلِ چراغاں ہوگیا ہے اور بلبل کا پر گلزار کی طرح خوبصورت ہوگیا ہے۔

۲۱۔ شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

آئنہ خانہ: مراد دل۔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح میرا دل تیرے شوقِ دیدار میں مثلِ طاؤس پرواز کرنے آمادہ ہے۔

۲۲۔ تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہربار

فرماتے ہیں کہ اے ممدوح تیری اولاد کا ماتم آسمان پر بھی ہوتا ہے چنانچہ ہلال جس کی شکل مژہ کی ہے گوہر یعنی آنسو برساتا ہے اور ان ہی آنسوؤں سے سلکِ اختر بنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تارے مہِ نو کے آنسو ہیں گوہر کی طرح ایک رشتہ میں پروگئے ہیں۔

۲۳۔ ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو تیرے حوصلے سے استظہار

ہم: بھی۔ ریاضت: زہد، نفس کشی، خدا کی خوشنودی کے لئے تکلیف اٹھانا۔ حوصلہ: ظرف، ہمت۔ استظہار: پشت پناہی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ریاضت مشہور ہے کہ آپ تمام رات ذکرِ الٰہی میں گذار دیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ تیرا نقشِ قدم عبادت کا سامان مہیا کرتا ہے یعنی مہرِ نماز کا کام دیتا ہے۔ تیری عالی ہمتی سے ریاضت کی پشت پناہی ہوتی ہے۔ گویا تیری وجہ ریاضت کو استحکام حاصل ہوسکا۔

۲۴۔ مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

اسرار: عرفان کے پوشیدہ راز۔ فرماتے ہیں کہ تیری مدح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پوشیدہ ہے یعنی تیری تعریف کرنی رسول اللہ کی توصیف کرنی ہے۔ اور اے ممدوح تیرے جامِ عرفان سے اسرارِ معرفتِ الٰہی کی شراب جھلک رہی ہے۔

۲۵۔ جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

مدح کے بعد اب دعا پر قصیدہ ختم کیا جارہا ہے۔ چاروں شعر دعائیہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا میرے دستِ دعا کو جو خلوص اور صدقِ دلی کی وجہ آئنہ کے مماثل ہے جوہرِ تاثیر عطا فرما۔ اور یہ جوہرِ آئنہ میرے ممدوح کے دوستوں کی مژگان کے لئے مایۂ ناز ہوں اور دشمنوں کے لئے

کانٹوں کی طرح موجب آزار۔ اس شعر میں دست دعا کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور جوہر آئینہ کا مژگان و خار سے استعارہ کیا ہے۔ نازش مژگان سے مراد غم اولاد علی میں گوہر فشاں ہونا ہے۔ دست دعا آئینہ = آئینۂ دستِ دعا۔

۲۶۔ مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ — خاک در کی تیرے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

عزا خانہ = ماتم کدہ۔ آئینہ دار = غلام فرمانبردار۔ فرماتے ہیں اے ممدوح جو آنکھ تیرے خاک در کی آئینہ دار نہ ہو وہ اقبال و نیکبختی کا ماتم کدہ بن جائے گی اور مردمک چشم سیاہ لباس پہنی ہوئی اس محرومی کا سوگ منائے گی یعنی اقبال و سعادت سے محروم رہے گی۔

۲۷۔ دشمن آل نبی کو بہ طرب خانۂ دہر — عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیدار

طاق دیدار = آنکھ۔ دعا فرماتے ہیں کہ آل نبی کے دشمن دنیا میں ہمیشہ غمگین و گریہ کناں رہیں ان کو مسرت و شادمانی نصیب نہ ہو۔ ان کی آنکھیں سیلاب گریہ کا طوفان گاہ بنی رہیں یعنی ہمیشہ روتے رہیں۔

۲۸۔ دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتو شوق — فیض معنی سے خطِ ساغر راقم سرشار

شوق = محبت۔ پرتو = روشنی، نور۔ فیض = فیض باطن۔ خطِ ساغر = پیالے میں شراب کی لکیر جو مقدار شراب کو ظاہر کرتی ہے۔ راقم مراد شاعر۔ سرشار = لبریز۔ یہ شعر بھی دعائیہ ہے اور دعا پر قصیدہ ختم ہو رہا ہے۔ دعا فرماتے ہیں کہ اسدؔ کے دیدہ سے دل تک یعنی پورا وجود ایک آئینہ ہو جائے جس میں حب علیؓ پر تو فگن رہے۔ اور خدا کرے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیضِ باطن سے شاعر کا دل معمور ہو جائے۔

قصیدہ نمبر (۲) (در منقبت)

۱۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دہر = دنیا۔ شعر تصوف کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یکتائی کے ظہور ہی کا نام دنیا ہے دنیا کوئی علاحدہ چیز نہیں ہے۔ جب پروردگار کو خواہش ہوئی کہ وہ پہچانا جائے، تو پھر ساری کائنات وجود میں آئی۔ اگر حسن کو یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ چاہت نہ ہوتی تو زمین و آسمان ہوتے اور نہ ہم ہوتے۔

۲۔ بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

تماشا، دیکھنا۔ فرماتے ہیں کہ دل بجھ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کو ہم بے دلی سے دیکھتے ہیں۔ نہ اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور نہ کچھ لطف اٹھاتے ہیں۔ یہی حال ہماری آرزو کا ہے۔ نہ دنیا کی تمنا ہے نہ دین کی خواہش۔ گویا ہماری آرزو بیکسی کے عالم میں ہے۔

۳۔ ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم لغو ہے آئنۂ فرقِ جنون و تمکین

ہرزہ = بیہودہ۔ زیر و بم = راگ یا باجہ کی دھیمی اور اونچی آوازیں۔ آئنۂ فرق = فرق بتلانے والی چیز تمکین = عزت و توقیر یہاں اس سے مراد جنوں کی ضد سنجیدگی۔ جنون سے مراد عقل کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں اہلِ ظاہر کا فلسفۂ وجود و عدم ہرزہ ہے۔ اہلِ ظاہر کے پاس ممکن اور واجب دو وجود ہیں اور ہم صرف ایک ہی وجود کے قائل ہیں۔ اسی طرح جو ضوابط دانائی و ابلہی میں امتیاز کے بنائے گئے ہیں وہ لغو ہیں۔ یعنی یہ تصور کہ دانائی سے عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے اور بے وقوفی سے ذلت نصیب ہوتی ہے۔ تجربہ کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں معاملہ برعکس ہے نااہل اور بے ہنر تو بڑی شان و شوکت کی زندگی گزارتے ہیں۔ اور اہلِ کمال و صاحبانِ ہنر کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

یا

یہ کہ جس طرح وجود و عدم کی بحث ہرزہ سرائی ہے اسی طرح جنون تمکین میں فرق بتلانا بھی لغو ہے۔

۴۔ نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

نقش معنی = باطن کا نقش۔ عرض = ظاہر کرنا۔ صورت = ظاہر داری۔ خمیازہ = جسم کا جھکاؤ۔ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ظاہر داری کا نام ہی نقشِ معنیٰ ہو گیا ہے یعنی لوگ کسی کی ظاہری وجاہت اور لباس فقری اور بناوٹی تواضع و خاکساری سے اس کو صاحب باطن اور اہل دل کہتے ہیں اور جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حق گو و راست گفتار ہیں ان کی راست گفتاری بھی خواہش تحسین کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۵۔ لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دین

لافِ دانش = دعویٰ دانائی۔ درد = تلچھٹ۔ فرماتے ہیں دنیا میں جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانائی سے کاموں کو سنوارا ہے ان کی یہ لاف غلط ہے اور اسی طرح کسی نفع کی توقع پر عبادت کرنی باطل ہے۔ دین اور دنیا کے جملہ کام انسان کی تھوڑی سی غفلت کا نتیجہ ہیں یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے وہ خود کرتا ہے اگر اس پر حقیقت کھل جائے

اور غفلت جاتی رہے تو وہ یہ معلوم کرے گا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور ہی ہاتھ کا کام ہے۔

۶۔ مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم　　صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکین

تسلیم: رضا، باد بدستِ تسلیم: تسلیم سے کوئی فائدہ نہیں، تمکین: عزّ و وقار۔ فرماتے ہیں جس طرح وفا کا مضمون مہمل و بے معنی ہے یعنی وفا سے کسی کو دنیا میں فائدہ نہیں پہنچا۔ اسی طرح تسلیم و رضا سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب رہی تمکین وہ بھی خاک بسر ہے۔ غرض یہ کہ دنیا میں جو باتیں یا صفات اچھی سمجھی جاتی ہیں ان کا حاصل کچھ نہیں۔ تمکین کو نقشِ پا سے تشبیہ دینے کی وجہ ہر دو کا سکون ہے۔

۷۔ عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس　　وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقین

فرماتے ہیں کہ عشق حواس کی پراگندگی اور جنون کا نام ہے اور وصل حسنِ یقین کے آئینہ کا زنگار ہے یعنی حسنِ یقین کو دھبہ لگانے والا ہے۔ وجود کی وحدت کا یقین کامل حسنِ یقین ہے جب وجود کو ایک مانتا ہے تو پھر وصل کیسا۔ وصل کا تصور دوئی کا طالب ہے جو حسنِ یقین کے منافی ہے۔

۸۔ کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب　　بے ستون آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

طرب گاہ: عشرت کدہ + رقیب: یہاں اس سے مراد خسرو + بے ستون: پہاڑ کا نام جس کو کاٹ کر کوہ کن نے قصرِ شیریں تک نہر بنائی تھی۔ خوابِ گراں: غفلت و بے پروائی۔ فرماتے ہیں کوہ کن اپنے رقیب خسرو کے محلسرا کا ایک بھوکا مزدور تھا عشق سے اس کو کیا تعلق اگر فی الحقیقت وہ سچا عاشق ہوتا تو شیریں بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ اس کے برعکس کوہ بے ستون کو کاٹ کر نہر لانے کی شرط ظاہر کرتی ہے۔ وہ کوہ کن سے غافل و لاپرواتھی۔ گویا کوہ بے ستون شیریں کے خوابِ گراں کا آئینہ ہے۔

۹۔ کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز　　کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

حزیں: غمگین، دکھی۔ فرماتے ہیں کہ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں کہ عاشق کا نفس شرربار ہوتا ہے اور دکھی دل سے جو نالہ نکلتا ہے وہ با اثر ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بتاؤ کس نے عاشقوں کے نفس سے آگ برستی دیکھی ہے اور کس نے دلہائے حزیں کے نالہ کا اثر معلوم کیا؟ جواب دونوں سوالوں کا یہ ہے کہ کسی نے نہیں۔

۱۰۔ سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن　　نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

سامع : سُننے والا ۔ زمزمہ : نغمہ ۔ سرو برگ : سروسامان ۔ دماغ : خیالؔ خواہش ۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ جہاں کے زمزمہ خاموشی سے سنتا ہوں ۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا جو تعریف کے قابل ہو اور اظہار نفرت میری طبیعت کے خلاف ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ جہاں جو انمل بے جوڑ سی باتیں بکتے ہیں خاموشی سے سن لیتا ہوں وہ تو تعریف کے قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جاسکے ۔ البتہ قابلِ مذمت ضرور ہیں ۔ لیکن میری طبیعت کسی کی مذمت کرنے سے ابا کرتی ہے ۔

۱۱ ۔ کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ یکقلم خارج آدابِ وقار و تمکین

تمہید کے بعد یہ گریز کا شعر ہے ۔ ہرزہ سرا : بے ہودہ گو ۔ عیاذاً باللہ : پناہ بہ خدا ۔ یکقلم : بالکل فرماتے ہیں کہ منقبت کو چھوڑ کر اب تک جو میں نے کہا وہ ہرزہ سرائی تھی جو آداب بزرگی اور وقار و تمکین کے خلاف ہے ۔ لہٰذا اس ہرزہ سرائی کو چھوڑ کر منقبت شروع کرتا ہوں ۔

۱۲ ۔ نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

نقش : تعویذ ۔ ہذیان تحریر : جس کی تحریر بے ہودہ یا بڑ ہو ۔ فطرت وسواس قریں : وسواسی طبیعت ۔ یعنی اے قلم اب نقشِ لاحول لکھ تاکہ تیرا ہذیاں دور ہو جائے اور اے طبع تو علیؓ کا نام لے تاکہ تیرا وسواس جاتا رہے اور منقبت کی طرف مائل ہو جائے

۱۳ ۔ مظہرِ فیضِ خدا ، جانِ دلِ ختمِ رسل قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

مظہر : جائے ظہور ۔ ختم رسل : حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ یقین : یہاں معرفت الٰہی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی ذات فیوض باری تعالٰی کا مظہر ہے آنجناب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی رشتہ و بہ اعتبار اخلاص و محبت جان و دل ہیں ۔ آلِ نبی یعنی بنی فاطمہ کا قبلہ ہیں ۔ چونکہ معرفت الٰہی کا سرچشمہ آپ کی ذات ہے اس لئے ایجادِ یقین کا کعبہ ہے ۔ جتنے سلاسل ہیں آپ ہی کی ذات پر منتج ہوتے ہیں ۔

۱۴ ۔ ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

سرمایۂ ایجاد : جس سے عالم امکان بنا ہے ۔ گردہ : ہر گول چیز ۔ فرماتے ہیں کہ آپ کی ذات ایجاد کا سرمایہ ہے ۔ جملہ کائنات آپ ہی کے باعث ایجاد ہوئی ہے ۔ اس لئے جہاں بھی آپ تشریف لے جائیں ایجاد کا ظہور رہیگا ۔ آپ کے ہر نقشِ قدم کی مٹی کرۂ ارض کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔

۱۵ ۔ جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

یعنی جہاں جہاں ممدوح کا نقش قدم زمیں پر نمایاں ہے اس کی خاک ہر دو عالم کیلئے باعث عز و افتخار ہے ۔

۱۶۔ نسبت نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے ابداً پشتِ فلک خم شدہ نازِ زمین

فرماتے ہیں کہ زمین کو حضرت علی کے نام سے ایک نسبت ہو گئی ہے۔ حضرت کی کنیت بوتراب ہے۔ اس نسبت کے سبب زمین کا رتبہ بہت بلند ہو گیا ہے اور وہ نازاں ہے۔ زمین کی اس شان و شرف کو دیکھ کر آسمان نے تعظیماً اپنی پشت خم کر دی ہے۔ آسمان کا یہ جھکاؤ ابد تک رہیگا۔

۱۷۔ فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین

خُلق: پاکیزہ اخلاق۔ فرماتے ہیں کہ بوئے گل سے معطر ہو کر بادِ صبا جو خوشبو دنیا میں پھیلاتی ہے اے اسد اس خوشبو میں میرے ممدوح کے خلق ستودہ کا فیض شامل ہے۔ ورنہ گل میں یہ خوشبو نہ ہوتی۔

۱۸۔ برشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

یعنی ممدوح کی تلوار کی دھاک ساری دنیا پر مسلط ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے خوف سے تخلیق کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور دنیا ویران ہو جائے۔

۱۹۔ کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چین

فرماتے ہیں کہ ممدوح کا جلوہ کفر کو ایسا فنا کر دیتا ہے جس طرح عاشق کے رنگ کو غمِ عشق اڑا دیتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ آپ کے وجود سے بتخانۂ چین بے رونق اور برباد ہو جائے۔

۲۰۔ جاں پناہا، دل و جاں فیض رسانا، شاہا وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقین

جاں پناہا: اے جان کو پناہ دینے والے۔ دل و جاں فیض رسانا: اے دل و جان کو فیض بخشنے والے۔ بہ فتوائے یقین: یقین کے فتویٰ سے۔ یعنی اے ممدوح تو ہمارے جانوں کی پناہ اور دل و جان کو فیض پہنچانے والا ہے اور اس بات کا کامل یقین ہے کہ وصیِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیری ہی ذات ہے۔ گویا قاضیِ یقین نے یہ فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ تو ہی وصیِ رسول ہے۔

۲۱۔ جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگین

اطہر: تفضیل کا صیغہ ہے یعنی سب سے زیادہ پاک۔ ناصیہ: پیشانی۔ اے ممدوح تیرے جسم کی طہارت کی انتہا یہ ہے کہ بروزِ فتحِ مکہ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک کندھوں پر چڑھ کر تو نے خانۂ کعبہ کے بتوں کو توڑا ہے اور اے بادشاہ تیرا نام عرش کی پیشانی پر کندہ ہے۔ گویا ناصیۂ عرش تیرا نگیں ہے۔

۲۲۔ کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین

آئین باندھنا: آرائش کرنا، سنوارنا۔ فرماتے ہیں بجز ذاتِ واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ کے

کوئی دوسرا۔ اے ممدوح۔ تیری مدح کا حق ادا نہیں کر سکتا جس طرح شمع کی تعریف یا اس کی روشنی کا اظہار صرف زبان شمع ہی کر سکتی ہے۔ دوسرے کسی اور طریقے سے شمع کی چمک نمایاں نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کو ذات باری تعالیٰ میں کامل فنائیت حاصل تھی اور آپ کا سینہ نور معرفت سے روشن ہوچکا تھا اور یہی آپ کا سب سے بڑا وصف ہے۔ شمع اور زبان شمع دو علاحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

۲۳۔ آستان پر ہے تیرے جوہرِ آئینہ سنگ　رقم بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امیں

یعنی حضرت جبریل علیہ السلام نے تیرے سنگ آستان پر جبین نیاز گِھسی ہے جس کی وجہ سے پتھر پر لکیریں پڑ گئی ہیں۔ یہ نقوش بندگی جوہر آئینہ کی طرح تابناک اور روشن ہیں۔ گویا تیرا سنگ آستان آئینہ ہے۔ اور حضرت جبریل کی بندگی کے نقوش اس آئینہ کا جوہر ہیں۔

۲۴۔ تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ　خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دین

فرماتے ہیں کہ اے ممدوح آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے جان اور دل اور ایمان عطا فرمایا ہے وہ تیرے در پر نثار کرنے کا سامان تیار کیا گیا ہے۔

۲۵۔ تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں　تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

مدحت، تعریف، کام، حلق، تسلیم، بندگی، اطاعت۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دل و جان اور کام و زبان تیری تعریف کے لئے ہی بنائے ہیں۔ اسی طرح لوح و قلم اور دست و جبین تیری بندگی اور اظہار فرمانبرداری کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں۔

۲۶۔ کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا۔　کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں

یعنی جس کی تعریف خود خدا نے کی ہو پھر کون ہے جو اس کی مدحت کا حق ادا کر سکے جس طرح کسی انسان سے باغ جنت کی آرائش ممکن نہیں اسی طرح آپ کی مدح بھی ممکن نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فردوس بریں خود مزین و آراستہ ہے اس کی آراستگی میں کسی کی کوشش سے اضافہ نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی انسان مدحت کے ذریعہ جناب مرتضیٰ کے اوصاف حمیدہ نمایاں نہیں کر سکتا۔

۲۷۔ جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد　کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

فرماتے ہیں کہ میں گناہوں کے بازار کی جنس ہوں جس میں کوئی خوبی نہیں پھر کون ایسا رحیم و کریم و دریا دل ہے جو مجھ کو خریدے البتہ اے ممدوح تیری نظر کرم گناہگاروں پر بھی اسی طرح مبذول ہے جس طرح نیک بندوں پر اس لئے صرف تو مجھ گنہگار کا خریدار ہے۔

۲۸۔ شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقین

طلب: عادت حوصلہ: ہمت، ظرف، بردباری۔ فضل: عطا، بخشش، بزرگی۔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح چونکہ تیرے حوصلۂ فضل پر مجھ کو بہت زیادہ یقین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی تجھ سے طلب کیا جائے تیری عالی ظرفی و عالی ہمتی اس کو رد نہیں کرے گی اسی لئے میری طلب بے باکانہ شوخی کے ساتھ عرض مطالب کرتی ہے۔ اور وہ عرضِ مطلب یہ ہے (یعنی نیچے کے اشعار میں طلب کی صراحت ہے۔)

۲۹۔ دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

اجابت: قبولیت۔ یعنی اے ممدوح میری دعا میں ایسا اثر پیدا کر دے کہ قبولیت میرے ہر لفظ پر سو بار آمین کہے۔

۳۰۔ غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز — کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگین

یعنی غمِ شبیر کی میرے سینے میں اس درجہ فراوانی ہو کہ میں ہمیشہ روتا رہوں۔

۳۱۔ طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق — کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبین

سرگرمیٔ شوق: شوق کی زیادتی۔ دُلدُل: وہ سفید سیاہی مائل خچری جو حاکم اسکندریہ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر میں پیش کی تھی اور آپ نے حضرت علی کو عطا فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت میں دُلدُل کی محبت کا شوق اس حد تک عطا فرما کہ جہاں تک دُلدُل چلے اس کے نقش قدم پر سجدہ ریز ہوتا ہوا میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

۳۲۔ دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزین

الفتِ نسب: جس کی اصل محبت ہو۔ نفس: جان، روح۔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح مجھ کو ایسا دل عطا فرما جس کی اصل محبت ہو اور ایسا سینہ عطا ہو جس میں بجز ذات احد کے اور کوئی چیز سمانہ سکے میری نظر جلوہ پرست ہو جائے یعنی سوائے جمالِ یار اور کوئی چیز نظر میں نہ ہو۔ اور پھر میری روح اور جان کو صداقت پسند بنا دے۔

۳۳۔ صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ و دودِ دوزخ — وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

آخری استدعا یہ ہے کہ تیرے دشمنوں کو دوزخ کی آگ اور دھواں نصیب ہو اور تیرے دوستوں کے لئے باغ جنت وقف رہے۔

قصیدہ نمبر ۳

۱. ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

مہ نو: مراد عید کا چاند

۲. دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح یہی انداز اور یہی اندام

ہلال کی شکل میں چاند ۲۶ و ۲۷ رمضان کو نظر آتا ہے۔

۳. بارے دو دن کہاں رہا غائب بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

بندہ عاجز ہے: غلام مجبورِ محض ہے آقا کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ گردشِ زمانہ سے بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا غیر حاضری کے یہی اسباب ہیں۔ یا یہ کہ مصرعہ ثانی ہلال کی زبانی ہے۔ اپنی غیر حاضری کا عذر پیش کر رہا ہے۔

۴. اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

صاف ہے۔

۵. مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

مرحبا: کلمہ تحسین ہے۔ سرورِ خاص: خاص مسرت، خواص، خاصانِ خدا جو پورے روزے رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ پورے روزے رکھتے اور عبادت میں ماہِ صیام گزار دیتے ہیں وہ خاصانِ خدا ہیں اور عید کا چاند خاص طور پر ان کے لئے موجبِ سرور ہوتا ہے لیکن عوام کے لئے بھی عید کی خوشی عام ہے۔

۶. عذر میں تین دن نہ آنے کے لیکے آیا ہے عید کا پیغام

۷. اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

یعنی چاند جو کچھ عرصہ غائب رہ کر واپس آگیا۔ اور اپنے ساتھ عید کا پیغام لایا۔ اس کو بھولا نہیں کہہ سکتے۔

۸. ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا تیرا آغاز اور تیرا انجام

یعنی ایک میں ہی نہیں بلکہ سب پر یہ بات کھل گئی کہ تیرا آغاز عید کی خوشخبری لانا ہے اور تیرا انجام بادشاہ سے فیضیاب ہو کر ماہِ بدر بن جانا ہے۔

۹. رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

نمام: چغل خور، غماز

۱۰۔ جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہے امید گاہِ انام

انام : عوام

۱۱۔ میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

مگر : شاید، کیا۔ یعنی اگر تو اس بارگاہ کا غلام ہے تو کیا غالب غلام نہیں ہے۔

۱۲۔ جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بطرزِ استفہام

میں یہ جانتا ہوں کہ تجھ کو میری غلامی کا علم ہے۔ اسی وجہ سے یعنی استفہاماً تجھ سے پوچھا ہے۔

۱۳۔ مہر تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

۱۴۔ تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

یعنی سورج کو بادشاہ کی ملازمت کی روزانہ عزت حاصل ہوتی ہے لیکن اے چاند تجھ کو یہ اعزاز کہاں نصیب کہ روزانہ سلام کا موقع ملے۔ صرف بتقریب عید ملاقات اور آداب گزاری سے مشرف ہوتا ہے۔

۱۵۔ جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

۱۶۔ ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

۱۷۔ میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام

۱۸۔ ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

یعنی میں خاص آدمی ہوں اس لئے لطفِ خاص کا طالب ہوں۔

۱۹۔ جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

فر : بھڑک، شان و شوکت۔ فروغ : روشنی، جوت۔ یعنی ممدوح تجھ کو اگر ہلال سے بدر بنا کر روشن اور شاندار بنا دے گا تو کیا مجھ کو شراب سرخ سے سرفراز نہیں کرے گا؟

۲۰۔ جب کہ چودہ منازلِ فلکی کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام

۲۱۔ تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

۲۲۔ دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام

منازلِ فلکی : منازلِ ارضی کی مانند آسمان کی منزلیں۔ تیزیٔ گام : قدم کی تیزی۔ پرتو : نور، عکس۔ فروغ پذیر : منور، روشن۔ کوے : کوچہ۔ مشکوئے : محل سرا۔ منظر : دریچہ۔ بام : چاندنی۔ فرماتے ہیں کہ جب تو بادشاہ کے فیض سے چودہ منزلیں طے کر کے بدر ہو جائے گا تو تیرے پرتو سے کوئے و مشکو و منظر و بام منور ہو جائیں گے

اس وقت تو دیکھے گا کہ میرے ممدوح کے لطف خاص سے مجھ کو بھی تیری طرح روشن ، ایک چھلکتا ہوا جام شراب مل جائے گا۔ (ظاہر ہے کہ شراب نوشی کا لطف چاندنی رات میں ہی آتا ہے)

۲۳۔ پھر غزل کی روش پہ چل نکلا توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

یعنے قصیدہ کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کے مقابلہ میں غزل کا دائرہ مختصر ومحدود بلوریں جام چڑھانے کے بعد توسنِ طبع قصیدہ گوئی کے میدان میں بے قابو ہو کر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اسکو قابو میں لانے کے لئے لگام چڑھانی ضروری تھی۔ اس لئے قصیدہ کا وسیع میدان چھوڑ کر غزل کے تنگ دائرہ میں چلانا شروع کیا۔

۲۴۔ زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

معشوق سے خطاب ہے فرماتے ہیں کہ زہرِ غم ہی مجھ کو مار چکا تھا تو پھر کس لئے گھائل کر کے بدنام ہوا۔ یعنے لوگ یہی کہیں گے کہ تو نے قتل کیا حالانکہ غم ہلاک کر چکا تھا۔

۲۵۔ مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

فرماتے ہیں کہ غم سے زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ غم دور کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ شراب پیے جاؤں۔

۲۶۔ بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

فرماتے ہیں کہ بوسہ ملنے کی توقع تو قطعاً فضول ہے۔ البتہ سوالِ بوسہ پر جو گالیاں دی جاتی ہیں یہی غنیمت ہے۔ اسی میں ہم کو لطف آتا ہے اور صرف اسی لئے ہم بوسہ مانگتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ ہماری غرض اور گالیاں کھانے میں ہمکو جو لذت ملتی ہے اس کو وہ نہ پالیں۔ ورنہ گالیاں بھی نہیں دیں گے۔

۲۷۔ کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

ناقوس دیر میں بجایا جاتا ہے اور احرام کعبہ میں جا کر باندھتے ہیں۔ یہ ایک عوام کا مقررہ طریقہ ہے۔ مگر ہم عوام کی روش پر چلنا اپنے لئے معیوب جانتے ہیں اس لئے موجودہ حالات میں جبکہ ہم دیر میں مقیم ہیں احرام باندھ لیتے ہیں اور جب موقع ملے گا کعبہ ضرور جائیں گے۔ اور وہاں ناقوس ضرور بجائیں گے۔ یعنی ہم فرائض تو ادا کر رہے ہیں مگر اپنی خاص روش سے عوام کا اتباع منظور نہیں

۲۸۔ اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

قدح = پیالہ یہاں اس سے مراد پیالۂ غم۔ گردش = پریشانی' آفت۔ وام = قرض۔

فرماتے ہیں کہ ساغرِ غم کا دور میرے لئے نقد ہے ۔ پھر پھر کر دہی غم کا پیالہ مجھ کو مل رہا ہے اس ساغر کی گردش کا کچھ حصہ آسمان نے ادھار لیا ہے ۔ اس کا یہ حال ہے کہ دم بھر اس کو سکون نصیب نہیں ۔ ہمیشہ ہمیشہ گردش میں ہے ۔ جہاں یہ دور دم بدم نقد مل رہا ہے تو پریشانی اور غم کا اسی سے اندازہ کر لیجئے ۔ خلاصہ یہ کہ میری قسمتوں کی گردش کے مقابلے میں فلک کی گردش بے حقیقت ہے ۔

۲۹ ۔ بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار ‌ ‌ دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

ابرام : اصرار، ضد، ہٹ ۔ باقی مطلب صاف ہے ۔

۳۰ ۔ چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے ‌ ‌ کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

یعنی میں نے اپنا نام غالبؔ محض چھیڑخانی کے لئے رکھا ہے تاکہ ان کو غصہ آئے اور خوب گالیاں دیں ۔ مغلوب ہو کر غالب کہنا چھیڑ نہیں تو پھر کیا ہے ۔

۳۱ ۔ کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ ‌ ‌ اے پری چہرہ پیک تیز خرام

اب پھر ہلال عید سے خطاب ہے ۔ پری چہرہ، پیک تیز خرام دونوں چاند کی صفتیں ہیں ۔

۳۲ ۔ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ‌ ‌ ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

ناصیہ سا : پیشانی گھسنے والا ۔ مہ و مہر، زہرہ، بہرام سب سیاروں کے نام ہیں ۔

۳۳ ۔ تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن ‌ ‌ نام شاہنشہ بلند مقام

۳۴ ۔ قبلۂ چشم و دل بہادر شہ ‌ ‌ مظہر ذوالجلال والاکرام

ذوالجلال و ذوالاکرام : جلال والا صاحب کرم دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ۔

۳۵ ۔ شہسوار طریقۂ انصاف ‌ ‌ نوبہار حدیقۂ اسلام

حدیقہ : باغ، خانہ باغ جس کے چاروں طرف دیواریں ہوں ۔ یعنی ممدوح راہ انصاف کا شہسوار ہے اور اسلام کے باغ کی بہار اسی کی ذات سے ہے ۔

۳۶ ۔ جس کا ہر فعل صورت اعجاز ‌ ‌ جس کا ہر قول معنیٔ الہام

یعنی ممدوح کا ہر کام ایک معجزہ ہے اور اس کا ہر قول کلام الٰہی کا ترجمہ ہے ۔

۳۷ ۔ بزم میں میزبان قیصر و جم ‌ ‌ رزم میں اوستاد رستم و سام

بزم : محفل طرب ۔ قیصر : قیصر روم ۔ جم جمشید ایران کا مشہور بادشاہ ۔ رزم : میدان کارزار رستم : مشہور پہلوان ۔ سام : رستم کے دادا کا نام جو بڑا نامی پہلوان تھا ۔ شعر کا مطلب صاف ہے ۔

۳۸. اے ترا لطف زندگی افزا   اے ترا عہد فرخی فرجام

اس سے پہلے تک چاند سے مخاطبت تھی اب یہاں سے بادشاہ کو مخاطب کرکے مدح سرائی ہو رہی ہے۔ زندگی افزا: روح افزا، فرخی فرجام: جس کا انجام نیک اور مبارک ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ تیری مہربانی جان نواز ہے اور تیرے عہد حکومت میں ہر کام کا انجام مبارک ہوتا ہے

۳۹. چشم بد دور خسروانہ شکوہ   لوحش اللہ عارفانہ کلام

چشم بد دور: خدا نظر بد سے بچائے، لوحش اللہ: کلمۂ تحسین ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔ مطلب یہ ہے کہ اے ممدوح تیری خسروانہ شان و شکوہ کو خدا نظر بد سے بچائے۔ قابل دید ہے سبحان اللہ تیرے عارفانہ کلام کے کیا کہنے۔ سننے کے قابل ہے۔

۴۰. جان نثاروں میں تیرے قیصر روم   جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

یعنی قیصر روم بھی تیرا ایک ملازم و جان نثار ہے اور جرعہ خواروں میں ایک جرعہ خوار جمشید بھی ہے۔

۴۱. وارث ملک جانتے ہیں تجھے   ایرج و تور و خسرو و بہرام

ایرج و تور یہ دونوں فریدوں کے بیٹے تھے۔ خسرو و بہرام بھی ایران کے مشہور بادشاہوں کے نام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جملہ مشہور بادشاہ تجھکو وارث سلطنت جانتے ہیں۔

۴۲. زور بازو میں مانتے ہیں تجھے   گیو و گودرز و بیزن و رہام

گودرز: ایران کے ایک مشہور پہلوان کا نام ہے۔ اور ایک بادشاہ کا نام بھی ہے۔ یہاں اس سے ایران کا پہلوان مراد ہے۔ گیو: گودرز کا بیٹا جو بڑا نامی پہلوان گزرا ہے۔ بیزن: گیو کا بیٹا اور گودرز کا پوتا۔ رستم کا بھانجا تھا۔ افراسیاب کی بیٹی پر عاشق ہو کر کنوئیں میں قید رہا اور بہت سختیاں جھیلیں

رہام گیو کا بھائی اور گودرز کا بیٹا جس نے تورانی مشہور پہلوان بارمان نامی کو جنگ میں قتل کیا تھا۔

شعر کا مطلب صاف ہے۔

۴۳. مرحبا موشگافیٔ ناوک   آفریں آبداری صمصام

۴۴. تیر کو تیرے تیر غیر ہدف   تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

ناوک: تیر، خصم: دشمن، صمصام: تلوار۔ فرماتے ہیں کہ اے ممدوح تو ایسا تیر انداز ہے کہ تیرے سے بال کو چیر سکتا ہے اور دشمن کی تیر کو نشانہ بنا کر بال کی طرح اڑا دیتا ہے۔ مرحبا تیرے تیر کی موشگافی اسی طرح تیری تلوار کی آبداری بھی قابل تعریف ہے۔ دشمن کی تلوار پر جب پڑتی ہے تو اس کو چیر کر گھس جاتی ہے گویا دشمن کی تلوار تیری تلوار کا غلاف بن جاتی ہے۔

قطعہ

۴۵۔ رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند۔ برق کو دے رہا ہے کیا الزام

۴۶۔ تیرے فیل گراں جسد کی صدا! تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

گراں جسد: بھاری بھرکم، دیو پیکر۔ رخش: گھوڑا۔ سبک عنان: تیز رفتار۔ خرام: چال۔

اس قطعہ میں بھی لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی ہاتھی کی چنگھاڑ رعد کا دم بند کر دیتی ہے۔ اور گھوڑے کی تیز رفتاری برق کو الزام دے رہی ہے کہ کیسی سست رفتار ہے۔

۴۷۔ فن صورت گری میں تیرا گرز گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام؛

۴۸۔ اس کے مضروب کے سر و تن سے کیوں نمایاں ہے صورت ادغام؟

دستگاہِ تمام: کامل قدرت۔ ادغام: کسی چیز کا بغیر چبائے نگل جانا۔ یا ایک حرف کا دوسرے حرف میں داخل ہونا۔ مجازاً ایک چیز کا دوسری چیز میں ضم ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ ممدوح جب دشمن پر گرز سے حملہ کرتا ہے تو دشمن کا سر گرز کے ضرب سے جسم میں گھس کر مدغم ہو جاتا ہے۔ یعنی سر و تن ایک ہو جاتا ہے۔ گویا ممدوح کا گرز صورت گری میں کامل قدرت رکھتا ہے۔ دشمنوں کے سر و تن کو ایک کر کے نئی صورت دیتا ہے۔

۴۹۔ جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام

۵۰۔ اور ان اوراق میں بکلکِ قضا مجملاً مندرج ہوئے احکام

رقم پذیر ہوئے: لکھے گئے۔ لیالی: جمع لیل، رات۔ ایام: جمع یوم، دن۔ فرماتے ہیں جب ازل میں رات دن کے صفحے بنائے گئے۔ اور ان اوراق میں قضا کے قلم نے یہ احکام درج کئے۔

۵۱۔ لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

شاہد: معشوق۔ عاشق کش: عاشقوں کو قتل کرنے والا۔ دشمن کام: دشمن کی مراد بر لانے والا یعنی خستہ و پریشان و غمزدہ۔

۵۲۔ آسمان کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گردِ نیلی فام

تیز گرد: جلد جلد چکر لگانے والا۔ نیلی فام: نیلے رنگ کا۔ یعنی آسمان کا نام گنبد تیز گرد نیلی فام مقرر کیا گیا۔

۵۳۔ حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلف کو دام

روز ازل ہی خال کے لئے دانہ اور زلف کے لئے دام کے لقب لکھ دیئے گئے ہیں۔

۵۴۔ آتش و آب و باد و خاک نے لی   وضعِ سوز و نم و رم و آرام

لف و نشر مرتب ہے۔ پہلے مصرعہ میں جو چار چیزیں بیان کی گئی ہیں مصرعہ ثانی میں ان کی صفات اسی ترتیب سے درج ہیں یعنی آگ کی صفت سوز، پانی نم، ہوا کی صفت رمیدگی اور خاک کی صفت سکون۔ روزِ ازل ان چار چیزوں کو یہ صفات دی گئیں۔

۵۵۔ مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز   ماہِ تاباں کا اسمِ شحنۂ شام

یعنی روزِ ازل آفتاب کو خسروِ روز کا خطاب دیا گیا اور چاند کو رات کی کوتوال کا عہدہ ملا۔

۵۶۔ تیری توقیع سلطنت کو بھی   دی بدستور صورتِ ارقام

توقیع: فرمان۔ یعنی اے ممدوح روزِ ازل رات اور دن کے اوراق پر جو احکام درج ہوئے ان کا منشا یہی تھا کہ تیری سلطنت کا فرمان بھی لکھا جائے۔ چنانچہ کاتبِ تقدیر نے ازروئے قانون تیری حکومت کا فرمان ان اوراق پر تحریر فرما دیا۔

۵۷۔ کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم   اس رقم کو دیا طرازِ دوام

کاتبِ حکم: دستِ قضا۔ طراز: نقش و نگار۔ یعنی اے ممدوح جب تیری سلطنت کا حکم لکھا گیا تو دستِ قضا نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب اس توقیع پر ہمیشگی کی مہر ثبت کر دی یعنی جس طرح صفاتِ روز و شب پر لکھے ہوئے احکام دوامی ہیں تیری سلطنت کو بھی دوام حاصل ہے۔

۵۸۔ ہے ازل سے روائیِ آغاز   ہو ابد تک رسائیِ انجام

روائی: رواج و رونق دبرآمدن حاجت (غیاث اللغات)۔ آغاز: قصد ـــ دعائیہ شعر ہے مطلب یہ ہے کہ روزِ ازل سے اے ممدوح تیرا ارادہ پورا ہوتا آیا ہے۔ یعنی جو تو چاہتا ہے وہ حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ خدا کرے کہ اس کامیابی کا سلسلہ ابد تک پہنچ جائے۔ یعنی ابد تک اسی طرح تیرے ارادے پورے ہوتے رہیں۔ شعر میں ایہام ہے۔ آغاز کے معنی قصد و ارادہ کے لئے گئے ہیں۔

قصیدہ نمبر (۴)

۱۔ صبحدم دروازۂ خاور کھلا   مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خاور: مشرق۔ منظر: فرماتے ہیں کہ صبح ہوتے ہی دروازۂ مشرق کھلا اور آفتاب نے دنیا کو روشن کر دیا۔

۲۔ خسروِ انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

رات کو جو جواہرات کا خزانہ نظر آ رہا تھا صبح تک شاہ انجم نے ان کو صرف کر دیا یعنی آفتاب نکلا اور تارے غائب ہو گئے۔

۳. وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو راز مہ و اختر کھلا

سیمیا: طلسم جس کے ذریعہ موہوم اشکال جن کا فی الحقیقت کوئی وجود نہ ہو ظاہر کئے جائیں۔

فرماتے ہیں رات کے وقت چاند تاروں کا نظر آنا ایک طلسم تھا صبح ہوتے ہی ان کا یہ راز فاش ہو گیا اور مہ و اختر کافور ہو گئے۔ گویا مہ و اختر طلسم کے ذریعہ نمودار کئے گئے تھے کہ صبح ہوتے ہی طلسم ٹوٹا اور وہ غائب ہو گئے۔

۴. ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

کواکب: تارے، یعنی تارے اصل میں بہت بڑے بڑے کرے ہیں مگر ہم کو بہت چھوٹے ٹمٹماتے چراغ سے نظر آتے ہیں۔ ان بازیگروں کا یہ کھلا دھوکا ہے۔

۵. سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

۶. صبح آیا جانب مشرق نظر — اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

نگار: معشوق، نگار آتشین رخ: آفتاب سے استعارہ ہے۔

۷. تھی نظر بندی کیا جب رد سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

یعنی رات میں موتیوں کا زیور سطح آسمان پر دکھائی دینا اور صبح ایک نگار آتشین رخ کا نظر آنا یہ نظر بندی کا جادو تھا جب ہم نے اس جادو کا رد کر دیا تو طلسم ٹوٹ گیا اور اصل چیز سامنے آ گئی۔ وہ بادۂ گلرنگ کا ساغر تھا۔

۸. لاکے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا

صبوحی: صبح کی مئے نوشی۔

۹. بزم سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

۱۰. تاج زرین مہر تاباں سے سوا — خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

سوا: زیادہ + آفاق، دنیا + کھلا، بھلا معلوم ہوا۔

۱۱. شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

یعنی ممدوح بہادر شاہ شہنشاہ دہلی ایسا روشن دل ہے کہ اس کائنات کے وجود میں آنے کا بھید اس پر روشن ہو گیا۔ بجز روشن ضمیری کے راز ہستی کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

۱۲۔ وہ کہ جس کی صورت تکوین میں مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

تکوین، پیدا کرنا، وجود میں لانا۔ فرماتے ہیں کہ میرا ممدوح وہ ہے جس کی پیدائش کے بعد نو آسمان اور سات ستاروں کی تخلیق کا مقصد سمجھ میں آیا۔ بادشاہ کی تکوین کے پہلے تک ہم بے خبر تھے کہ یہ آسمان ستارے کس کے لئے بنے ہیں۔ جب وہ پیدا ہوا تب معلوم ہوا کہ یہ سب کارخانہ قدرت نے اسی لئے بنایا تھا۔

۱۳۔ وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

تاویل، کلام کی ظاہر صورت کو دوسری طرف پھیر کر نتیجہ نکالنا۔ ایک عبارت کو دوسری عبارت میں بیان کرنا۔ یعنی ایسی عبارت جس کا اصل مفہوم ظاہر الفاظ سے سمجھ میں نہ آسکے ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ مطلب سمجھ میں آسکے۔ فرماتے ہیں کہ بادشاہ ایسا دیندار اور روشن دل ہے کہ جو احادیث ہماری سمجھ سے باہر ہوں بادشاہ کی تفہیم و تاویل سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

۱۴۔ پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

دارا، ایک مشہور بادشاہ کا نام، سرہنگ، سردار لشکر نیز نقیب کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ یعنی بادشاہ کے سرداران فوج کی جب فہرست دیکھی گئی تو پہلا نام دارا کا نکل آیا۔ جب دارا جیسا بادشاہ اس کا خادم تھا۔ تو ممدوح کا علو مرتبت ظاہر ہے۔

۱۵۔ روشناسوں کی جہاں فہرست ہے واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

روشناس، واقف کار، جان پہچان کا۔ یعنی جان پہچان کا وہی آدمی ہو سکتا ہے جو اکثر و بیشتر آکر ملتا رہے۔ تیرے روشناسوں کی فہرست میں قیصر روم کا نام اور حلیہ واضح طور پر لکھا ہوا ہے یعنے قیصر بھی تیری ملاقات کو آیا کرتا تھا۔

قطعہ

۱۶ توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
۱۷ نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

توسن، گھوڑا۔ غیرت صرصر جس کی تیز رفتاری کو دیکھ کر تیز و تند ہوا بھی شرما جائے۔ آذر، بت تراش، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا۔ جو بت تراشا کرتے تھے۔ یعنی بادشاہ کے گھوڑے کے نشان قدم بھی نقش و نگار میں بت خانۂ آذر کی طرح حسین ہیں۔

۱۸. مجھ پہ فیضِ تربیتِ شاہ کے منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

محور: دھرا۔ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے فیض تعلیم سے چاند سورج اور محور کے کیا کیا فرائض ہیں معلوم ہوئے۔ یعنی چاند سورج اور محور بادشاہ کے حکم کی بجا آوری میں سرگرداں ہیں۔

۱۹. لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک میری حدِ وسع سے باہر کھلا

عقدے: گرہیں۔ مسائل لاینحل۔ حدِ وسع سے باہر: استطاعت سے باہر یعنے میرے دل میں لاکھوں مسائل حل طلب تھے۔ اور ان میں کا ہر مسئلہ میری سمجھ اور قابلیت سے باہر تھا۔ لیکن بادشاہ کے فیض تربیت نے ان سب عقدوں کو وا کر دیا۔

۲۰. تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید کس نے کھولا۔ کب کھلا۔ کیوں کر کھلا

فرماتے ہیں کہ میرا دل اس طرح منقبض ہو گیا تھا کہ بظاہر اس کے کھلنے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی تھی لیکن ممدوح کی ادنیٰ توجہ سے ایسا کھل گیا کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب کھلا کس نے کیوں کر کھولا۔

۲۱. باغِ معنی کی دکھاؤنگا بہار مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

اس شعر میں کھلنا بمعنی التفات فرمانے کے ہیں۔ باقی مطلب صاف ہے۔

۲۲. ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

طبلۂ عنبر: عنبر کی صندوقچی۔ یعنی جوں ہی میں قصیدہ کہتے کہتے غزل شروع کر دوں تو اس کی مہک سے لوگوں کے دماغ معطر ہو جائیں گے جس طرح طبلۂ عطار کے کھلتے ہی خوشبو پھیل جاتی ہے اور دماغوں کو معطر کر دیتی ہے۔

۲۳. کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

پر کھلے ہوئے ہیں مگر کنج قفس میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ حالت میرے لئے تکلیف دہ ہے اگر پر بھی بندھے ہوتے تو اڑنے کی آرزو ہی پیدا نہیں ہوتی۔ قفس کی قید و بند زیادہ موجب آزار نہیں ہوتی اس لئے تمنا کرتے ہیں کہ قفس کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا تو اچھا تھا۔

۲۴. ہم پکاریں اور کھلے۔ یوں کون جائے یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

یعنی ہم عوام میں سے نہیں ہیں کہ دروازہ کھلا نظر آیا اور گھس گئے۔ ہم خاص آدمی ہیں جب تک ہمارے لئے خاص طور پر دروازہ نہ کھولا جائے ہم نہیں جائیں گے۔

۲۵. ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

فرماتے ہیں ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ تیر راز دوست کا ہم کو معلوم ہے وہ کسی اور کو معلوم نہیں اور

ہم نے بڑی احتیاط سے اس کو چھپائے رکھا ہے۔ ہمیں یہ خبر ہی نہیں کہ دوست کا راز دشمن پر ظاہر ہوگیا ہے۔

۲۶۔ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

یعنی دل پر زخم داغ سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ کی لذت در دسے زخم کی لذت زیادہ ہے۔

۲۷۔ ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا

شعر صاف ہے۔

۲۸۔ مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ رہروی میں پر وہ رہبر کھلا

بدرقہ: قافلہ، خزانہ کے ہمراہ کا حفاظتی دستہ، رہبر۔ مطلب یہ ہے کہ راستے میں رہبر کی صلاحیت اور واقفکاری کی قلعی کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح منزل ناشناس ہے۔ البتہ ایک بغیر دام کا بدرقہ اور راستہ کا ساتھی ہے اس کا ہمسفر رہنا کیا برا ہے۔

۲۹۔ سوز دل کا کیا کرے باران اشک آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

فرماتے ہیں کہ آنسوؤں کی بارش آتش دل کو بالکل بجھا نہیں دیتی۔ جبتک آنسو جاری رہے آگ دبی رہی۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے آنسو رکے تو دل کی آگ پھر بھڑک اٹھتی ہے۔

۳۰۔ نامہ کے ساتھ آگیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

خط آتے ہی خوشی کے مارے مرگئے اور خط چھاتی پر کھلا رہ گیا۔

۳۱۔ دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

یعنی غالب ظاہر میں کافر اور باطن میں ولی ہے۔ خبردار اس کی ظاہری حالت کو دیکھکر اس سے الجھ جاؤگے تو نتیجہ برا ہوگا۔

۳۲۔ پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

یعنی اب غزل خوانی ختم ہوگئی پھر مدح گوئی کا خیال آگیا۔ اب جو اشعار بادشاہ کی مدح میں لکھے جائیں گے وہ چاند اور سورج جیسے روشن و درخشاں نکلیں گے۔

۳۳۔ خامہ نے پائی طبیعت سے مدد بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

یعنی جب مدح سرائی کا خیال پیدا ہوگیا تو طبیعت نے قلم کی مدد کی۔ بہت سے مضامین قلم کے لئے فراہم کر دیئے اور بحر معانی میں کشتی فکر چل نکلی۔ گویا خیال کا آنا کشتی کے بادبان کا اٹھنا

اورمضامین کا ذہن میں آنا کشتی کا لنگر کھلنے کے مماثل تھا۔ ان دوباتوں کی تکمیل کے بعد قلم چلنے لگا۔

۳۴۔ مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — عرض سے یاں رتبۂ جوھر کھلا

عرض وجوہر دو فن فلسفہ کی اصطلاحیں ہیں۔ عرض وہ چیز جو قائم بالذات نہو۔ اور جوہر وہ چیز جو قائم بالذات ہو۔ مثلاً کپڑا اور اسکا رنگ کپڑا جوہر ہے اور رنگ عرض ہے۔ گویا جوہر سے عرض کا وجود ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مدح سرائی میں فلسفہ عرض وجوہر الٹا ہو جاتا ہے یعنی عرض سے جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ مدح کرنے کے بعد ہی ممدوح کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔ اور ممدوح کا جوہر یعنے اس کے اعلیٰ صفات سب پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلے عرض یعنی مدح اور اس کے بعد جوہر کا کھلنا ہے۔

۳۵۔ مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشاہ کا رایتِ لشکر کھلا

آفتاب پر نظر ڈالنے سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب تھرا رہا ہے۔ چرخ بھی ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ آفتاب اور آسمان کی ان طبعی حالتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ شاعر لرزنے اور چکر کھانے کا باعث بادشاہ کے رایت کے کھلنے کو قرار دیتا ہے یعنی علم شاہی کے خوف سے سورج لرز رہا ہے اور آسمان چکر کھا رہا ہے۔

۳۶۔ بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علو پایۂ منبر کھلا

یعنی منبر کی علو مرتبت کی وجہ پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب منبر پر چڑھ کر خطیب نے بادشاہ کا نام لیا۔ تب سمجھ میں آگیا کہ منبر کی عظمت اس لئے کی جاتی ہے۔

۳۷۔ سکۂ شاہ کا ہوا ہے رُوشناس — اب عیار آبروئے زر کھلا

سکہ: ٹھپہ، وہ نقش جو چاندی یا سونے کی ٹکیہ پر اٹھایا یا کندہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ معیاری ہو جائے فرماتے ہیں کہ سونے چاندی پر بادشاہ کا نام مسکوک ہونے کی وجہ اس کے عیار کی عزت کھلی ہے۔ بغیر بادشاہ کے نام کے سکہ کے اسکو کوئی کامل عیار نہیں سمجھتا۔

۳۸۔ شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِٔ اسکندر کھلا

مآل: نتیجہ، مرجع شاعری میں جام جم کی طرح آئینہ سکندر کی بھی ایک مشہور تلمیح ہے کہتے ہیں کہ سکندر کے پاس ایک ایسا آئینہ تھا جس میں دنیا کے حالات نظر آتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے آگے آئینہ دھرا ہوا ہے یہ وہی آئینہ ہے جس کو سکندر نے بنوایا تھا اس سے پہلے تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سکندر نے اتنی سعی بلیغ آئینہ بنانے میں کیوں کی تھی۔ لیکن اب اس کی کوشش کا

نتیجہ یا مقصد ہم پر واضح ہو گیا کہ اتنی جد و جہد اس نے صرف بادشاہ کی مدح کیلئے کی تھی ۔

۳۹۔ ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے　　　اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

طغرل = چغتائی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ ۔ سنجر = سلطان سنجر عادل ۔ فرماتے ہیں کہ طغرل و سنجر سلطنت کے جھوٹے دعویدار تھے ۔ ملک کا حقیقی وارث میرا ممدوح تھا جب خلق نے حقیقی وارث کو دیکھا تو طغرل و سنجر کا فریب ظاہر ہو گیا ۔ لفظ "اب" شعر کی جان ہے ۔ اس پر زور دیا جائے تو لطف سوا آئے ۔

۴۰۔ ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے　　　دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

جہاں داور = بادشاہ ۔ نام ہے = محض شہرت ہے ۔ فرماتے ہیں کہ یہ ایک خالی شہرت ہے کہ بادشاہ کی مدح کے میں نے دفتر کھول دیئے ہیں ۔ حالانکہ بادشاہ کی تعریف کا حق کوئی ادا نہیں کر سکتا ۔

۴۱۔ فکر اچھی پر ستایش ناتمام　　　عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا

ستایش = تعریف ۔ ستایش گر = تعریف کرنے والا ۔ فرماتے ہیں کہ فکر تو اچھی ہے لیکن تعریف پوری نہیں ہوئی ۔ اچھی فکر کے باوصف ستایش کا نا تمام رہنا ستایش گر کے عجز کا ثبوت ہے ۔ یعنی خواہ کوئی کتنا ہی خوش فکر کیوں نہ ہو بادشاہ کے اوصاف بیان کرنے میں عاجز ہے ۔

۴۲۔ جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل　　　تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

۴۳۔ تم کرو صاحبقرانی جب تلک　　　ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

خاقان = بادشاہ ۔ خطِ لوحِ ازل = ہر ایک کا نوشتۂ قسمت ۔ صاحبقرانی = بادشاہت ۔ فرماتے ہیں کہ اے بادشاہ آپ پر سارے حالات منکشف ہیں ۔ اپنی ضروریات کا اظہار غیر ضروری ہے اس لئے دعا پر مدح ختم کرتا ہوں جب تک یہ روز و شب کا طلسم جاری ہے تم حکمرانی کرو ۔

مثنوی

۱۔ ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز　　　کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

زمزمہ = نغمہ ۔ زمزمہ ساز = نغمہ سرا ۔ خزینۂ راز = دل کی باتیں جو اب تک چھپی ہوئی ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ اے دلِ دردمند اب تو اپنے خزانہ کا دروازہ کھول دے اور شعر و سخن کے جواہرات جو چھپے ہوئے ہیں ان کو ظاہر کر دے ۔

۲۔ خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا　　　شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

یعنے جس طرح شاخ گل سے پھول جھڑتے ہیں اسی طرح میرے قلم سے بھی پھول جھڑتے ہیں

۳۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھئے

دل سے خطاب ہے۔ خرد افزا: عقل میں اضافہ کرنے والا۔

فرماتے ہیں کہ اے دل مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے ایسے نکتے اور مضامین بیان کر جس سے دماغ روشن ہو جائے۔

۴۔ بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

رطب: کھجور۔ یعنی اب قلم سے شیریں ہی شیریں باتیں نکلنے لگے۔ اس لئے کہ بیان آموں کا ہے۔

۵۔ آم کا کون مرد میداں ہے
ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

مرد میدان، مقابلہ کرنے والا۔ آم کے درخت کا پھل گولا۔ اور اس کی ٹہنی بلا ہے۔ پس جس میوہ کے دل میں آم سے مقابلہ کرنا ہو۔ میدان میں آئے گوئے اور چوگان موجود ہے۔

۶۔ تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوئے اور یہ میدان

تاک: انگور۔ ارمان، مقابلہ کی آرزو۔ انگور کو اپنی شیرینی پر ناز ہے۔ آم سے مقابلہ کا ارمان اس کے دل میں کیوں رہ جائے۔ گوے میدان موجود ہے آئے اور مقابلہ کرے۔

۷۔ آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

پیش جانا: کامیاب ہونا۔ بس چلنا۔ جلے پھپولے پھوڑنا، دل کا بغض و حسد ظاہر کرنا۔ فرماتے ہیں کہ آم کا مقابلہ انگور نہ کر سکا۔ اس لئے جلے پھپولے پھوڑ رہا ہے۔ انگور آبلوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔

۸۔ نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

۹۔ یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

جب تاک یعنی انگور آم کے مقابلہ میں ہار گیا تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ اور شراب بن گیا۔

۱۰۔ مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

۱۱۔ نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

کوئی لفظ مشکل نہیں۔ مطلب بھی صاف ہے۔

۱۲۔ اور دوڑائیے قیاس کہاں
جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

یعنی انگور اور نیشکر کی شیرینی سے مقابلے کے بعد دوسری میٹھی چیزوں پر قیاس

دوڑ ایا جا رہا ہے آخر ایک شیریں چیز جان ذہن میں آگئی اب اس کا آم سے مقابلہ ہے۔

۱۳۔ جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن باوجود غمگینی
۱۴۔ جان دینے میں اسکو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

یعنی کوہکن باوجود جان سے بیزار ہونے کے۔ اس طرح آسانی سے جان نہ دیتا۔ اگر جان میں آم کی سی حلاوت ہوتی۔

۱۵۔ نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
۱۶۔ آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

مگر: شاید۔ چونکہ آتش گل پر قند کو قوام دیا گیا ہے۔ اس لئے شیرینی کے ساتھ خوشبو بھی ہے۔

۱۷۔ یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغ جنت سے
۱۸۔ انگبیں کے بحکمِ رب الناس — بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

فرط: زیادتی۔ رافت: مہربانی۔ انگبیں: شہد۔ رب الناس: پروردگار۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے باغبانان جنت نے شہد کے سربمہر گلاس دنیا والوں کے لئے اپنی مہربانی سے آموں کی شکل میں بھیجے ہیں۔ آم کا رس لذت و شیرینی میں جنت کے شہد سے مشابہ ہے۔

۱۹۔ یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
۲۰۔ تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

حضرت خضر علیہ السلام کے دستِ مبارک کا فیض جس کی برکت سے شاخ زقوم بھی ثمر شیریں پیدا کرے۔ اگر وہ شاخ نبات لگائیں تو اس کے پھل کی شیرینی و لذت اندازہ اور قیاس سے باہر ہوگی۔ اگر اس کی آبیاری آب حیات سے ہو تو پھر اس کی حلاوت نہ پوچھو آم کا درخت ایسا ہی ہے۔

۲۱۔ تھا ترنج زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
۲۲۔ آم کو دیکھتا اگر یک بار — پھینک دیتا طلائے دست افشار

ترنج: چکوترا۔ خسرو: خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں۔ طلائے دست افشار: ایسا نرم سونا کہ ہاتھ سے دبا کر جو شکل چاہیں بنائیں جیسے کمہار چکنی مٹی سے برتن بنا لیتے ہیں۔ خسرو پرویز ہرمز کا بیٹا اور نوشیرواں کا پوتا تھا لیکن شیریں کے عاشق کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس ایسا نرم اور نایاب سونا تھا کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز چاہیں بنالی جاتی تھی۔ اس نے اس سونے کا ایک ترنج بنا رکھا تھا جو اس کے دسترخوان پر بطور زینت رکھا جاتا تھا۔

آم ملک ہندوستان کا پھل ہے۔ ایران میں نہیں ہوتا۔ اگر خسرو آم کو دیکھ لیتا تو بجائے ترنج زر، آم کو زینت دسترخوان بناتا اور ترنج زر پھینکدیتا۔

۲۳۔ رونق کارگاہِ برگ و نوا ‎ ‎ نازشِ دودمانِ آب و ہوا

کارگاہ: کارخانہ۔ کارگاہ برگ و نوا، کارخانۂ قدرت۔ دودمان: خاندان۔ نازش: فخر۔ فرماتے ہیں کہ کارخانہ قدرت کی رونق آم ہے۔ آب و ہوا سے صدہا میوے پیدا ہوتے ہیں لیکن آم پر آب و ہوا کو بھی فخر ہے۔

۲۴۔ رہ رو راہ خلد کا توشہ ‎ ‎ طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

جگر گوشہ: تخم۔ طوبیٰ: سدرہ: یہ دونوں جنت کے درخت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ آم کا درخت طوبیٰ و سدرہ کے تخم سے اُگا ہے۔ اس لئے یہ جنت کا پھل ہے۔ چنانچہ مرتے ہوئے بھی لوگ سے شوق سے کھاتے ہیں تاکہ اس کے وسیلہ سے جنت پہنچ جائیں۔

۲۵۔ صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ‎ ‎ ناز پروردۂ بہار ہے آم

آم کا درخت پر شاخ و برگ ہوتا ہے۔ اور اس کی فصل موسم بہار میں آتی ہے۔ اس لئے ناز پروردۂ بہار ہے۔

۲۶۔ خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ‎ ‎ نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

نوبر: فصل میں جو پھل پہلے اترے۔ مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں ایک لطیفہ لکھا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ بادشاہ کے دو باغ تھے۔ باغ حیات بخش اور مہتاب باغ۔ اس شعر میں ان ہی باغوں کی طرف اشارہ ہے اس موقع پر اس لطیفہ کا اندراج خالی از لطف نہ ہوگا

"ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدرہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلطان یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو۔ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ؎
بر سر ہر دانہ بنشتہ عیاں ؛ کاین فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانہ پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی" (یادگار غالب)

۲۷۔ وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد   عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد

مصرعہ اول میں عہد کے معنی پیمان کے ہیں اور مصرعہ ثانی میں زمانہ کے یعنی وہ اپنے قول اور عہد و پیمان کا پکا ہے۔ اس کے انصاف کی دنیا کو حمایت حاصل ہے۔

۲۸۔ فخرِ دین عز و شانِ جاہ و جلال   زینتِ طینت و جمالِ کمال

دینِ اسلام کے لئے اس کا وجود باعث فخر ہے اور جاہ و جلال کی عزت اس کی ذات سے ہے۔ پاک باطنی کو اس کی ذات سے زینت اور کمال کو اس سے حسن حاصل ہے۔

۲۹۔ کار فرمائے دین و دولت و بخت   چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

یعنی وہ دین اور سلطنت اور قسمت کا دھنی ہے۔ تاج اور مسند بادشاہی اور تخت کی اس کی ذات سے زینت ہے۔

۳۰۔ سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے   خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

شعر صاف ہے۔

۳۱۔ اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور   جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

۳۲۔ اس خداوندِ بندہ پرور کو   وارثِ گنج و تخت و افسر کو

۳۳۔ شاد و دلشاد و شادماں رکھیو   اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

مُفیض، فیض دہندہ یعنی اللہ تعالیٰ۔ سایہ و نور۔ لیل و نہار، رات دن۔ افسر، تاج۔ خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جبتک یہ لیل و نہار ہیں بادشاہ کو شادمان اور غالب پر مہربان رکھے۔

قطعات

قطعہ نمبر (۱)

۱۔ اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر   اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

فلک منظر، فلک رفعت۔ جہاں دار، بادشاہ۔ کرم شیوہ، سخی۔ بے شبہ و عدیل، بے مثل و نظیر۔ شبہ بالکسر بمعنی مثل و مانند۔ عدیل، نظیر، مانند۔ بادشاہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ علو مرتبہ اور سخاوت میں تیرا کوئی عدیل و نظیر نہیں ہے۔

۲۔ پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ   فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

فرق، سر۔ ارادت، عقیدت، اطاعت۔ اورنگ، تخت۔ کسب کرنا، حاصل کرنا۔ اکلیل، تاج۔

سعادت، نیک بختی۔ فرمانبرداری۔ چونکہ بادشاہ تخت کی سطح پر پاؤں رکھ کر بیٹھتا ہے تو گویا تخت اپنے سر کو بادشاہ کے پاؤں سے ملتا ہے۔ اسی طرح جو خوش بختی تاج کو نصیب ہے، وہ محض بادشاہ کے سر کا فیض ہے۔ ورنہ بجز بادشاہ کے تخت و تاج کو یہ عزت کہاں نصیب ہوتی۔

۳۔ تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام　　تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

بالِ جبریل، حضرت جبریل علیہ السلام کا بازو۔ فرماتے ہیں تیری گفتار سے الہامی دقیق مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح شانہ سے زلف سلجھ جاتی ہے۔ اور تیرا قلم روانی اور تیزی میں بالِ جبریل کے مماثل ہے۔

۴۔ تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم　　تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

مائدہ، دسترخوان۔ بذل، سخاوت۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خدا سے تقرب اور ہمکلامی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے بادشاہ تجھ کو بھی بارگاہ ایزدی میں تقرب حاصل ہے۔ تیرے تقربِ الٰہی کو دیکھ کر لوگوں نے قربِ کلیم کو سمجھا۔ اور دنیا میں تیری سخاوت سے دسترخوانِ خلیل بچھا ہوا ہے۔

۵۔ بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ　　بہ کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

اوج، بلندی۔ قلزم، بحر قلزم۔ نیل، دریائے نیل۔ یعنی بادشاہ کی شاعری و کلام نے الفاظ و معنی کا رتبہ بلند کر دیا اور اس کی سخاوت نے قلزم و نیل کی فیض رسانی کو مات کر دیا۔

۶۔ تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر　　تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

۷۔ ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر　　زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

توفیر، زیادتی۔ تقلیل، کمی۔ ثور، آسمان کا دوسرا برج جو بیل کی شکل کا ہے۔ حوت، بڑی مچھلی، آسمان کا بارہواں برج۔ زہرہ، تیسرے فلک ایک ستارے کا نام جو تیسرے آسمان پر ہے۔ از روئے علم نجوم دنیا میں رنج و راحت ستاروں کی گردش سے پیدا ہوتی ہے جب ماہ برج ثور میں اور زہرہ برج حوت میں ہو تو دنیا میں عیش و طرب کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے عہد میں عیش و طرب کی فراوانی اور غم کی کمی کیلئے ماہ نے برج ثور سے باہر آنا چھوڑ دیا اور زہرہ نے برج حوت سے نکلنا ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اب دنیا میں ہمیشہ خوشی ہی خوشی رہیگی شرفِ ماہ برج ثور کے درجہ سوم یعنی منزل ثریا میں آنے سے ہوتا ہے۔ شرفِ زہرہ برج حوت میں تحویل سے ہوتا ہے۔ اور جب ان سیاروں کو شرف ہوتا ہے اس وقت جو کام کیا جائے وہ مبارک

اور نیک ہوتا ہے اسی وجہ سے دنیا میں خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے چاند برج ثور کے باہر نہیں جاتا اور زہرہ نے حوت سے نکل کر دوسرے برج میں جانا ترک کیا۔ یعنی حوت ہی میں ہے۔

۸۔ تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین — تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل

۹۔ تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

اصلاح مفاسد کی رہین: برائیوں کو دور کرنے کی ضامن۔ انجاح مقاصد کی کفیل: مقصد برآری کی کفالت کرنے والی۔ اقبال: اقرار۔ اقبال ترحم: رحم کرنے کا وعدہ یا اقرار۔ نوید: خوش خبری۔ مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کا دانشمندانہ طرز عمل مجھ کو برائیوں سے روکتا ہے اور اس کی بخشش و عطا سے بہت سارے کام نکلتے ہیں۔ اس کے اقرار رحم کی وجہ میں زندہ ہوں اور اگر وہ مجھ سے بے اعتنائی برتے تو میں چل بسوں۔

۱۰۔ بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

۱۱۔ پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

۱۲۔ تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

بخت ناساز: بدقسمتی۔ چرخ کجباز: دھوکہ باز کج رفتار آسمان۔ سررشتۂ اوقات: حالات زندگی۔ بُن: جڑ۔ رابطہ: تعلق۔ کشش دم: سانس کھینچنا یا لینا۔ ضابطہ: قاعدہ، قانون۔ جرثقیل: وزنی اور بھاری بھرکم چیزوں کو کھینچنے کا علم۔ تپش: بے قراری، دھڑکن۔ یعنی بدقسمتی نے مجھ کو آرام و سکون دینا نہیں چاہا اور آسمان مجھ کو ذلیل کرنے پر کمربستہ ہو گیا۔ ان دونوں نے پہلے ناخن تدبیر میں کیل ٹھونک کر عقدہ کشائی اور سعی و تدبیر کے قابل نہیں رکھا۔ اس کے بعد زندگی کے حالات کو الجھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دل کی حرکت اور بے قراری کا تعلق خوف عظیم سے ہے۔ اور سانس بغیر جرثقیل کی مدد کے نہیں کھینچ سکتے۔ یعنی سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

۱۳۔ درِ معنیٰ سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی — غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

۱۴۔ فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

۱۵۔ میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لقا: ایک افسانوی بادشاہ جو داڑھی میں موتی پرو دیا کرتا تھا۔ عمر کی زنبیل: عمرو عیار کی زنبیل مشہور چیز ہے۔ ابہام: توضیح کی ضد، کسی بات کو کھول کر بیان نہ کرنا۔ اجمال: اختصار۔ یہ ہر سہ شعر فخریہ ہیں، جن میں اپنے کلام کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان میں شاعرانہ تعلی اور مبالغہ کا نام و نشان نہیں۔ جو کچھ لکھا ہے سچ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں میرا ہر صفحہ کاغذ در ہائے معانی سے لقا کی داڑھی بنا ہوا ہے

اور سینے میں دنیا کے سارے غموں کی سمائی ہے ۔ میرا تخیل ہزاروں شاعرانہ نکتے فراہم کرتا ہے
اور میرا قلم ان نکتوں کو مختصر سے مختصر عبارت میں بیان کر جاتا ہے ۔ میرے اشعار میں جو ابہام
ہوتا ہے وہ اس قدر پر لطف ہوتا ہے کہ توضیح اس پر قربان ہو جائے اور چند لفظوں میں مجملاً جو
مضامین اور مطالب ادا کرتا ہوں اس میں اتنی تفصیل پوشیدہ رہتی ہے کہ اگر کوئی شرح
کرنا چاہے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں ۔

۱۶ نیک ہوتی میری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی میری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

تعجیل، جلد بازی ۔ فرماتے ہیں کہ حضور! اگر میری حالت اچھی ہوتی تو آپ کو تکلیف نہ دیتا اور پریشان
خاطر نہ ہوتا تو جلدی نہ کرتا (یعنی درخواست کی منظوری کے لئے)

۱۷ ۔ قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و امان عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قبلہ و کعبہ دونوں سے معنے مرجع خلایق ہیں ۔ یعنی خستہ جان اور پریشان حالوں کا آپ کی بارگاہ
مرجع ہے اس لئے حاجت روائی میں اس قدر دیر قابل تعجب ہے ۔

قطعہ نمبر (۲)

۱ ۔ گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
۲ ۔ بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

مطلب یہ ہے کہ تم اپنی کمسنی و ناتجربہ کاری کی وجہ بوالہوسوں کے دم میں آگئے ان کی وفاداری
کی تعریف کیا کرتے تھے ۔ ہم نے ابتدا میں جتلایا بھی کہ وہ قابل اعتماد نہیں ۔ لیکن آپ نے اس کا برا مانا ۔
اس لئے خاموش رہتے تھے ۔ اب ان سے تمہاری بگاڑ ہو گئی اور ان کی بے وفائی ظاہر ہو گئی ۔ ہم سے
شرمندگی کاہے کی آؤ مل جاؤ ہم کبھی اپنی نصیحت یاد دلا کر تم کو شرمندہ نہیں کریں گے ۔

قطعہ نمبر (۳)

۱ ۔ کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
۲ ۔ وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
۳ ۔ وہ صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
۴ ۔ وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

مطرا = شاداب ۔ صف = بالفتح وتشدید خدمت ومہربانی ومہمانی کردن' پر یدن ۔ صف نظر = نظر کی مہمانی دعوتِ نظر ۔ ناب = خالص ۔ گوارا = خوش ذایقہ۔ حضرت غالبؔ نے (۱۲۵۲ھ میں) اپنی پنشن میں اضافہ کیلئے سوپریم کورٹ میں دعویٰ دائر کیا تھا۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ دو سال آپ کا قیام کلکتہ میں رہا۔ چونکہ ان دنوں کلکتہ دار السلطنت ہوگیا تھا اس لئے وہاں کی آرایش وزیبایش اور وہاں کی تعیشات و دلفریبیوں سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی موقع پر کلکتہ کا ذکر آگیا اور آپ کی نظروں میں وہ تمام چیزیں پھر گئیں ۔

اس قطعہ میں صرف ایک ہی لفظ تشریح کا محتاج ہے ۔ صف نظر ، صف کے معنی ہیں مہمانی کرنا' دعوت دینا اس لئے صف نظر کے معنی دعوتِ نظارہ ہوئے ۔ پھر مصرعہ کا مطلب یہ ہوا کہ حسینوں کی صبر آزما خوش نگاہی ہم کو دعوت نظارہ دے رہی تھی ۔ یعنی قابل دید تھی ۔ غالباً حسینانِ فرنگ کی طرف اشارہ ہے ۔ جو سیر و تفریح کے لئے سیرگاہ میں آتی ہوں گی ۔

قطعہ ۱۲ در مدح ڈلی

مولانا حالی نے حضرت غالبؔ کی بدیہہ گوئی کے ضمن میں کلکتہ کا ایک واقعہ یادگارِ غالب میں لکھا ہے ۔ " ۱۸۶۱ء میں جب کہ ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے ۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانہ میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے ۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا صاحب بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا ۔ شعراء کا ذکر ہو رہا تھا ۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی ۔ مرزا نے کہا فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے ۔" اس پر بات بڑھی ۔ اس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا ۔ مرزا بولے " اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں " مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو ۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا جو ان کے دیوانِ ریختہ میں موجود ہے ۔ اور جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

۱۔ ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

۲ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے؟ — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے؟

یعنی قلم اور ناطقہ دونوں حیران ہیں کہ اس کو کیا لکھیں اور کیا کہیں ۔ اس کے بعد کے گیارہ شعروں میں قلم اور ناطقہ بحالت حیرانی اپنے آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ آخر اس چکنی سپاری کو کیا کہیں ۔ ان گیارہ شعروں میں ۲۲ سوال ہیں قلم کے (۱۱) اور ناطقہ کے (۱۱) گیارہ ۔ گویا ہر مصرعہ ایک سوال ہے ۔

۳۔ مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے؟ — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے؟

مہر میں اور چکنی سپاری میں بلحاظ سیاہی و گولائی مناسبت ہے اس لئے لفافہ کی مہر سے تشبیہ دی ہے ۔

حرز بازو : تعویذ جو بازو پر باندھا جاتا ہے۔ بشگرفاں خود آرا : حسینان خود آرا۔

۴۔ مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے؟ داغِ طرفِ جگرِ عاشق شیدا کہیے؟

طرف : گوشہ۔ شعر صاف ہے۔

۵۔ خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے؟ سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے؟

خاتم : انگوٹھی۔ مانا : مشابہ۔ شعر صاف ہے۔

۶۔ اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے؟ خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلا کہیے؟

اخترِ سوختہ اور خال دونوں بھی سیاہ ہیں اس لئے چکنی سپاری سے مشابہ ہیں۔

۷۔ حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض؟ نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے؟

حجر الاسود دیوار حرم اور مشک کی سیاہی وجہ شبہ ہے۔

۸۔ وضع میں اسکو اگر سمجھئے قافِ تریاق رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

ق کی گولائی اور بالوں کی سیاہی۔ وضع و رنگ کے اعتبار سے چکنی سپاری سے مشابہ ہے۔

۹۔ صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز میکدہ میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

صومعہ : پارسیوں کی عبادت گاہ مگر یہاں نقطۂ نماز کے پیش نظر صرف عبادت گاہ مراد ہے

۱۰۔ کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟

۱۱۔ کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

گوہر نایاب اس لئے کہا ہے کہ گوہر سیاہ نہیں ہوتا اسی طرح دیدۂ عنقا بھی نایاب ہے۔ نقطۂ پرکار تمنا : مرکز تمنا اس لئے کہ ہر شخص اس کا خواہاں ہے۔ پان سپاری سے احباب کی تواضع کی جاتی ہے اس لئے یہ محبت کی نشانی ہے اور اظہار محبت ہوتا ہے لہٰذا گنج محبت کا قفل کہا۔

۱۲۔ کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے

تکمہ : گھنڈی۔ نقش پئے ناقہ : اونٹنی کا نقش قدم جو گول ہوتا ہے۔ حیرانی کے ان سوالات کے بعد آخر کار خامہ اور ناطقہ نے اپنے سوالوں کا ایک جواب پا لیا۔ یعنی۔

۱۳۔ بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

مولانا حالی نے گیارہ شعر کا قطعہ لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یادگار غالب میں کاتب کی سہو کتابت سے تیرہ[۱۳] کی بجائے گیارہ لکھ دیا گیا ہے۔

قطعہ نمبر ۵

۱۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

۲۔ نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

"جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریہ میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گزرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے۔ جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اولوش لے کر آیا۔ ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے متعجب ہو کر پوچھا بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ مرزا نے کہا۔ ارے احمق چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔"

(از یادگارِ غالب)

سہرا

اس سہرے کے مقطع میں شاعر نے شاعرانہ تعلّی کی ہے۔ مگر بادشاہ اور استاد ذوق نے اس تعلّی کو چوٹ سمجھا اور بادشاہ کی ایما سے ایک سہرا اسی وقت اس کے جواب میں ذوق نے لکھا۔ اس واقعہ کو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مولفِ آبِ حیات نے یوں لکھا ہے:۔

"نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے۔ باوجودیکہ بہت سے مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولی عہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالبؔ مرحوم نے یہ سہرا لکھ کر زر نگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور کہا مقطع کو بھی دیکھا عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔ اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں اسی وقت انہیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے ادا شناس تھے سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گزرانا سب طرف تعریفیں ہوئیں۔"

(ماخوذ از ذرۃ الغالب)

سہرا

۱۔ خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

۲۔ کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

۳۔ سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

پھبتا ہے، زیب دیتا ہے۔ طرفِ کلاہ، گوشہ دستار۔ لمبر، درجہ، نمبر۔ یعنی اے دستار تجھکو شہزادے کے سر پر چڑھنا زیب تو دیتا ہے۔ مگر اندیشہ ہے کہ سہرے کا نمبر تجھ سے نہ بڑھ جائے۔

۴۔ ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

ناؤ اور کشتی کی لفظی رعایت نے شعر میں خوبی پیدا کر دی ہے۔ مطلب واضح ہے۔

۵۔ سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

۶۔ رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا — ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یعنی دولھا کے رخسار پر پسینہ کی بوندیں آبدار موتی کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ گویا سہرے کی لڑی ابرِ گہربار کی رگ ہے جو موتی برسا رہی ہے۔

۷۔ یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

۸۔ جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

تاکہ موتی مغرور نہ ہو جائیں کہ شہزادے کے سہرے کے قابل صرف ہم ہیں ایک پھولوں کا بھی سہرا ضرور چاہیئے۔

۹۔ جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

جب یہ خبر پھولوں کو ہوئی کہ ان کا بھی ایک سہرا شہزادے کے لئے گوندھا جائے گا۔ تو وہ خوشی کے مارے جامے سے باہر ہوگئے۔ ایسی حالت میں ان کو اکٹھا کرکے سہرا گوندھنا دشوار ہوگیا ہے۔

۱۰۔ رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک — کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

دمک، چمک۔ گوہرِ غلطاں، نہایت گول اور قیمتی موتی۔ یعنی شہزادے کا چہرہ مثل چاند کے ہے۔ اس پر سہرے کے آبدار موتی تاروں سی چمک دکھا رہے ہیں۔

۱۱۔ تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار — لائیگا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا؟

لائیگا، استفہاماً کہا گیا ہے یعنی کیوں کر لائے گا، کیسے لائے گا۔ فرماتے ہیں کہ موتیوں کا وزن اس قدر زیادہ ہے کہ ریشم کا باریک تار اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ ریشم کا تار نہیں ہے۔ بلکہ ابرِ بہار کی رگ ہے تب ہی تو یہ گرانباریٔ گوہر سنبھالے ہوئے ہے۔

۱۲۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اس قطع میں شاعرانہ تعلّی ہے کہ کوئی دوسرا شاعر اس سے بہتر سہرا نہیں کہہ سکتا۔ "دیکھیں" کا لفظ بھی بہت چبھتا ہوا ہے۔ گو شاعر کی نیت نہ ہو دعوت مبارزت کی۔ مگر ایسے ماحول میں جہاں بہت سے سخنوران کامل ہوں اور جن میں چوٹیں چلتی رہتی ہوں اسکو چیلنج تصور کرنا غلط نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بادشاہ نے یہی سمجھا اور استاد ذوق نے اس کے جواب میں ایک سہرا یوں کہا۔

سہرا استادِ ذوق

۱۔ اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

۲۔ آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

۳۔ تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

۴۔ وہ کہے صلّ علیٰ، یہ کہے سبحان اللہ دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

۵۔ تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

۶۔ دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

۷۔ روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

۸۔ ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

۹۔ یک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا تیرا بنوایا ہے لے کے جو گوہر سہرا

۱۰۔ پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

۱۱۔ سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

۱۲۔ رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

۱۳۔ کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

۱۴۔ درِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

۱۵۔ جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

قطعہ معذرت

۱۔ منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

حسن طبیعت، خوش خلقی، یعنی اس قطعہ کے ذریعے حالات پیش کرنا منظور ہے اپنی نیک نہادی کا بیان منظور نہیں ہے۔

۲۔ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

۳۔ آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

یعنی میں آزاد خیال آدمی ہوں تنگ نظر نہیں ہوں کہ معمولی باتوں میں کسی سے الجھوں میں نے ہر ایک کے ساتھ صلح و آشتی کو اپنا شعار بنائے رکھا ہے۔ کسی سے مجھ کو عداوت نہیں۔

۴۔ کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

ثروت: مال کی فراوانی، تونگری۔

۵۔ استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

پرخاش: لڑائی۔ تاب: مجال، طاقت سب ہم مفہوم لفظ ہیں۔

۶۔ جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما: جامِ جم جس کے متعلق مشہور ہے کہ شراب بھرنے سے دنیا کے حالات اس میں دکھائی دیتے تھے، جب بادشاہ کا ضمیر جامِ جہاں نما ہے تو پھر قسم اور گواہ کی کیا حاجت سچی جو بات ہے وہ خود بخود ان پر عیاں ہو جائے گی۔

۷۔ میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

انبساط: خوشی۔ یعنی میں فارسی گو شاعر ہوں اردو میں شاعری سے مجھے کیا انبساط۔ اردو میں شعر صرف بادشاہ کی فرمائش پر ان کو خوش کرنے کو لکھتا ہوں۔

۸۔ سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

زرہِ امتثالِ امر: حکم کی تعمیل میں۔

۹۔ مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

سخن گسترانہ: شاعرانہ

۱۰۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں، جنون نہیں، وحشت نہیں مجھے

یعنی مقطع میں شاعرانہ فخر ہے کسی پر چوٹ نہیں۔ میں دیوانہ نہیں کہ اس طرح کسی کو مخاطب کروں۔

۱۱۔ قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

اگرچہ قسمت خراب ہے لیکن میں شکر گزار ہوں کہ فطرت اللہ نے نیک بنائی ہے۔

۱۲۔ صادق ہوں اپنے قول پہ غالبؔ خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

شعر صاف ہے۔

قطعہ مدحیہ

۱۔ نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے سو کس بات سے ہے

ارادت: دلی لگاؤ۔ نصرت الملک کا نام صرف اسی قطعہ میں دیکھا گیا۔ غالب شاعر کے زمانہ کے کوئی رئیس تھے۔ ہم نے اردوئے معلیٰ، عود ہندی، یادگارِ غالب، کلیاتِ نثر فارسی بھی دیکھی مگر پتہ نہ چل سکا کہ نصرت الملک کس رئیس کا خطاب تھا۔

شعر صاف ہے محتاجِ تشریح نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مجھ کو تجھ سے محبت کسی غرض کی بنا پر نہیں ہے۔

۲۔ گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے　　رونقِ بزم مہ و مہر تیری ذات سے ہے

بزمِ مہ و مہر: رات اور دن ۔ ہنگامہ گرم کرے ، ہنگامہ محفل گرم کرے ۔ فرماتے ہیں کہ اگر رات کے وقت بزمِ عیش نشاط گرم کرے تو رات با رونق ہو جائے ۔ اگر دن میں مجلس مشورت یا علم و حکمت منعقد کرے تو وہ دن ایک کامیاب دن ثابت ہو ۔

۳۔ اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں　　غیر کیا خود مجھے نفرت میری اوقات سے ہے

اوقات: حیثیت ۔ باقی شعر صاف ہے ۔

۴۔ خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست　　نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

فرماتے ہیں کہ میری مفلسی و خستہ حالی دیکھکر تو نے مدد فرمائی اس لئے تیری ذات سے مجھ کو ایک گونہ سپاس گزاری کا تعلق پیدا ہو گیا ہے ۔

۵۔ ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں　　یہ دعا شام و سحر قاضیٔ حاجات سے ہے

توسن: گھوڑا ۔ توسنِ دولت: حکومت ۔ عنان: باگ ۔ قاضی حاجات: حاجت روائی کرنے والا' اللہ تعالیٰ ۔

فرماتے ہیں کہ میں رات دن یہ دعا کرتا ہوں کہ حکومت کی باگ تیرے ہاتھ میں رہے ۔

۶۔ تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا　　گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

ممکن ہے کہ نصرت الملک بہادر کا نام سکند رمرزا یا سکندر علی خاں یا ایسا ہی کچھ ہو ورنہ سکندر سے مماثلت کا اور کوئی قرینہ شعر میں نہیں ہے ۔ مطلب صاف ہے ۔

۷۔ اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار　　غالبؔ خاک نشین اہلِ خرابات سے ہے

ریو و ریا ، مکر و فریب ، اہلِ خرابات سے ہے: شراب خانے میں پڑا رہنے والا ہے ۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ رندوں کا ظاہر باطن ایک ہوتا ہے اس لئے ان کا عیب کھلا ہے یعنی جو کچھ میں آپ کی تعریف کر رہا ہوں اس میں مکر و فریب کو دخل نہیں ۔ میرے دل کی آواز ہے ۔

قطعہ

۱۔ ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو　　رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

۲۔ جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست　　سبزے کو روندے اور پھولوں کو جائے پھاند

۳۔ غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ　　بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

۴۔ بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں　　ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

۵۔ یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے　　لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

ناند: بڑا کونڈا ۔ سیم و زر مہر و ماہ: چاند کو سیم سے سورج کو سونے سے تشبیہ دی ہے ۔ ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو باغوں میں تفریح کو جانے کا رواج پہلے بہت تھا اور اب بھی مسلمانوں میں کہیں کہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ

اس رقم بادشاہ چاندی سونے کے چھلے ملازموں اور خادموں کو تقسیم کرتے تھے۔ اس تقریب میں یہ قطعہ گزرانا گیا ہوگا۔ قطعہ کا مطلب صاف ہے۔

در مدح بادشاہ

۱۔ اے شاہ جہانگیر و جہاں بخش و جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

بشارت: خوشخبری، الہام غیبی۔ پہلے مصرعہ میں بادشاہ کی صفتیں مذکور ہیں دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں کہ بادشاہ کو غیب سے الہام ہوتا ہے جس کے اشارہ پر وہ کوئی کام کرتا ہے۔ اس لئے ہر کام میں اسکو کامیابی ہوتی ہے۔

۲۔ جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدہ کو سو بھی بہ اشارت

عقدہ: گانٹھ، مشکل بات، عقدۂ دشوار: پیچیدہ مسائل وا کرنا: کھولنا، اشارت: اشارہ۔ فرماتے ہیں کہ چونکہ تجھکو تائید غیبی حاصل ہے اس لئے مشکل سے مشکل مسائل جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تو صرف اشارے سے انکو حل کر دیتا ہے۔

۳۔ ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

پہلا مصرعہ استفہامیہ ہے۔ یعنی کیا یہ ممکن ہے؟ مطلب یہ کہ ممکن نہیں۔ لفظ کیا مقدر ہے۔ یعنی حضرت خضر علیہ السلام پہلے کلی کرکے منہ پاک کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد تیرے جاہ وجلال کا ذکر سکندر سے کرتے ہیں۔

۴۔ آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

آصف: حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا نام۔ فرماتے ہیں کہ آصف کو یہ فخر تھا کہ وہ سلیمان جیسے بادشاہ جن وانس کا وزیر تھا۔ لیکن تیرے وزیر کا مرتبہ اس درجہ بلند ہے کہ اس پر خود سلیمان اگر فخر کریں تو بجا ہے۔

۵۔ ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی
ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

نقش: تحریر، مریدی: ارادہ، توقیع: کسی کاغذ پر بادشاہ کا مہر یا دستخط کرنا امارت: امیری مطلب یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ کو غیب سے ہدایت ہوتی رہتی ہے اس لئے اس کی تحریر جو ارادتاً لکھی جائے فرمان الٰہی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کی پیشانی پر تیری غلامی کے داغ ہیں۔ یہ داغ ان کے حق میں توقیع امارت ہے۔

۶۔ تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

۷۔ ڈھونڈے سے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

سیلان: بہنا، شرارت: شرارہ

۸۔ ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

نکتہ سرائی: شاعری، توغل: کمال کامل مشق، سحر طرازی: جادو بیانی۔

۹۔ کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے حکایت میں تیری میری عبارت

یعنی اگرچہ میں مشاق و ماہر شاعر جادو بیاں ہوں پھر بھی تیری تعریف سے قاصر ہوں اس لئے مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں

۱۰۔ نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں نظارگی صنعت حق اہل بصارت

نظارگی: دیکھنے والے + اہل بصارت: عقلاء فضلا۔ نوروز: مارچ کی ۲۰ تاریخ آفتاب برج حمل میں آتا ہے۔ اور موسم بہار کا شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بیان کیا جاتا ہے دنیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسی روز پیدا کیا نظام شمسی کے ساتوں سیارے اسی روز گردش میں آئے۔ غرض نوروز کی بڑی اہمیت مانی جاتی ہے۔ خاص کر ایران میں اس روز خاص اہتمام سے عید منائی جاتی ہے۔ مغلیہ خاندان کے بادشاہ بھی یہ جشن منایا کرتے تھے پس بہار کی رنگینیوں اور سیاروں کی گردش کے اثرات میں اہل بصارت کیلئے قدرت کے صدہا نمونے ہیں

۱۱۔ تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شرف مہر: آفتاب کا برج حمل میں آنا، موسم بہار کا آغاز، جشن نوروز۔ عتبہ = چوکھٹ۔ اے بادشاہ تجھ کو جشن نوروز کی خوشیاں اور غالب کو تیری آستاں بوسی مبارک ہو۔

قطعہ

۱۔ افطار صوم کی اگر کچھ دستگاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

۲۔ جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

"مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا گیا تھا جس کو سنکر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے (از یادگار غالب)

قطعہ

یہ وہ قطعہ ہے جو مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گذرانا تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر ملتی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی (از یادگار غالب)

۱۔ اے شہنشاہ آسمان اورنگ اے جہاندار آفتاب آثار

آسمان اورنگ: جس کا تخت آسمان ہے + آفتاب آثار: چونکہ آفتاب آسمان پر جلوہ گر ہوتا ہے اس لئے بادشاہ کو آفتاب کے مانند کہا۔

۲۔ تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں تھا میں اک دردمند سینہ فگار

بے نوا: فقیر، بے سروسامان + سینہ فگار: غمگین جس کا سینہ زخمی ہو۔

۳۔ تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار

۴۔ کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز روشناس ثوابت و سیار

گرم بازاری ہونا: عزت ہونا، مانگ ہونا۔ ثوابت: جمع ثابت وہ ستارے جو بدیع السیر یا غیر متحرک نظر آتے ہیں۔

سیار: وہ ستارے جو سریع السیر اور ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے میں ایک ذرہ بے مقدار تھا۔ بادشاہ کی عزت افزائی کے سبب ثوابت و سیار کا ہم پلہ ہوگیا۔

۔ گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

۔ کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

یعنی بے ہنری کی وجہ سے میں خود اپنی نظر میں اس درجہ ذلیل ہوں کہ اگر اپنے کو خاکی کہوں تو خاک کو شرم آجائے۔

۔ شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشاہ کا غلام کارگزار

۔ خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

یادگار غالب میں مولانا حالی نے لکھا ہے کہ "بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔"

۔ بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

یعنی خانہ زاد، مرید، مداح، نوکر

۱۔ نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

مدعائے ضروری الاظہار: ایسی غرض جس کا ظاہر کرنا میرے لئے ضروری ہے۔

۱۔ پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوق آرایش سر و دستار

۱۔ کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار

یعنی مجھ کو آرایش و زیبایش کا شوق نہیں لیکن تن پوشی کے لئے کچھ تو چاہیئے۔ زمہریر: سخت جاڑہ، شدت کی سردی، کرہ ہوا کے اوپر کا کرہ۔

۱۱۔ کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

۱۱۔ کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

۱۱۔ رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

بھاڑ میں جائیں: بددعا ہے یعنی غارت ہوں، آگ لگے۔

۱۔ آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

۱۱۔ دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

(یعنی اے خدا تو عذاب دوزخ سے بچا)

۱۱۔ میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

۱۹۔ رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک ‎ ‎ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

۲۰۔ مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ‎ ‎ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

۲۱۔ بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ‎ ‎ اور رہتی ہے سود کی تکرار

۲۲۔ میری تنخواہ میں تہائی کا ‎ ‎ ہو گیا ہے شریک ساہوکار

۲۳۔ آج مجھ سا نہیں زمانہ میں ‎ ‎ شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار

نغز: نادر، عمدہ، انوکھا۔

۲۴۔ رزم کی داستاں گر سنیئے ‎ ‎ ہے زباں میری تیغ جوہر دار

۲۵۔ بزم کا التزام گر کیجے ‎ ‎ ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ابرِ گوہر بار: موتی برسانے والا ابر۔

۲۶۔ ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ‎ ‎ قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

۲۷۔ آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ‎ ‎ آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

۲۸۔ میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ ‎ ‎ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

۲۹۔ ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ‎ ‎ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

"شاعری سے مراد یہاں صنعتِ شاعرانہ ہے۔ چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادا لکھا ہے۔ تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں۔" (از یادگارِ غالب)

۳۰۔ تم سلامت رہو ہزار برس ‎ ‎ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

۱۔ سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آ پڑی ‎ ‎ مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

۲۔ تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد ‎ ‎ تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

"ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔" (از یادگارِ غالب)

قطعہ

۱۔ سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے ‎ ‎ جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

۲۔ ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے ‎ ‎ کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

گلیم: کمبل، کملی + سیاہ گلیم: بدبخت۔

شریکِ غالب: اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریکِ غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے (یادگارِ غالب)

قطعہ تاریخ

۱۔ خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

۲۔ ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ — نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ" ۱۸۵۴ع

طوے: سرِ بیت۔ ترکی زبان میں شادی، بیاہ کو خاص کر اور جشن و خوشی کو عموماً بیائے مجہول کہتے ہیں (فرہنگِ آصفیہ)

میرزا جعفر کی شادی کی تاریخ لفظ "محظوظ" مادہ تاریخ ہے۔

ایضاً

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید

کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے — تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید" ۱۲۷۰ھ

ناہید: زہرہ، لونی فلک، ایک ستارہ جو تیسرے آسمان پر چمکتا ہے۔ چونکہ ناہید کا نام لونی فلک بھی ہے۔ اور لونی کے معنی کنچنی کے ہیں اس لئے تقریبِ شادی بجائے کنچنی کے زہرہ کا ناچ ہوا۔ انشراح کے معنی ہیں دل کا کھلنا۔ دل کا خوش ہونا۔ پس مادہ تاریخ کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح جشنِ جمشید سے دل کا انشراح ہوتا ہے میرزا جعفر کی شادی کے جشن میں بھی اسی طرح انشراح ہوا۔

قطعہ

۱۔ گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

۲۔ کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام — ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

"بادشاہ کے دربار کا یہ داب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لئے مرزا نے اس کو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے۔" (از یادگارِ غالب)

رباعیات

(۱)

۱۔ بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال — ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال

آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

اتمام: تمام ہونا۔ اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال: زمانہ طفولیت کے گزرنے کے بعد۔ حال: کیفیت جذب و محبت، ماضی اور مستقبل کا درمیانی زمانہ۔ سواد: حوالی، گرد و نواح۔ اقلیم: ملک۔ اس رباعی میں ماضی، حال، مستقبل کی اپنی حالت بیان فرماتے ہیں۔ اور عمرِ گذشتہ کو جو عدم میں پہنچ چکی ہے۔ اپنے استقبال کے لئے بلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عہدِ طفولیت

خوشی اور بے فکری میں گزر گیا۔ اس کے بعد جوانی آئی، جوانی میں کیف و سرور اور جذب و محبت کے ساغر چڑھاتے رہے۔ آخر ملک عدم کی نواحی میں پہنچ گئے ہیں۔ (یعنی مرنے کا زمانہ آگیا ہے) قاعدہ ہے کہ کوئی ذی مرتبت ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی استقبال کرکے اس کو اپنے ساتھ لیجاتا ہے۔ اس لئے آپ اپنی عمر گذشتہ کو ہی اپنے استقبال کے لئے بلا رہے ہیں۔ اگر عمر گزشتہ آجائے تو پھر کچھ لطف زندگی اٹھالوں اور اس کے بعد ملک عدم کو سدھاریں

(۲)

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا ... کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ... ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

کیا شرح کروں: کیا بیان کروں + طرفہ تر: عجیب تر، بہت انوکھا + عالم: حالت۔ قطرۂ اشک کو دیدۂ پرنم سے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں رات معشوق کی زلف اور رخ عرق آلود کی یاد میں روتا رہا۔ میں کیا بیان کروں کہ فراق میں میری کیا حالت تھی۔ میرا ہر آنسو ایک دیدۂ پرنم تھا گویا میں ہزاروں آنکھوں سے صبح تک روتا رہا تھا۔ (ہزار دل آنکھ سے رونا ہی طرفہ تر عالم ہے)

(۳)

آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال ... ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی ... لڑکوں کیلئے گیا ہے کیا کھیل نکال

فرماتے ہیں کہ جس طرح آتشبازی سے بچے دل بہلاتے ہیں معشوقان کمسن بھی اسی طرح عاشقوں کے سوز جگر سے دل بہلاتے ہیں۔ آتشبازی کا موجد کوئی ماہر اور چالاک آدمی ہوگا۔ لیکن سوز جگر (عشق) کا موجد تو آفت کا پرکالہ ہی ہوگا جس نے معشوقوں کے لئے ایسا کھیل ایجاد کیا۔

(۴)

دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی ... بیتابی رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس ... تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

فسردن: افسردہ، بیدل ہونا، مغموم ہونا + تکرار: ایک ہی چیز کا دوبارہ ظاہر ہونا۔ تجدید: کسی بات کا ابتدائی اور نئی حالت میں ظاہر ہونا۔ تمہید: آغاز، مقدمہ، عنوان یعنی دل تھا خواہ اس کو جان درد تمہید (یعنی مقدمۂ درد کی جان یا اصل) کہا جاتا خواہ بیتابی رشک و حسرت دیدار کا غم اس کا نام رکھا جاتا پھر بھی دل تھا۔ اس دل کی وجہ کم از کم ہم کو سوز و گداز حاصل تھا۔ لیکن افسوس کہ اب وہ دل بھی نہ رہا۔ اور بیدلی کی وجہ ہم پر افسردگی اور غمگینی چھا گئی ہے اس لئے اے تجلی طور تو اس میں پھر سے سوز و گداز پیدا کردے۔ اگر طور کی تجلی بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے بھی کسی اور کیلئے اس کی تکرار نہیں ہوسکتی تو مضائقہ نہیں ایک نئی تجلی ہی سہی۔

(۵)

ہے خلق حسد قماش لڑنے کیلئے   وحشت کدۂ تلاش لڑنے کیلئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد   ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلئے

حسد قماش: جن کی فطرت میں حسد ہو۔ وحشت کدہ: مقام وحشت یا شر و فساد۔ کاغذ باد: پتنگ۔ فرماتے ہیں کہ بدفطرت لوگ جن کی قماش ہی حسد سے ہوئی ہے۔ صرف لڑنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو سوائے لڑنے کے دوسرا کام نہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور جس مقام پر ملتے ہیں اس جگہ کو شر و فساد کا وحشت کدہ بنا دیتے ہیں۔ گویا ان کا آپس میں ملنا محض لڑنے کیلئے ہوتا ہے جس طرح فضا میں پتنگ جتنی دفعہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں کٹتے ہیں یعنی صرف لڑنے کیلئے ملتے ہیں۔

(۶)

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا   اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

نژند: اندوہگیں، نژند: سرنگوں۔ اس رباعی میں نژند بالفتح ہے۔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی بے التفاتی اور اس کے جور سے دل سخت غمگین سا ہو گیا ہے۔ اور معشوق سے گلہ مند لیکن مشکل یہ ہے کہ اپنی اس تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتے جب اس کے سامنے جاتے ہیں یا تو انتہائی خوشی سے یا اس کے رعب سے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکلتا۔ گویا اے غالب ہمارا منہ بند ہو جاتا ہے۔

(۷)

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب   دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں   سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

دل رکنا اور دل بند ہونا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی انقباض اور غم کی حالت طاری ہونا۔ فرماتے ہیں غم دل کو پسند آگیا ہے اس لئے دل منقبض رہتا ہے۔ اس انقباض کا نتیجہ یہ ہے کہ رات تمام نیند نہیں آتی گویا سونے کی قسم ہے یعنی نیند حرام ہو گئی۔

(۸)

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل   سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

سخنوران کامل: کامل شاعر بڑے پایہ کے شعراء۔ گویم مشکل: کہوں تو مشکل۔ وگرنہ: اور اگر نہ۔ گویم مشکل: نہ کہوں تو بھی مشکل ہے۔ "اس اخیر کے مصرع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے۔ اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہنا ہو تو سخنوران کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں یہ بھی طرح مشکل ہے"

(از یادگار غالب)

(۹)

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جم جاہ نے دال — ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

شاہ جم جاہ: جم کے سے مرتبہ والا بادشاہ۔ دال ہے: ثبوت ہے، دلیل ہے۔ دال: دلیل، ثبوت، اناجوں کی ایک جن
بحث و جدال: بحث و تکرار۔ یہ مطلب ہے کہ بادشاہ نے جو دال میرے لئے بھیجی ہے اس سے خود اس کی عنایت اور مہربانی کا ثبو
ملتا ہے۔ یہ بادشاہ کے پسند خاطر دال اس کی دانش و داد اور دین و دولت کی دلیل ہے یعنی بادشاہ ہونے کے باوجود دا
کھایا کرتا ہے تنعم سے اس کو پرہیز ہے اور یہ صفت فقر باخدا، منصف اور عقلمند بادشاہ ہو سکتی ہے۔

مولانا حالی نے اس رباعی کے متعلق یادگار غالب میں لکھا ہے کہ: بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھ
جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اس کے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

رباعی نمبر (۱۰)

ہے شہ میں صفات ذوالجلالی باہم — آثار جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم — ہے اب کے شب قدر و دیوالی باہم

صفات ذوالجلالی: اللہ تعالیٰ کی صفات۔ جلالی و جمالی ہر دو صفات باری تعالیٰ ہیں۔ آثار: نشانیاں۔ سافل: پست
عالی: بلند، اعلیٰ۔ یہ مطلب ہے کہ بادشاہ میں صفات جلالی و جمالی دونوں ملے ہوئے ہیں اس اعتبار سے صفات باری تعا
سے بادشاہ متصف ہے۔ دیوالی کی پوجا سے سافل اور شب قدر کی عبادت سے عالی ہر دو خوش ہیں۔

(۱۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

بقا: سلامتی۔ شیوع: اشاعت، پھیلانا۔ دانش: عقل و حکمت۔ داد: انصاف۔ فرماتے ہیں کہ خدا بادشاہ کو سلامت رکھے
اس کے دم سے دنیا میں حکمت و انصاف کی اشاعت ہو۔ سالگرہ کی ڈوری میں جو گانٹھ دی گئی ہے دراصل وہ ایک صفر ہے جو اس کی
سالوں میں دس گنا اضافہ کر دیتا ہے۔

(۱۲)

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یعنی سالگرہ کے رشتہ میں جو تار ہوتے ہیں وہ لاکھ سے زیادہ ہوں۔ اور ہر تار عمر کا ایک سال ہو جو گرہ اس رشتہ میں لگا
وہ ایک صدی فرض کریں ایسے ہزار گرہیں خدا کرے اس رشتہ میں پڑیں۔ حاصل یہ بادشاہ کی عمر لاکھوں سال کی ہو۔ یہ دونوں رباعیاں

بادشاہ کی سالگرہ کی مبارکباد میں لکھی گئی تھیں۔

(۱۳)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

"یہ رباعی عاشقانہ ہے۔ بالکل نیا مضمون ہے۔ ظلم سے ہاتھ اٹھانا اس سے دستبردار ہونا اور اس کو ترک کرنا۔ باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔"
(از یادگار غالب)

(۱۴)

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

"اس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے۔ جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم ہر چند دنیا کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہ ہے کہ کام روائی میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے۔ ایسی کہیں نہیں ہوتی کہ آخر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے۔ اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔"
(از یادگار غالب)

(۱۵)

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

"یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزہ کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی۔" (از یادگار غالب)

(۱۶)

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

ارمغاں: تحفہ۔ "بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے اس کے شکریہ میں رباعی لکھی ہے۔ پیٹا فیروزہ جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے۔ وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے۔"
(از یادگار غالب)

تمام شد